جلد نمبر ۱

رجسٹرڈ نمبر ل ....

الندوہ

مجلس ندوۃ العلما کا ماہوار رسالہ

جس کا مقصد

مسلمانوں کی تعلیمی اور تعمیری خدمت ہے

مُرتبہ

سید ابوالحسن علی (ندوی) استاذ تفسیر دار العلوم

و

عبد السلام قدوائی (ندوی) استاذ تاریخ و اقتصادیات دار العلوم

دفتر کا پتہ :- "الندوہ" بادشاہ باغ لکھنؤ

قیمت :- دو روپیہ سالانہ مع محصول

الندوہ

زیر نگرانی

علامہ سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ

جلد ذی الحجہ ۱۳۵۸ھ مطابق جنوری ۱۹۴۰ء نمبر ۱

فہرست مضامین

خط و کتابت اور ترسیل زر حامد علی ندوی مینجر [illegible] لال باغ لکھنؤ کے پتہ پر ہونی چاہیے۔

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی کا حوصلہ افزا پیام
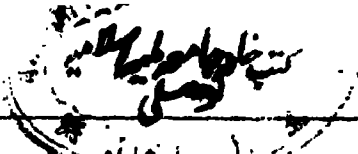
بسم اللہ الرحمن الرحیم

رسالہ "الندوہ" کا دوبارہ اجرا

رسالہ "الندوہ" آج سے تیس برس پہلے مجلس ندوۃ العلما کی جانب سے ماہوار شائع ہوتا تھا۔ مرحوم علامہ شبلی ایڈیٹر تھے، نیاز مند شروانی کا نام بھی اُن کے نام کے برابر رسالہ کے ٹائٹل پر چھپتا تھا۔ کتب خانہ سے اسکے فائل اسوقت نکلوا کر دیکھے تو وہ زمانہ آنکھوں کے سامنے آگیا جب علامہ مرحوم کی صحبت کا لطف مفت احباب تھا اور جواب کسی قیمت پر بھی نہیں مل سکتا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ

رسالہ علمی اور تحقیقی مضامین کا خزانہ تھا۔ مثلاً علامہ مرحوم کے مضامین ابن رشد "فلسفۂ یونان اور اسلام" "جبر و قدر" علیٰ ہذا القیاس۔ اسمیں کوئی مضمون سرسری یا سطحی شائع نہ ہوتا تھا۔ خبریں بھی وہی شائع ہوتی تھیں جو علمی شان لئے ہوتیں۔ تازہ واردان بساط علم اُس سے سبق حاصل کرتے تھے۔ مثلاً ۱۳۲۲ھ کے رسالوں میں ایک گمنام "سید سلیمان بہاری طالب علم دار العلوم" "عربیت اور ہندوستان" مضمون کا عنوان ہے۔ یہ طالب علم ترقی کرکے آج بزم شبلی کے صدر نشین ہیں اور مولوی سید سلیمان صاحب ندوی کے نام سے ہمارے ملک بلکہ سارے عالم اسلامی میں مشہور و معروف ہیں۔ شکر ہے کہ رسالہ "الندوہ" دوبارہ جاری ہوتا ہے۔ خیر مقدم مرحبا، ملک میں جو بدمذاقی وبا کی طرح پھیل گئی ہے امید ہے کہ اسکے لئے تریاق ثابت ہوگا اور جو چند متین علمی رسالے ملک میں علم و ادب کی خدمت کر رہے ہیں اُنکی تعداد میں شاندار اضافہ کرے گا۔

رب کریم اسکو کامیاب اور ملک کا حقیقی فیض رساں بنائے۔ ع

"این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد"

شذرات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العلمین والصلوۃ والسلام علی سید المرسلین محمد وعلی الہ واصحابہ اجمعین

اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہو کہ اسنے ندوۃ العلما کے کارکنوں کو یہ توفیق عطا فرمائی کہ وہ دین اور علم کی خدمت اور اس مجلس کے مقاصد اور حالات کی اشاعت اور تائید کی خاطر رسالہ الندوہ کو دوبارہ جاری کریں۔ یہ ہمکو اچھی طرح معلوم ہو کہ اس جنس کی طلب بازار میں بہت کم ہو اسلئے ہمارا مشکلوں میں پھنسنا کچھ توقع کے خلاف نہیں لیکن پھر بھی ضرورت کا تقاضا یہ ہو کہ ہم اس فرض کو ادا کرنے میں مشکلات کا مقابلہ کریں اور التعمنا والاتمام من اللہ کے اصول پر یقین رکھیں۔

پچھلے زمانہ میں رسالہ الندوہ ۱۹۰۴ء سے نکلنا شروع ہوا تھا اور زمانہ کی دو مشہور ہستیاں مولانا شبلی نعمانی اور مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی اُسکی ادارت اور تحریر کی ذمہ داریاں انجام دیتی تھیں۔ یہ انتظام ۱۹۰۹ء تک قائم رہا اور اسکے بعد دارالعلوم کے بعض دوسرے فضلاء اور اہل قلم نے اُسکو چند سال قائم رکھا اور آخر کو بند ہو گیا اور اب تقریباً چونتیس برس کے بعد دوبارہ اس کا اجرا عمل میں آرہا ہے۔

ہر زمانہ کی ضرورتیں دوسرے زمانہ سے مختلف ہوتی ہیں اور مذاق علمی بھی بدلتا رہتا ہو، الندوہ کے پہلے دور میں جس قسم کے مضامین اسمیں نکلتے رہے جدید دور میں وہ رنگ قائم نہ رہ سکے گا اب حالات کا اقتضا اور ضرورتوں کا تقاضا کچھ اور ہی ہو عربی تعلیم کی ضرورت عربی مدارس کی اہمیت علوم اسلامیہ کی اشاعت مسلمانوں کی اخلاقی و اقتصادی اصلاح، مسرفانہ غیر شرعی رسوم و رواج کا ابطال اور اسلامی مسائل کی صحیح تشریح اس رسالہ کی آیندہ زندگی کا مقصد ہوگا۔ وماتوفیقنا الا باللہ علیہ توکلنا والیہ منیب

مجلس ندوۃ العلما ۱۳۱۱ھ ۱۸۹۳ء سے عالم وجود میں آئی اور اسکے چار مقصد قرار دیے گئے تھے عربی تعلیم

کی اصلاح، مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق کی دعوت اور ان کے غیر شرعی رسم و رواج کا ابطال اور جماعۂ علمائے اسلام کا
اسلام کی خاطر ایک متحدہ مرکز پر اجتماع، غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ ضرورتیں اب بھی اسی طرح
قائم ہیں اور اس آواز کو اب بھی بار بار بلند کرنے کی حاجت ہے۔

ندوۃ العلماء مسلمانوں کی تقریباً بیالیس برس کی انجمن ہے جسنے اس عمر میں نشیب و فراز ترقی و تنزل
اور چڑھاؤ اتار کے بہت سے دور دیکھے ہیں اور اب وہ دور ہے جبکہ ایک تو بزرگوں کے سوا جنکی عمروں میں اللہ تعالیٰ
برکت عطا فرمائے باقی اسکے سارے پرانے کارکن اور خادم یا اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں یا ضعف و پیری
کے سبب سے گوشہ نشین ہو چکے ہیں اور اب انکی جگہ نئی نسل پیدا ہو چکی ہے جو انھیں بزرگوں کے مبارک نقش قدم پر
چلکر دین و ملت کی خدمت کا جذبہ اپنے اندر رکھتی ہے۔

اسوقت ندوۃ العلماء حسب ذیل شعبوں پر تقسیم ہے۔ شعبۂ تعلیم (دار العلوم) شعبۂ تبلیغ، شعبۂ دار الکتب
اور شعبۂ دار الافتاء۔ یہ چاروں شعبے بحمد اللہ قائم ہیں اور اپنے اپنے حال پر چل رہے ہیں۔

ان شعبوں میں سے ہمارا سب سے بڑا شعبہ دار العلوم کا ہے یعنی عربی زبان اور علوم اسلامیہ کا وہ مدرسہ
جو جدید اصول اور نصاب کے مطابق بیالیس برس سے لکھنؤ میں قائم ہے دینی تعلیم اور اسلامی علوم کی تعلیم کی خدمت
انجام دے رہا ہے اس درسگاہ کے طلبا ملک کے مختلف گوشوں میں تبلیغی کاموں میں لگے ہوئے ہیں اور جہانتک انہوں
نے اپنی خصوصیات کو قائم رکھا ہے، بے عیبی کا دعویٰ نہ پہلے تھا نہ اب ہے۔

ہماری درسگاہ کی خصوصیتیں حسب ذیل ہیں:۔

(۱) علوم قرآنیہ کی طرف اعتنائے خاص۔

(۲) پرانے یونانی علوم منطق و فلسفہ میں سے صرف بقدر کفایت پر قناعت۔

(۳) علوم ادبیہ اور عربی تقریر و تحریر کی پوری مہارت۔

(۴) جدید علم کلام سے آشنا کرنا۔

(۵) قدیم عربی صرف و نحو کی مشقی تعلیم اور پرانی دقتوں کو دور کرنا۔

(۶) انگریزی زبان سے بقدر ضرورت واقفیت۔

(۷) تاریخ، جغرافیہ، حساب، اقتصادیات اور سیاسیات اور حسب مقتضا دوسرے مفید جدید علوم کی تعلیم۔

(۸) پابندی شریعت مطہرہ کے ساتھ زمانہ کی ضرورتوں سے باخبری اور طلبہ میں بلند نظری، بلند ہمتی و وسعت حوصلہ اور رہنے سہنے میں صفائی و پاکیزگی کا خیال۔

(۹) طلبا میں تقریر و تحریر کا ملکہ پیدا کرنا۔

(۱۰) فروعی باتوں میں غیر مفید اختلافات سے اجتناب۔

علمائے دین اور مصلحین اُمت ہکو ہر وقت ٹوک سکتے ہیں اور ہماری غلط روی کی ہر وقت اصلاح فرما سکتے ہیں۔

اطلاع

ندوہ کے خصوصی تعلقات کے پیش نظر رسالہ "الندوہ" کا پہلا نمبر ارسال خدمت ہے۔ دوسرا پرچہ بذریعہ وی پی، روانہ کیا جائے گا۔ اگر خریداری سے کوئی امر مانع ہو تو براہ نوازش ۲۱ جنوری تک دفتر کو مطلع کر دیجئے تاکہ وی پی نہ روانہ کی جائے اور دفتر مصارف ڈاک کا زیر بار نہ ہو۔

منیجر

ندوۃ العلماء کی تاریخ کا پہلا صفحہ

از
مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ

(۱)

دلی میں اسلامی حکومت کا آفتاب جب ڈوب رہا تھا تو اُسی کے مطلع سے اسلام کا ایک اور آفتاب طلوع ہو رہا تھا۔ یہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا خانوادہ تھا۔ سچ یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب کی پیشین گوئی کے مطابق اسکے بعد جسکو ملا اور جو کچھ ملا اسی دروازہ سے ملا۔ ہندوستان میں ردِ بدعات کا ولولہ، ترجمۂ قرآن پاک کا ذوق، صحاح ستہ کا درس، شاہ اسمٰعیل اور مولانا سید احمد بریلوی کا جذبۂ جہاد، فرقِ باطلہ کی تردید کا شوق، دیوبند کی تحریک، ان میں سے کون چیز ہے جس کا سررشتہ اس مرکز سے وابستہ نہیں۔

مارہرہ ضلع ایٹہ کے مردم خیز قصبہ میں ایک بزرگ مولوی بزرگ علی پیدا ہوئے۔ جوانی میں تحصیل علم کی اور آخر دلی جا کر اُس چشمۂ فیض سے سیراب ہوئے جو شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اور شاہ رفیع الدین صاحبؒ کی درسگاہوں سے بہ رہا تھا۔ اُس زمانہ کے علماء کے دستور کے مطابق چند روز آگرہ اور کلکتہ میں درس دینے کے بعد علی گڈھ میں جسکا پرانا نام کول تھا انگریزی حکومت میں بادلِ ناخواستہ منصفی کا عہدہ قبول کیا۔ مگر اس عہدہ کے ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اور اسی سلسلہ میں یہاں کی جامع مسجد میں بانیٔ مسجد نواب ثابت خاں نے محمد شاہ کے زمانہ میں جو مدرسہ قائم کیا تھا، اُسکو دوبارہ زندہ کیا۔ اور کچھ دنوں کے بعد منصفی کے عہدہ سے استعفا دیدیا۔ اُس زمانہ میں اُن علماء کا جو انگریزی تسلط سے پیچ و تاب میں تھے، ٹونک مرکز بن رہا تھا۔ مولانا اسمٰعیل شہید کے پراگندہ قافلہ کے مسافر بھی یہیں پناہ گزیں تھے۔ بہرحال نواب وزیرالدولہ مرحوم والیٔ ٹونک کے اصرار پر ریاست میں قاضی القضاۃ کا عہدہ قبول کیا، اور وہیں ۱۲۶۲ھ میں وفات پائی۔

اُس زمانہ میں ہندوستان کی غیر متوقع حکومت پاکر عیسائی حکام اور پادریوں کا ولولہ یہ تھا کہ وہ بالآخر ہندوستان کو عیسائی بنا لیں گے۔ علمائے اسلام اسکے مقابلہ کے لئے اُٹھے۔ اُن میں سے کئی بزرگوں کے مبارک

ناموں اور کاموں سے ہماری واقفیت ہو۔ اسی مقدس سلسلہ کی ایک کڑی مولانا بزرگ علی کی تصنیفات ہیں۔ ردِ نصاریٰ میں متعدد کتابیں لکھیں، جنمیں سے بشارات کا قلمی نسخہ حبیب گنج کے کتبخانہ میں ہے۔

مولانا بزرگ علی صاحب کے آغوش میں جو نونہال پرورش پا کر بڑھے، اُنمیں دیوہ ضلع بارہ بنکی کے ایک سعادتمند مفتی عنایت احمد صاحب تھے۔ مفتی صاحب ابتدائی کتابیں دوسرے علماء سے پڑھکر دلی گئے، اور شاہ اسحاق صاحب سے حدیث کا درس لیا، اور وہاں سے آکر علی گڈھ کول میں مولوی بزرگ علی صاحب سے تکمیل کی اور وہیں مدرس ہوگئے۔ ایکسال کے بعد وہ وہیں مفتی اور منصف مقرر ہوئے۔ یہاں ملکھنہ ضلع علی گڈھ ایک قریہ سے ایک صاحبزادہ آکر درس میں داخل ہوئے، جنکو آگے چلکر دنیا نے استاذ العلماء مفتی لطف اللہ صاحب کے نام سے جانا۔ مفتی عنایت احمد صاحب تبدیل ہو کر بریلی پہونچے تھے کہ سنہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ برپا ہوگیا۔ اس ہنگامہ کی پاداش میں بالزام بغاوت جن علمائے اعلام کو قید جلاوطنی کی سزا دیگئی، اُنمیں ایک یہ بزرگ بھی تھے۔ چنانچہ نظربند کرکے جزیرہ انڈمان بھیجدیے گئے۔ مگر کیا عجیب بات ہے کہ دریائے شور کے ساحل پر بھی یہ چشمۂ شیریں اسی طرح بہتا رہا، چنانچہ وہاں کئی کتابیں تصنیف کیں جنمیں سے صرف میں علم الصیغہ اور سیرت میں تواریخ حبیب الٰہ، اور جغرافیہ میں ترجمۂ واحد الافلاک مشہور ہیں۔ آخر یہی تصنیفات رہائی کا ذریعہ بنیں، اور سنہ ۱۲۷۷ھ میں رہا ہو کر ہندستان آئے، اور پھر چشمۂ فیض اُسی طرح جاری تھا

اُس زمانہ میں کانپور نیا نیا آباد تھا، اودھ کی نوابی کے زمانہ میں گنگا کے کنارے یہ انگریزی فوج کا کیمپ تھا، کیمپ کے تعلق سے تاجر اور سوداگر آکر آباد ہوئے۔ کیمپ سے کیمپو ہوا، اور کیمپو سے کانپور۔ مسلمانوں کی اس تہ جالی میں کانپور کے مسلمان سوداگروں کو اللہ تعالیٰ نے توفیق دی، جنھوں نے اپنی بابرکت اور نیک کمائیوں کو دین کی نصرت اور علم دین کی اشاعت میں لگایا۔ مفتی عنایت احمد صاحب نے کانپور میں مستقل قیام فرمایا، اور اُسی سال سنہ ۱۲۷۸ھ میں مدرسۂ فیض عام جاری کیا۔ دو برس کے بعد اپنی جگہ اپنے دو شاگردوں کو جنمیں سے ایک مولوی لطف اللہ صاحب تھے، جانشین بنا کر حج کو روانہ ہوئے، جہاز جدہ کے قریب ہو چکا تھا، شوال سنہ ۱۲۷۹ھ کو ایک پہاڑ سے ٹکرایا، اور ڈوب گیا۔ مفتی صاحب بحالت نماز

داحرام غرق و شہید ہوئے۔ شاگردوں نے مدرسہ کے کام کو سنبھالا، اور مدرسہ کو بڑی رونق دی۔ اسی مدرسہ کا فیض تھا

جو بالآخر ندوۃ العلما کی شکل میں نمایاں ہوا۔

مفتی لطف اللہ صاحب ۲ برس کانپور میں رہ کے بعد علی گڈھ واپس آئے، اور یہاں سے اس مدرسہ میں

جسکو ان کے استاذ الاستاذ مولوی بزرگ علی صاحب نے زندہ کیا تھا، مدرس ہوئے۔ علی گڈھ میں درس کا فیض ۱۲۶۸ھ

سے ۱۲۹۵ھ تک ستائیس برس مسلسل جاری رہا، بہت سے علم و فن کے طلبگاروں کے قافلے علی گڈھ کا رخ کر رہے

تھے۔ ستائیس برس کی مدت میں سینکڑوں عالم اس درگاہ سے اٹھے، اور ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیلا، اس

عہد کا بمشکل سے کوئی نامور عالم ہوگا جسکی دستار فضیلت کا طرۂ امتیاز اس باکمال کا تلمذ نہ ہو جن اکابر کے نام معلوم ہیں

ان میں سے چند کے نام ملاحظہ طلب ہیں۔ مولوی عبدالغنی خاں صاحب (استاذ اول مولانا شروانی) مولوی احمد حسن صاحب

کانپوری، مولوی سید محمد علی، ناظم اول ندوۃ العلما، مولوی مفتی عبداللہ صاحب ٹونکی، مولوی عبدالحق صاحب حقانی

... تفسیر حقانی دہلی، مولوی سید ظہور الاسلام صاحب فتحپوری، وقار نواز جنگ مولوی وحید الزماں خاں، مولوی فضل حق

صاحب رامپوری، مولوی مفتی عبداللطیف (استاذ جامعہ عثمانیہ) مولوی نور محمد صاحب پنجابی مدرس مدرسہ اسلامیہ فتحپور،

مولوی حامد علی صاحب مشہور مدرس، مولوی پیر مہر علی شاہ صاحب سجادہ نشین گولڑہ ضلع راولپنڈی، قاضی سعد الدین

صاحب کشمیری، مولوی سیف الرحمن صاحب لایتی، مولوی لطف الرحمن صاحب بردوانی، اور خاتمۃ التلامذہ نواب صدر یار جنگ

مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی وغیرہ سینکڑوں ارباب کمال ہیں۔

حضرت مفتی لطف اللہ صاحب کی دو اور خصوصیتیں بھی قابل ذکر ہیں، ایک یہ کہ انھوں نے عمر بھر کسی کی تکفیر

نہیں کی، دوسری یہ کہ کانپور کے قیام ہی کے زمانہ میں انگریزی سے اتنے حرف شناس ہوگئے تھے کہ تار وار پڑھ لیتے تھے۔

اسکے یہ معنی ہیں کہ دار العلوم ندوہ جو بننے والا تھا اسکی صورت مثالی پہلے ہی ذات گرامی میں جمع تھی۔

اس سلسلہ کا رابعہ عقیدت ایک اور روحانی مرکز سے بندھا تھا جسکا نام نامی حضرت مولانا شاہ

فضل رحمان صاحب مجددی گنج مراد آبادی تھا، گنج مراد آباد کانپور کے پاس ایک قصبہ ہے، فیض بھی دہلی کے اسی

خانوادہ سے آیا تھا مفتی صاحب کے اکثر تلامذہ گنج مراد آباد کے فیض ارادت سے سرفراز تھے[1]۔

---

[1] تفصیل مطلوب ہو تو استاذ العلما مولانا شروانی ملاحظہ ہو۔

مشرق و مغرب کے یہی دونوں مطلع تھے جن سے ندوۃ العلما کا آفتاب طلوع ہوا۔

انقلاب حوادث کے جو طوفان ملک میں اُٹھ رہے تھے، اُن سے حساس مسلمانوں کے دل مضطرب تھے، مکاتب اور مدارس کا پرانا سلسلہ ٹوٹ رہا تھا، انگریزی اسکول اور کالج میں مسلمان لڑکے کھنچ رہے تھے، سلطنت کے اثر سے عیسائیت کا چرچا تھا، مشنریوں کے جال ہر جگہ پھیلے تھے، اُن کے یتیم خانے ہر جگہ قائم تھے، مسلمانوں اور عیسائیوں میں مناظروں کی گرم بازاری تھی، دونوں طرف سے رسالے لکھے جا رہے تھے، یورپ کے نئے خیالات سیلاب کی طرح اُمڈے چلے آرہے تھے، عام علما زیادہ تر پڑھنے پڑھانے میں مصروف بلکہ معمولی معمولی چھوٹی چھوٹی باتوں میں اُلجھے تھے، اور خواص تقلید و عدم تقلید، قرأت فاتحہ، آمین بالجہر اور رفع یدین کے مسئلوں میں ایسے گتھے تھے کہ مناظرہ، مجادلہ اور مجادلہ مقاتلہ بن گیا تھا، خدا کے گھر لڑائی کے میدان بن گئے تھے، ایک دوسرے کی تفسیق اور تکفیر بڑی بڑی مہریں ہو رہی تھیں، مدرسوں میں پرانا فرسودہ طریقہ درس جاری تھا، جو زمانہ کے انقلاب سے بیکار اور نئے زمانہ کے لئے قوم کے نئے رہبر اور رہنما پیدا کرنے سے قاصر ہو رہا تھا۔

یہ صورت حال تھی کہ اتفاق وقت اُس خوش قسمت مدرسہ فیض عام کانپور کی چٹائی پر مدرسہ مذکور کے چند فارغ التحصیل طلبا کی دستار بندی کے موقع پر چند نفوس قدسیہ اس صورت حال پر غور فرما رہے تھے، یہ ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۲ء تھا۔ اس مجمع میں جو باکمال نفوس جلوہ افروز تھے اُن کے متبرک ناموں پر ایک نگاہ آج بھی بتا سکتی ہے کہ وہ کس پایہ کے تھے، حالانکہ انمیں سے بعض کا اسوقت عنفوان شباب تھا۔

۱۔ استاذ الاساتذہ حضرت مولانا محمد لطف اللہ صاحب علی گڈھی۔

۲۔ مولانا حافظ شاہ محمد حسین صاحب الہ آبادی۔

۳۔ مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی مدرس مدرسہ جامع العلوم کانپور

۴۔ مولانا محمد خلیل احمد صاحب مدرس دوم مدرسہ دیوبند بعدہٗ مدرس اعلیٰ مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور۔

۵۔ مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری (جو اُسی سال مدرسہ سے فارغ ہوئے تھے)

۶۔ مولانا نور محمد صاحب پنجابی مدرس مدرسۂ اسلامیہ فتحپور (بڑے متقی اور صاحب کمال بزرگ تھے، میں نے زیارت کی تھی)

۷۔ مولانا احمد حسن کانپوری، مدرس اوّل مدرسۂ فیض عام کانپور (محشی مثنوی مولانا رومؒ)

۸۔ مولانا سید محمد علی صاحب (ناظم اوّل ندوۃ العلما)

۹۔ مولانا محمود حسن صاحب مدرس اوّل مدرسۂ دیوبند (شیخ الہند رحمۃ اللہ تعالیٰ)

۱۰۔ مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی۔

۱۱۔ مولانا حکیم سید محمد ظہور الاسلام صاحب فتحپوری (نہایت متقی و بیدار، انکی زیارت سے میری آنکھیں شاد ہوئی ہیں)

۱۲۔ مولانا عبد الغنی صاحب پھلکم پوری

۱۳۔ مولانا حکیم فخر الحسن صاحب گنگوہی۔

۱۴۔ مولانا سید شاہ حافظ تجمل حسین صاحب دیسنوی بہاری (خلیفہ حضرت شاہ فضل رحمان صاحب گنج مرادآبادی

میرے رشتہ کے چچا تھے (ندوہ میں تعلیم کے لیے میرا آنا انہیں کی تحریک کا نتیجہ تھا۔)

یہ اسلامی ہندوستان کے گذشتہ دور کے وہ نامی نام ہیں جن پر اُس دور کو پورا فخر و ناز ہے۔ اس منتخب جلسہ میں یہ طے پایا کہ باہمی مشورہ سے علماء کی ایک مجلس قائم کیجائے، اور آیندہ سال مدرسۂ فیض عام کے سالانہ جلسہ کے موقع پر تمام ہندوستان کے علماء کو اسکے لئے عام دعوت دیجائے۔ اس مجلس کا نام ندوۃ العلماء قرار پایا، اور اشتہارات و اخبارات کے ذریعہ سے آیندہ جلسہ کا اعلان کیا گیا، اور ایک صاحب اس غرض سے مقرر کئے گئے کہ وہ تمام ہندوستان کا معائنہ کر کے اگلے جلسہ میں اپنی رپورٹ پیش کریں۔ مولانا سید محمد علی صاحب جو مولانا لطف اللہ صاحب کے شاگرد رشید اور حضرت شاہ فضل رحمان صاحب کے مرید و خلیفہ تھے اور ردِ نصاریٰ میں متعدد کتابوں کے مصنف تھے، اور ردِ نصاریٰ میں تحفۂ محمدیہ نام ایک رسالہ نکالتے تھے، اس نئی مجلس کے پہلے ناظم مقرر ہوئے۔

تمام ملک میں جب ندوۃ العلماء کے مقاصد اور اسکے آیندہ اجلاس کا اعلان ہوا، تو عام مسلمانوں میں ایک نئے جوش و خروش کی لہر دوڑ گئی، علماء ہر طرف سے آآکر شریک ہونے لگے، اس صدا پر سب سے پہلے لبیک

سکنے والے ندوہ میں ایک نام اُس کا بھی تھا جو ہندوستان کے علاوہ روم و شام و مصر کے مدرسوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا تھا، اور اُسکے دل میں ہمارے مدرسوں کی زبوں حالی، ابتری اور ضروریات زمانہ سے بیخبری کا بڑا درد تھا جسکے مضمونوں، تقریروں اور تصنیفوں میں اُس کا احساس ہر دفعہ نئے رنگ میں ظاہر ہوتا تھا۔

(باقی)

انجمن طلبائے قدیم ندوۃ العلما

آئندہ پرچے سے دار العلوم ندوۃ العلما کے طلبائے قدیم اور ان کی انجمن کے متعلق کچھ صفحات مخصوص کر دیے جائیں گے جس میں ضروری باتیں شائع کی جائیں گی۔ ممبران انجمن سے درخواست ہے کہ وہ جلد از جلد رسالۂ الندوہ کے خریدار بن جائیں تاکہ انجمن کی کاروائی سے واقفیت حاصل کرنے میں سہولت رہے۔

حامد علی ندوی

ناظم انجمن طلبائے قدیم (مرکزی)

(دار العلوم ندوۃ العلما)

ندوہ کے مقاصد پر پہلی تقریر

گاہے گاہے باز خواں ایں دفتر پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را

مولانا شبلی مرحوم نے ندوہ کے دوسرے سالانہ اجلاس منعقدہ لکھنؤ شوال ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۸۹۵ء میں ندوہ کے مقاصد پر جو خطبہ دیا تھا، وہ آج پھر پڑھنے کے لائق ہے، اسلئے ہم آج اُسکو دوبارہ دُہرا رہے ہیں۔ تاکہ معلوم ہو کہ ہمارا سفر کہاں سے شروع ہوا تھا، اور ہم کہاں تک پہونچے ہیں۔

س

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

جناب صدر انجمن و دیگر بزرگان قوم!

آج اسوقت مجکو جس مضمون پر تقریر کرنے کی اجازت دیگئی ہے وہ یہ ہے کہ "زمانۂ موجودہ کے لحاظ سے ہمارے علماء کے فرائض کیا ہیں۔" یعنی زمانۂ موجودہ کی ضرورتوں کے لحاظ سے علماء پر کیا ذمہ داریاں ہیں ملک اور جماعت اسلامی کا اُنپر کیا حق ہے؟ قوم کے لئے اُن کو کیا کرنا ہے! اور اسوقت تک انھوں نے قوم کیلئے کیا کیا ہے؟ یہ سوالات نہایت اہم ہیں اور کچھ شبہ نہیں کہ جماعت اسلام کی بہبودی کا بہت کچھ بلکہ تمامتر دارومدار انھیں سوالات پر ہے۔

اے حضرات! جس زمانے میں یہاں اسلامی حکومت قائم تھی اُسوقت قوم کے دینی اور دنیوی دونوں قسم کے معاملات علماء کے ہاتھ میں تھے۔ نماز روزہ وغیرہ کے احکام بتانے کے علاوہ علماء ہی اُنکے مقدمے فیصل کرتے تھے۔ علماء ہی جرائم پر حد و تعزیر کی سزا دیتے تھے۔ علماء ہی قتل و قصاص کے احکام صادر کرتے تھے۔ غرض قوم کی دین و دنیا دونوں کی عنان اختیار علماء کے ہاتھ میں تھی۔ اب جبکہ انقلاب حکومت ہو گیا اور دنیوی معاملات گورنمنٹ کے قبضۂ اختیار میں آ گئے، تو ہم کو دیکھنا چاہئے کہ قوم سے علماء کا کیا تعلق باقی ہے یعنی گورنمنٹ نے کسقدر اختیارات اپنے ہاتھ میں

لے لئے ہیں وہ کیسے باقی رکھتے ہیں جو درحقیقت علما کا حق ہے اور جس میں دست اندازی کرنی خود گورنمنٹ کو مقصود نہیں ہے۔

علما کی موجودہ حالت ان کی عزلت نشینی بلکہ بے پروائی نے عام طور پر یہ یقین دلا دیا ہے کہ ان کو جو تعلق قوم سے باقی رہ گیا ہے وہ صرف مذہبی تعلق ہے یعنی یہ کہ صرف نماز روزہ وغیرہ کے مسائل بتا دیا کریں۔ باقی معاملات انکے دسترس سے باہر ہیں اور انکو ان معاملات میں دست اندازی کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

لیکن میرے نزدیک یہ خیال غلط اور محض غلط ہے۔ گورنمنٹ نے جو حقوق اپنے لئے مخصوص کرلئے ہیں بے شبہ علما کو ان سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن وہ حقوق ہیں کیا۔ مالگذاری کا وصول کرنا۔ امن و امان کا قائم رکھنا، دنیوی معاملات کے فیصلے کے لئے عدالتوں کا قائم کرنا۔ عہدہ داران ملکی کا مقرر کرنا۔ یا اور خاص اسی قسم کے امور ہیں جو گورنمنٹ نے اپنے اختیار میں لئے ہیں لیکن قوم کی زندگی کے اجزا صرف اسی قدر نہیں ہیں۔

قوم کی اخلاقی زندگی جو تمام ترقیوں کی جڑ ہے۔ قوم کی علمی حالت جس پر ترقی و تنزل کا مدار ہے۔ قومی مراسم و دستور جن سے قوم بنتی یا بگڑتی ہے اور سب سے زیادہ قوم کی دماغی زندگی یعنی خیالات کی وسعت، بلند حوصلگی، روشن ضمیری، آزاد خیالی، ان تمام اوصاف کے سرچشمے ہمارے علما اور علما کی تلقین و ہدایت ہے۔ شادی بیاہ وغیرہ کی وہ مسرفانہ رسمیں جنھوں نے سیکڑوں ہزاروں خاندان تباہ کردیے ہیں گورنمنٹ کا اُن پر کچھ زور نہیں چل سکتا لیکن الحمد للہ اس گئی گذری حالت میں بھی علما کو قوم پر وہ اختیار حاصل ہے کہ آج اگر تمام علما متفق ہوکر کمربستہ ہو جائیں تو تمام ہندوستان میں اس سرے سے اُس سرے تک خانہ برانداز رسمیں یکلخت معدوم ہوجائیں۔ قوم کے اخلاق جو روز بروز تباہ ہوتے جاتے ہیں گورنمنٹ اور گورنمنٹ کی تعلیم مطلق انکی اصلاح نہیں کرسکی اور نہ کرسکے گی لیکن اگر علما آمادہ ہوں اور مناسب تدبیروں سے کام لیں تو قوم میں پھر وہ اخلاقی خوبیاں پیدا ہوسکتی ہیں جو سو دو سو برس پہلے موجود تھیں

الحاد اور دہریت کی طرف میلان جو روز بروز عام ہوتا جاتا ہے اسکا روکنا اگر گورنمنٹ سے ممکن ہوتا تو وہ زیادہ نہیں تو مذہب عیسوی کو تو اس سے محفوظ رکھ سکتی۔ لیکن ہمارے علما اگر معقول طریقہ پر اسکو روکنا چاہیں تو اسی طرح

اُس کا قلع وقمع کرسکتے ہیں جس طرح یونانی فلسفے کے پھیلنے کے وقت امام غزالیؒ، امام رازیؒ، قاضی عضد، ابن رشد نے زندقہ والحاد کا استیصال کردیا تھا۔ ان باتوں سے ظاہر ہوا ہوگا کہ قوم کی زندگی کا بہت بڑا حصہ اب بھی علما ہی کا حق ملکیت ہے اور وہی اس حصے کی فرمانروائی کے کامل الاختیار ہیں یا ہوسکتے ہیں۔

غرض اس امر سے انکار نہیں ہوسکتا کہ علما کو قوم پر اب بھی نہایت وسیع اختیارات حاصل ہوسکتے ہیں۔ ان اختیارات کے حاصل ہونے کی شاید علما کو ضرورت نہ ہو لیکن قوم کو اسکی ضرورت اور سخت ضرورت ہے کیونکہ علما جبتک قوم کے خیالات، قوم کے اخلاق، قوم کے دل و دماغ، قوم کی معاشرت، قوم کے تمدن، غرض قومی زندگی کے تمام بڑے بڑے حصوں کو اپنے قبضۂ اختیار میں نہ لیں گے قوم کی ہرگز ترقی نہیں ہوسکتی۔

لیکن ان اختیارات کے ہاتھ میں لینے کے وقت علما پر کچھ ذمہ داریاں عائد ہونگی اور انھیں ذمہ داریوں کو میں علمائے حال کے فرائض سے تعبیر کرتا ہوں جو میرے مضمون کا عنوان ہے۔ ان فرائض کو بدفعات ذیل بیان کرتا ہوں۔

علما کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ ایک مجموعی قوت پیدا کریں یعنی تمام ہندوستان کے علما میں ایک خاص رشتہ اتحاد قائم ہو۔ تمام علما ایک دوسرے کے نام سے، مقام سے، حالات سے واقف ہوں، آپس میں خط و کتابت ہو، مہتم بالشان اُمور میں تمام علما شادرت اور استصواب سے کام لیں۔ کبھی کبھی وہ صرف اجتماع و اتحاد کی غرض سے ایک جگہ جمع ہوجایا کریں اور اس مقصد کے لئے ندوۃ العلما سے زیادہ عمدہ موقع نہیں ملسکتا۔

اے حضرات! علما کے باہمی اتفاق کی نسبت بار بار کہا جاچکا ہے اور اگر مجھکو بھی یہی کہنا ہوتا تو کچھ ضرورت نہ تھی کہ جو مضمون سیکڑوں دفعہ بیان کیا جاچکا ہے میں بھی اُسی کا اعادہ کروں لیکن مجکو ایک خاص پہلو کی طرف خیال دلانا ہے۔

اتفاق و اتحاد کا جو طریقہ اب تک لوگوں نے بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ تمام علما مسائل فقہیہ میں ہم مذہب و ہمخیال ہوجائیں اور اسوقت نہایت اعلیٰ درجے کا اتحاد و اتفاق قائم ہوجائے گا۔

لیکن میں پوچھتا ہوں کہ کیا ایسا اتفاق کسی زمانے میں کبھی ہوا ہے؟ صحابہ رضوان اللہ علیہم کے مبارک زمانے میں جبکہ تمام مسلمان کنفس واحدۃ تھے کیا مسائل میں اختلاف آرا نہ تھا؟ جس شخص نے صحیح ترمذی مطالعہ کی ہے اور قریباً ہر مسئلے

کے متعلق اس کے تراجم بوابٔ لکھے ہیں کیونکر اس بدیہی واقعہ سے انکار کرسکتا ہے۔

وضو، تیمم، قرات اور نماز کے دیگر واجبات وسنن کے متعلق کیا تمام صحابہ پہلے ہی قاطبۃً متفق الرائے تھے۔

کون ایسا غلط دعویٰ کرسکتا ہے؟ لیکن کیا ان اختلافات مسائل کی وجہ سے اُن میں کسی قسم کی کدورت تھی کسی طرح کا بغض تھا کسی طرح کی اجنبیت تھی۔ حاشا للہ کبھی نہیں ہرگز نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اتحاد و اتفاق کے لئے یہ ضرور نہیں کہ آپس میں کسی طرح کا اختلاف رائے نہ ہو، اس لئے ہم کو اتفاق و اتحاد کی حدود متعین کرلینے چاہئیں یعنی اختلاف و اتفاق کے دائرہ الگ الگ ہوں۔ ایک عالم کو کسی مسئلے میں دوسرے سے اختلاف ہو تو اختلاف کا اثر اسی مسئلے تک محدود رہے یہ نہ ہو کہ اس اختلاف کی وجہ سے اور تمام تعلقات بھی منقطع ہوجائیں۔ جو اختلاف رکھ کر تعلقات نہیں رکھتے اسکی نہایت عمدہ مثال امام بخاری و امام مسلم کا واقعہ ہے امام مسلم حدیث معنعن کے شرائط اتصال میں امام بخاری سے اختلاف رکھتے تھے چنانچہ اپنی کتاب کے مقدمے میں امام بخاری کا مذہب بیان کرکے کہا ہے کہ یہ مذہب محض لغو اور باطل ہے اور اس قابل نہیں کہ اسکی رد کی طرف توجہ کیجائے۔ لیکن باوجود اس کے جب امام بخاری سے ملنے گئے تو نہایت محبت اور تعظیم سے ان کی پیشانی چومی اور کہا کہ دعنی اقبل رجلک۱؎۔

قرون اولیٰ میں اسی اصول پر عمل تھا یعنی اختلاف و اتفاق کی حد جدا جدا متعین تھیں اور یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں باوجود اختلافات کے اتحاد و اتفاق کا زور پوری طرح قائم تھا صحابہؓ بیسیوں مسائل میں مختلف الرائے تھے لیکن عام اتحاد و اتفاق میں اختلاف کا پرتو تک نہ تھا۔ قرن ثانی اور اوائل قرن ثالث کا بھی یہی حال تھا۔

آج جس چیز کی وجہ سے مسلمانوں کی ہوا اکھڑ گئی ہے، جسنے ہماری طاقت کو بالکل گھٹا دیا ہے جسکی وجہ سے گورنمنٹ کی نگاہ میں اس گروہ کی عظمت نہیں رہی جسکی وجہ سے مخالفین کو ہیر شماتت کا موقع ملا ہے، وہ یہ ہے کہ ہم اختلاف و اتفاق کو اپنی حدود پر نہیں رہنے دیتے۔

ہم نے بارہا دیکھا ہے کہ کوئی مجمع عام جماعت اسلام کے فائدہ کی غرض سے منعقد ہوا مثلاً دستاربندی کا جلسہ

۱؎ یعنی اجازت دیجئے کہ آپکے پاؤں چوموں ۱۲

کسی مدرسۂ عربی کا جلسہ۔ اصلاح تعلیم کا جلسہ وغیرہ وغیرہ۔ تو وہ لوگ جلسے میں شریک تک نہ ہوئے جنکو بانیانِ جلسہ سے مسائل مختلف فیہا کے بارے میں اختلاف تھا۔

اے حضرات۔ آپکو معلوم ہو کہ یہی ندوۃ العلما جسمیں آپ اسوقت تشریف فرما ہیں اگر اتفاق و اتحاد کے ٹھیک اصول پر قائم ہو جائے تو وہ کتنی بڑی عظیم الشان طاقت بن سکتا ہے۔

اُسوقت ندوہ دعویٰ کر سکتا ہو کہ اوقاف کے لاکھوں روپے جو متولیوں کے ہاتھ سے نہایت بیدردی سے برباد ہوتے ہیں ندوہ کے ہاتھ میں دیے جائیں اور گورنمنٹ نہایت خوشی سے اس دعوے کو قبول کرے

ندوہ دعویٰ کر سکتا ہو کہ انگریزی مدارس میں عربی و فارسی کا نصاب تعلیم اسوقت ابتری کی حالت میں ہو اسکی اصلاح کر دیجائے اور گورنمنٹ کو اس دعوے پر بہت کچھ لحاظ ہوگا۔

ندوہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ جسطرح قدیم زمانے میں عدالت صدر میں فقہی مسائل کے لئے قاضی و مفتی مقرر کئے جاتے تھے وہ قاعدہ سر نو سے قائم کیا جائے۔

ندوے کو اُسوقت یہ قوت حاصل ہوگی کہ تمام جماعت اسلام اسکی ہدایتوں کی پابند ہو اس کے فتووں کے آگے سر جھکائے اسکے فیصلوں سے سرتابی نہ کر سکے اس صورت میں بجز قوم کو تمام بیہودہ رسم سے خلاف شرع باتوں سے ناجائز امور سے بزور روک سکتا اور جماعت اسلام کو نماز کا، روزے کا، حج کا، زکوٰۃ کا بزور پابند کیا جا سکتا ہو یہ زور تلوار کا نہیں ہوگا، بلکہ اتباع شریعت کا، اور اتفاق باہمی کا۔

لیکن یہ قوت اسطرح نہیں حاصل ہو سکتی ہو کہ سال میں ایک دفعہ ندوے نے اجلاس کر لیا۔ اشتہارات کا ڈھنڈورا پیٹ کر باہر والوں کو جو حقیقت سے ناواقف تھے بلا لیا۔ علما عاجزی سے، تقاضے سے خوشامد سے، سفارش سے مجلس میں شریک ہو گئے: ندوہ اگر یوں ہوا تو سمجھ لیجئے کہ اور انجمنوں کی طرح وہ بھی سر کا ایک مشاعرہ ہو۔

ندوے کو یہ قوت اُسوقت حاصل ہوگی جب تمام علما اسکو اپنا ذاتی کام سمجھیں بغیر کسی درخواست کے تقاضے کے، منت کے دور دور سے سفر کر کے آئیں اور سال بھر اُسکی دُھن میں رہیں کسقدر افسوس کی بات ہو

کہ اہل حدیث و احناف میں لڑائی ہو کر مقدمہ عدالت تک جائے تو بن بلائے دونوں فریق کے علما سیکڑوں
کوس سے دوڑے ہوئے آئیں اور ندوے سے بلایا جائے تو منتوں کو وہ خوشامدیں کرنی پڑیں جو کسی تقریب میں
بیاہ کو مہمانوں کے بلانے میں کرنی پڑتی ہیں جس قوم کو اختلاف کی باتوں میں یہ شیفتگی ہو اور اتفاق میں یہ
بے پروائی اور بیدلی اُس کا خدا ہی حافظ ہے۔

حضرات ندوے کے قالب میں جو روح ہے آپ اس کا اندازہ بھی نہیں کرسکتے، یہ مجلس صرف ایک برس سے
قائم ہوا ابھی تک اُس نے کوئی عملی کارروائی نہیں کی ہے اتفاق کا کوئی جلوہ علانیہ نمایاں نہیں ہوا تاہم اپنے وہ
اثر اس زور سے پیدا کر دیا ہے جو اور مجلسوں کو باوجود مدتہائے دراز اور زر خرچی و جانفشانیوں کے اب تک حاصل نہیں ہوا۔
ان کی ایک پکار پر کہاں کہاں سے لبیک کی صدائیں آئیں کس قدر دور دراز مسافتوں کو طے کر کے
لوگ یہاں تک پہنچے۔ لوگوں کی نگاہیں کس بیتابی کس جوش کس محبت سے اس پر پڑ رہی ہیں۔

اب یہ علما کے ہاتھ میں ہے کہ ندوے کو اس بلند درجے پر پہونچائیں جو اس کے رُتبے کے شایاں ہے
یا خدانخواستہ نااتفاقی سے، غفلت سے، رشک سے، غلط فہمی سے اسی طرح برباد کر دیں جس طرح قوم کی اور تمام
کوششیں نااتفاقی سے برباد ہوتی رہی ہیں۔

فجر الاسلام

فجر الاسلام تازہ ترین مطبوعات میں سے نہیں ہے، اسکا تیسرا اڈیشن جو ہمارے پیش نظر ہے ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا ہے لیکن ہندستان میں ابھی یہ کتاب پرانی نہیں ہوئی ہے امید ہے کہ یہ تبصرہ اور تلخیص قارئین کیلئے دلچسپی اور فائدہ سے خالی نہوں گے اس ضمن میں ایک نئی تاریخ اسلام کا خاکہ اور ابتدائی تخیل بھی سامنے آجائیگا۔ رسالہ کی آیندہ اشاعت میں ہم انشاءاللہ اس کتاب کے دوسرے حصہ "ضحی الاسلام" پر تبصرہ کریں گے۔

"ابوالحسن علی ندوی"

مشرقی اسلامی ممالک سے جنپر مدت سے مغرب کا سیاسی، علمی اور ذہنی تسلط ہے، سطحیت، تقلید اور ذہنی پستی کی عام شکایت ہے، وہاں یا تو بالکل قدیم حلقے ہیں، جنمیں قطعاً کوئی جدت و تحقیق اور ذہنی و علمی ترقی نہیں ہے یا پھر وہ جدید حلقے ہیں جنکے فکری قویٰ پر یورپ کا ذہنی استیلا ہے۔ جنکا طریق فکر اور طریق بحث خالص اسلامی مسائل میں بھی خالص مغربی ہے، اور وہ اسلامی و قومی علوم میں بھی یورپ کے خوشہ چیں اور اسکے دست نگر ہیں، اور انکی حیثیت مغربی تالیفات کے ناقل و مترجم و مرتب سے زیادہ نہیں اسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ بجائے اسلام کا مستقل دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) مرتب کرنیکے جسمیں خاص اسلامی ممالک کے محققین، صاحب نظر فضلا اور ماہرین فن شرکت کریں اور وہ تمام اسلامی موضوعوں پر ایک جامع و مستند ماخذ اور آخری چیز ہو، مصر کی لجنۃ التالیف و الترجمہ والنشر نے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کا انگریزی سے عربی میں ترجمہ کرنے پر قناعت کی جو بلا کسی معقول محققانہ حاشیہ اور تردیدی فٹ نوٹ کے بالاقساط شائع ہوتا ہے۔ ہمکو خوشی ہے کہ ہندستان اپنی دہری طویل اور براہ راست غلامی کے باوجود اس عام ذہنی اور علمی سطح سے کچھ بلند ہے اور یہاں کے بعض اسلامی اداروں اور علمی حلقوں نے اسلامی مسائل اور مضامین پر ایسا سنجیدہ اور باوزن لٹریچر شائع کیا ہے جسپر ہندستان کے مسلمانوں کو بجا طور پر فخر ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اب دوسرے اسلامی ممالک کو ہندستان کی بعض اسلامی تالیفات کے ترجمہ کی طرف توجہ ہو رہی ہے۔[1]

---

[1] قارئین کرام کو شاید اسکا علم ہو کہ سیرۃ النبیؐ کے بعض حصوں کا ترجمہ ترکی زبان میں عرصہ ہوا ہو چکا ہے۔ اب انکو یہ سنکر مسرت ہوگی کہ جامعہ مصریہ کے ایک استاد پروفیسر عبدالوہاب عزام نے جو فارسی اور ترکی زبان سے خوب واقف ہیں اور اردو کا مطالعہ کر رہے ہیں سیرۃ کے عربی ترجمہ کی اجازت چاہی ہے۔

سب سے زیادہ توقع مصر سے ہو سکتی تھی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصر ابھی اس مقام پر ہو جس پر ہندوستان
اس صدی کے آغاز میں تھا یعنی مسئلۂ پردہ، مسئلۂ جزیہ، تعدد ازدواج اور غلامی کے مسائل، جن سے ہندوستان
آگے بڑھ چکا ہو، مصر میں ابھی ان کی وہی اہمیت ہے۔

لیکن اس کلیہ میں استثنا بھی ہو اور ہم بڑی مسرت کیساتھ اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ مصر میں
اب ہم کو ایسے فاضل نوجوان نظر آتے ہیں جو اسلامی مسائل پر اپنے دماغ سے سوچتے ہیں اور ان مضامین پر اپنے مطالعہ،
محنت و تفتیش اور ذاتی قابلیت سے وقیع لٹریچر پیدا کر رہے ہیں، ان میں سب سے زیادہ قابل ذکر شخصیت استاذ احمد امین
کی ہے جنھوں نے تاریخ اسلام کے ایک جدید سلسلہ کے ذریعہ مصر بلکہ بیرون مصر کے علمی حلقوں میں کافی شہرت و مقبولیت
حاصل کر لی ہے، فجر الاسلام اس سلسلہ کی پہلی کتاب ہے جس پر ہم آج کی صحبت میں تبصرہ کرنا چاہتے ہیں۔

کتاب سے پہلے ہم مؤلف کا مختصر تعارف کرا دینا چاہتے ہیں، کتاب کے مؤلف احمد امین جامعہ مصریہ میں
(جسکا نام اب جامعۃ فواد الاول ہو) تاریخ ادب عربی کے استاد ہیں لیکن اس موضوع کے علاوہ جس کے وہ معلم ہیں
اور جس میں ان کی وسعت نظر تعجب انگیز نہیں، عام اسلامی علوم (علم کلام، تفسیر، حدیث اور فقہ و اصول) میں دستگاہ
رکھتے ہیں اور ان کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہو کہ یونیورسٹی کے عام طلبہ و فضلا کے برخلاف انھوں نے ان قدیم
علوم کو قدیم طریقہ پر محنت و تحقیق سے پڑھا ہو، اور ان فنون میں وسیع اور گہری نظر رکھتے ہیں، فلسفہ کی قدیم و جدید
دونوں شاخوں سے واقف ہیں، انگریزی مضامین پر ان کی تالیفات و تراجم ہیں۔

لیکن ان کا اصلی جوہر اور جو چیز ان کی کتابوں کا مطالعہ کرنیوالوں کو سب سے زیادہ متاثر کرتی ہو وہ ان کا
سلامت فہم اور دماغی توازن ہو، ان کا دماغ نہایت پُرسکون صاف اور سلجھا ہوا ہو، تعبیر و طرز بیان میں، جزئیات سے
کلیات کے استخراج میں اور واقعات کی کیمیاوی طرز کی تحلیل میں ان کو کافی دخل ہو اور بحیثیت مجموعی وہ اس زمانہ کے
کامیاب مؤلف ہیں۔

لیکن ان اوصاف کے باوجود ہم ہندوستانی مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے ان کی کتاب میں بعض خفیف سی

بے اعتدالیاں اور یورپین مؤلفین کے طرز کی بعض غلطیاں بھی ملتی ہیں، جن کی طرف ہم اپنے تبصرہ میں اشارہ کرینگے۔

کتاب کے تبصرہ سے پہلے عام تاریخوں سے اسکا امتیاز بھی سمجھ لینا چاہیے، ہماری بیشتر تاریخیں سنین کی جنتریاں اور اگر کہا جانے کہ واقعات کی فہرست ہیں تو بیجا نہ ہوگا، ان چند مخصوص (اکثر سلاطین و وزراء) کی شخصیتیں چھائی ہوتی ہیں جو قومی زندگی کے تمام شعبوں اور گوشوں کو اسطرح چھپا دیتی ہیں جس طرح ایک بڑا سایہ دار درخت نیچے کے چھوٹے پودوں اور سطح زمین کو چھپا لیتا ہے، قوم کی انفرادیت انکی شخصیت میں گم ہوکر رہجاتی ہو اوران کی زندگی کے تمام شعبوں میں سے صرف فوجی یا سیاسی شعبہ نمایاں ہوسکتا ہو، اگر آپ معلوم کرنا چاہیں کہ فلاں عہد حکومت میں قوم کا تمدن کیا تھا، اسکی عقلی حالت کیا تھی، دینی حالت کیا تھی، اسکا سیاسی نظام کیا تھا، اسوقت قوم میں کیا کیا سیاسی علمی، اور اجتماعی رجحانات تھے اور مستقبل کی تشکیل میں کون کون سے اندرونی و بیرونی عوامل و مؤثرات کام کررہے تھے تو اسکا جواب آپکو کسی ایک تاریخ سے نہیں ملیگا۔ اور اسکے لئے آپکو تاریخ ادب شعرا کے دواوین اور قصے کہانیوں کے ہزاروں صفحات پڑھنے پڑیں گے، پھر بھی ضروری نہیں کہ آپکو تشفی بخش جواب ملے۔

اس سلسلہ میں معلمین کو ایک نیا عملی تجربہ ہوتا ہو وہ یہ کہ اگر وہ نوجوان طلبہ کی مخصوص قسم کی ذہنی تربیت کرنا چاہیں اور ان میں چند حقائق کا اذعان پیدا کرنا چاہیں تو ہمارے قدیم طرز کی کتابیں انکی اعانت نہیں کرتیں فرض کیجیے کہ موجودہ ذہنی و سیاسی کشمکش کے زمانے میں ہمارا مسلمان طالبعلم تاریخ اسلام کا ایک پورا سلسلہ پڑھ لیتا ہے تو اسکے دماغ پر کونسا مفید اور دیرپا اثر قائم ہوتا ہو اور وہ مسائل حاضرہ میں کونسی علمی و عملی رہنمائی حاصل کرتا ہو اسکے لئے مقدمۂ ابن خلدون کے طرز کی چیز بلا شبہ مفید ہو لیکن ضرورت ہو کہ پوری اسلامی تاریخ سے یہ کام لیا جائے کہ قوموں کی ذہنی تعمیر میں تاریخ سے زیادہ مؤثر اور مفید چیز کوئی نہیں۔

اس راہ میں جامعۂ مصریہ کے تین فاضل اُستادوں نے تجربہ کا پہلا قدم اُٹھایا، اور انھوں نے تاریخ اسلام کا ایک نیا سلسلہ شروع کیا اور اسکو دو اہم دوروں پر تقسیم کر دیا، ایک ابتداء اسلام سے خلافت بنی اُمیہ تک کا دور، دوسرا عہد عباسی، ہر عہد کی مختلف حیثیتوں سے انھوں نے تاریخیں لکھیں، مثلاً عقلی تاریخ،

سیاسی تاریخ، ادبی تاریخ عقلی تاریخ استاذ احمد امین کے قلم سے ہے، جس کا نام فجر الاسلام ہے، سیاسی تاریخ استاذ عبد الحمید العبادی نے اور ادبی تاریخ ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے لکھی ہے۔

اسوقت ہمارے پیش نظر استاذ احمد امین کی کتاب ہے۔

کتاب دو ابواب میں منقسم ہے جن کے تحت میں متعدد فصلیں ہیں۔

پہلے باب کا عنوان ہے "عرب جاہلیت میں" اس باب کی ابتدائی دو فصلوں میں عرب پر ایک جغرافی اور تاریخی نظر ڈالی گئی ہے اور ان کے اخلاقی و اجتماعی حالات اور بیرونی دنیا سے ان کے تعلقات کا ذکر کیا گیا ہے تیسری فصل میں عربی عقلیت اور اسکی خصوصیات کو بیان کیا گیا ہے اور اسمیں عرب و غیر عرب مؤرخین کی موافق و مخالف آرا کا خلاصہ اور محاکمہ ہے، چوتھی فصل میں جاہلیت میں عربوں کی عقلی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اسکی تخلیق میں طبعی اور اجتماعی حوادث کا حصہ بتایا گیا ہے، پانچویں فصل میں اس عقلی زندگی کے مظاہر دکھائے گئے ہیں اور بتایا ہے کہ زبان شاعری ضرب الامثال انپر کہاں تک اور کس طرح کی روشنی ڈالتے ہیں، ادب تاریخ ادب عربی کے طالبعلموں کے لئے یہ حصہ مفید و دلچسپ ہے۔

دوسرا باب کتاب کا اہم باب ہے، اس کا عنوان ہے "اسلام"

اس باب میں اسلام کی تشریح اور اسلامی تعلیمات کی تلخیص اور اسکے امتیازی خصوصیات بتانے کے بعد یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلامی تعلیم عرب میں کیسی اثر انداز ہوئی، اسلام و جاہلیت کے مقابل آئیڈیل کو پیش کیا گیا ہے اور اسلام و جاہلیت کی مذہبی سیاسی اجتماعی اور ذہنی کشمکش کی قلمی تصویر کھینچی ہے، اس حصہ میں مؤلف کی "اسلامیت" نمایاں طور پر ظاہر ہوتی ہے، اور یہ دیکھکر بڑی خوشی ہوتی ہے کہ مؤلف اسلام کے عقلی و اخلاقی انقلاب کی وسعتوں اور گہرائیوں سے واقف ہے اور اس سلسلہ میں اسکا تخیل اسلام سے متعلق ہمارے جدید تعلیمیافتہ مسلمانوں اور سیاسی رہنماؤں کی طرح ناقص اور محدود نہیں ہے بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ اسلام زندگی کے ہر شعبہ پر اثر انداز ہوتا ہے اور وہ ایک بالکل علیحدہ عقلیت اور مخصوص اخلاقی فلسفہ ہے، وہ اسلام کے ذہنی و اخلاقی انقلاب کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے

کان للاسلام اثر کبیر فی تغییر قیمۃ الاشیاء   عربوں کی نظر میں اشیا، اور اخلاق کی قدر و قیمت میں اسلام نے

والاخلاق فی نظر العرب، فارتفعت قیمة اشیاء وانخفضت قیمة اخری واصبحت مقومات الحیاة فی نظرهم غیرها بالامس وقد لاقی النبی صلی الله علیه وسلم صعوبات کبری فی نقلهم من عقلیتهم الجاهلیة الی عقلیتهم الاسلامیة تجدها مبسوطة فی کتب السیرة (ص۹۳)

بڑا تغیر وانقلاب پیدا کر دیا، کچھ چیزوں کی قدر وقیمت بڑھ گئی اور کچھ چیزوں کی گھٹ گئی اور کل تک زندگی کے جو عناصر تھے آج وہ نہیں رہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جاہلی عقلیت سے اسلامی عقلیت تک انہیں لے جانے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا جس کا مفصل حال تم کو سیرت کی کتابوں سے معلوم ہوگا۔

وہ جا بجا اسلام کو عقلیت جدیدہ کے جملہ سے ادا کرتا ہے اور اسلام و جاہلیت کی عرفانی کشمکش کو "نزاع بین عقلیتین" اور "نزاع بین نفسیتین" (دو عقلیتوں کی کشمکش اور دو نفسیتوں کی کشاکش) سے ادا کرتا ہے جو بالکل صحیح تعبیر ہے

اسکے بعد اُسنے یہ دلچسپ سوال پیدا کیا ہے جو شاید تاریخ اسلام کے طالبعلموں کے ذہن میں بھی پیدا ہوتا ہوگا، وہ یہ کہ اسلام عرب پر کتنا اثر انداز ہوا اور کیا جاہلیت نے اسلام کے سامنے بالکل ہتھیار ڈالدیے، اسکے الفاظ ہیں:۔

"سوال یہ ہے کہ عرب اسلام سے کس حد تک متاثر ہوئے اور کیا جاہلیت کی تعلیمات اور جاہلی جذبات اسلام میں داخل ہوتے ہی فنا ہو گئے، واقعہ یہ ہے کہ ایسا نہیں ہوا، اور مذاہب و آراء کی تاریخ اسکو ماننے کیلئے تیار نہیں اسلئے کہ قدیم و جدید کے درمیان کشمکش اور موروثی و جدید مذہب کے درمیان مقابلہ طویل مدت تک جاری رہتا ہے اور جدید قدیم کی جگہ تدریج لیتا ہے اور ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ وہ مطلقاً ناپید ہو جائے، یہی جاہلیت و اسلام کے معاملہ میں پیش آیا، جاہلی خیالات وقتاً فوقتاً ابھرتے رہتے تھے اور اسلامی خیالات سے دست و گریباں ہوتے تھے، اور یہ کشمکش مدت تک جاری رہی" ص۹۰

مصنف نے اسکے بعد ان جاہلی رجحانات کے اعتقادی، اخلاقی، اجتماعی اور سیاسی مظاہر بیان کئے ہیں، اور اس سلسلہ میں عراق، شام، خراسان اور اندلس میں یمنی و عدنانی قبائل کی جاہلانہ منافرت، عصبیت اور خانہ جنگی کے واقعات اور بنی امیہ اور حجاز کے بعض امراء و شرفا کی سرفانہ اور پرعیش و عشرت زندگی کے نمونے پیش کئے ہیں جسمیں صاف جاہلیت کی جھلک نظر آتی ہے۔

اسکے مقابلہ میں وہ تصویر کا دوسرا رخ بھی پیش کرتا ہے اور یہ اسلامی انقلاب کی مکمل تصویر ہے

بجانب هذا ترى قوما صبغهم الاسلام صبغة جديدة حتى انقطعت الصلة بينهم جاهليتهم وبينهم مسلمين كالذى ترى فى سيرة ابى بكر وعمر وكثير من الصحابة ورع وزهد وتواضع والتزام شديد لاوامر الدين وحياة لا تستطيع ان ترى فيه ماخذا جاهليا . فى الاسلام وتجد فى خطبهم وكتبهم واقوالهم اثر الاسلام بينا حتى كانهم خلقوا فى الاسلام خلقا جديدا (ص)

اسکے مقابلہ میں کچھ لوگ تم کو ایسے نظر آئیں گے جن کو اسلام نے نئے رنگ میں رنگ دیا یہانتک کہ ان کی گذشتہ جاہلی زندگی اور نئی اسلامی زندگی میں کوئی تعلق ہی نہیں معلوم ہوگا اور یا معلوم ہوگا کہ وہ کوئی اور لوگ تھے اور یہ اور لوگ ہیں جیسے کہ حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ اور بہت سے صحابہؓ کی سیرت سے معلوم ہوتا ہے احتیاط و زہد اور خاکساری اور دینی احکام کی شدید پابندی و ایسی زندگی جسمیں تم کو جاہلیت کی بو بھی نہیں معلوم ہوگی، انکی تقریریں خطوط اور اقوال میں تم کو اسلام کا نمایاں اثر معلوم ہوگا، یہانتک کہ جیسے انکی اسلام میں نئی پیدائش ہوئی ہو۔

انہیں وہ فیصلہ کرتا ہو کہ تمام اہل عرب پر یکساں رنگ نہیں پڑھا تھا۔ یہ رنگ شوخ اور ہلکا تھا۔

تیسری فصل میں عربی عقلیت اسلامی زندگی اور اسلامی تہذیب پر قوموں کے اختلاط مفتوح قوم کی باہم سکونت اور عجمی غلاموں کے اثرات بیان کئے ہیں، مؤلف کے نزدیک عربی معاشرت و تہذیب قانون، سیاسی اور اجتماعی نظام اور عقلیت ایرانی اور رومی اثرات سے متاثر ہوئے۔ ص۱۱۶

اسکے بعد وہ ایک قدم آگے بڑھاتا ہے اور ثابت کرتا ہے کہ مذہب بھی ان اثرات سے کلی طور پر محفوظ نہیں رہا، وہ کہتا ہے کیا تمہارا خیال ہے کہ شامی اور رومی عیسائی اور قبطی جب اسلام قبول کرتے تھے تو انکے موروثی اور آبائی عقائد بالکل مٹجاتے تھے اور وہ اسلام کو اسطرح سمجھتے تھے جیسے کہ اسلام کا منشا ہے یہ ممکن نہیں اور علم النفس اسکی تائید نہیں کرتا، دوسری جگہ کہتا ہے۔ یہ خیال صحیح نہیں کہ یہ عجمی نومسلم اسلام کو اسکی اصلی روح اور تخئیل کے مطابق ایسا ہی سمجھتے تھے جیسے کہ عرب مسلمان ان لوگوں نے اسلام کو اپنی اپنی رسوم و عادات سے ملا جلا قبول کیا اور اسکے الفاظ کو اپنے مذہبی الفاظ کے ہم معنی سمجھا۔" ص۱۱۱

مسلمانوں کی فرقہ بندیوں اور تفسیر کی اسرائیلی روایات اور عجمی ذوق سے مذہب کا متاثر ہونا ثابت کیا ہے

تیسرے اور چوتھے باب میں ایرانی اور یونانی اثرات کو علیحدہ علیحدہ بیان کیا ہے، ایرانی اثرات میں سے اُسنے خصوصیت کیساتھ تشیع اور تصوف کا نام لیا ہے، ایرانی مذہب و فلسفہ کے بیان میں اسنے تفصیل کیساتھ زردشت مانی اور مزدک کے مذہب و فلسفہ کو پیش کیا ہے اور اس سلسلہ میں یہ دلچسپ تاریخی انکشاف کیا ہے کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا اشتراکی رجحان و تبلیغ دراصل مزدک کے اشتراکی فلسفہ کی بازگشت تھی اور ان دونوں کے درمیان کی کڑی یورپ کے مذاق تحقیق (ریسرچ) کے مطابق عبداللہ بن سبا کو بنایا ہے جس نے بقول مؤلف حضرت ابوذر کو اشتراکی تعلیم دی اور ابوذر نے اپنی خوش نیتی میں اسکو قبول کرکے اپنے مخصوص مذاق طبیعت نے مدینہ میں اسکو پھیلا دیا۔ ص ۱۳۶-۱۳۷

یہ بالکل یورپین مؤرخین و مستشرقین کے طرز کا ریسرچ ہے جو مفروضات و قیاسات کی بنیاد پر بڑے بڑے واقعات کی عمارتیں کھڑی کر دیتے ہیں۔

اسی طرح دوسری فصل میں یونانی اور رومی مذہب فلسفہ اور ادب کے اثرات بیان کئے ہیں اور یونانی فلسفہ کے مختلف حلقوں اور مذاہب کو بیان کیا ہے۔

پانچویں باب میں اس عہد کی علمی تحریکوں پر سرحاصل تبصرہ کیا ہے، پھر انکی اہم شخصیات و مرکزوں کو بیان کیا ہے اس سلسلہ میں یہودی اور عیسائی نومسلموں کے غیر صالح اثرات کا تذکرہ کیا ہے۔

باب کی دوسری فصل میں عقلی زندگی کے مرکزوں کا بیان ہے اسمیں سب سے پہلے حجاز اور وہاں کے دو مذہبی حلقوں مکہ اور مدینہ کا تذکرہ ہے، اس سلسلہ میں اُسنے سنجیدہ اور باوقار مذہبی و علمی زندگی کیساتھ حجاز کی نوجوان اور آزاد زندگی کی تصویر بھی پیش کر دی ہے، جو اغانی کے مرقع سے ماخوذ ہے، عراق کے ذکر کے ساتھ اسکی تمام عقلی سیاسی اور قومی خصوصیات کا دلچسپ تذکرہ ہے اور وہاں کے دو معرکۃ الآرا علمی حلقوں کوفہ اور بصرہ کا فرق ظاہر کیا گیا ہے، لیکن اسکی پوری تفصیل درحقیقت مصنف نے اپنی کتاب ضحی الاسلام کے دوسرے حصہ (عہد عباسی کی علمی تاریخ) میں کی ہے اور حقیقت میں وہی اسکا محل بھی ہے۔

عراق کے علاوہ شام و مصر کا بھی اسی طرح تذکرہ ہے۔

چھٹے باب میں مذہبی تحریک کا تفصیلی ذکر ہے اور قرن اول کے اسلامی علوم و فنون کی تدوین کی تاریخ اور اس دور میں انکے آغاز و ترقی کی کہانی سنائی ہے اور تفسیر حدیث و فقہ پر الگ الگ تحقیقی بحث کی ہے۔ فن تفسیر اگرچہ مؤلف کا موضوع درس نہیں ہے لیکن اپنے عام مطالعہ اور فطری سلامت فہم کی بناپر بعض حقائق و نکات اسکے قلم سے نکل جاتے ہیں مثلاً وہ کہتا ہے کہ عربوں کی زبان میں قرآن کے نازل ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اہل زبان اسکو پورے طور پر سمجھتے بھی ہوں۔ اس سلسلہ میں وہ کتنی صحیح بات کہتا ہے۔

لان فهم الكتاب لايتطلب اللغة وحدها وانما يتطلب درجة عقلية تتفق ودرجة الكتاب في ... (...)	اسلئے کہ کتاب کا سمجھنا صرف زبان کا متقاضی نہیں اسکے لئے اس مخصوص عقلی درجہ کی ضرورت ہو جو اپنی ترقی میں کتاب کے درجہ کے مطابق ہو۔

مذاہب و فرق کے قرآنی استدلالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

والواجب ان تكون العقيدة تابعة للقران لا ان يكون القران تابعا للعقيدة (ص ۲۴۷)	عقیدہ کو قرآن کا تابع ہونا چاہئے نہ کہ قرآن عقیدہ کا تابع ہو۔

تفاسیر قرآن پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

ويظهر ان تفسير القران كان في كل عصر من العصور متأثرا بالحركة العلمية فيه وصورة منعكسة لما في العصر من آراء ونظريات علمية ومذاهب دينية من ابن عباس الى الاستاذ الشيخ محمد عبده حتى لنستطيع اذا جمعت التفاسير التي الفت في عصر من العصور ان تتبين فيها مقدار الحركة العلمية واي الآراء كان سائدا شائعا وايها غير ذلك (ص ۲۵۳)	ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تفسیر قرآن ہر زمانہ میں اس زمانہ کی علمی تحریک اور علمی رفتار سے متأثر تھی اور اس زمانہ کے خیالات و علمی نظریات دینی اختلافات کی عکسی تصویر تھی اور یہ بات ابن عباسؓ سے لیکر شیخ محمد عبدہ کے دور تک معلوم ہوتی ہے۔ اگر تم کسی ایک زمانہ کی فن تفسیر میں تالیفات جمع کر کے دیکھو تو تمکو ان سے علمی تحریک کے درجہ کا علم ہو سکتا ہے اور تم یہ معلوم کر سکتے ہو کہ اس زمانہ میں کس رائے کا غلبہ اور چرچا تھا اور کس کا نہیں تھا۔

تشریع (فقہ و قانون) کے ضمن میں اسلامی قانون کی بنیاد و ماخذ کے متعلق لکھتا ہے

ومن ذلك يتبين ان اساس القانون الاسلامي الهي مصدره الله فيما نص عليه من كتاب وحديث	اس سے واضح ہو جائیگا کہ اسلامی قانون کی بنیاد الٰہی ہے اور اس کا ماخذ اللہ تعالیٰ کے احکام ہیں جو قرآن و حدیث میں

لیست لامۃ سُلطۃٍ حقٌّ فی مخالفتھا والخروج علیھا او ردٍ فی نصوصھا (ص۲۰) — مخزنا ہیں، کسی حکومت کو انکی مخالفت اور ان کے خلاف بغاوت کا حق نہیں۔

بیسویں صدی کے ترقی یافتہ مصر کے ایک روشن خیال فاضل کا یہ اعلان حق اور جرأت قابل قدر اور قابل داد ہے۔

ساتویں باب میں دینی مذاہب فرق پر بحث ہو، اسمیں خوارج، شیعہ، مرجئہ، قدریہ اور معتزلہ پر الگ الگ فصلیں ہیں۔

کتاب متوسط سائز کے ۱۲۴ صفحوں پر مشتمل ہے، آخر میں اہم واقعات، حوادث، اشخاص، مقامات، قبائل اور مذاہب فرق کا انڈکس ہے۔

اسلامی ممالک کے تعلیمی حالات

آمد و رفت کی سہولتوں اور خبر رسانی کی آسانیوں نے زمین کی طنابیں کھینچ دی ہیں سارا کرۂ ارض ایک شہر اور مختلف ممالک اس کے محلے بن گئے ہیں لیکن مسلمانوں کا شیرازۂ وحدت کچھ اس طرح منتشر ہوا اور ان کے روابط باہمی کچھ ایسے شکستہ ہیں کہ بیسویں صدی کی برق رفتاری بھی ان کے کو فاصلہ کم نہ کر سکی۔ ان حالات میں دور دراز کی اسلامی آبادیوں کے متعلق جو واقفیت بھی حاصل ہو سکے غنیمت ہے Statesman's year book میں ممالک عالم کے سلسلہ میں اسلامی ممالک کا بھی مختصر تذکرہ ہوتا ہے تازہ ایڈیشن سے ہم مراکش و الجزائر کے تعلیمی حالات شائع کر رہے ہیں آیندہ اشاعتوں میں انشاء اللہ دوسرے ممالک کے حالات شائع ہوں گے۔

عبد السلام قدوائی

مراکش

ملک کی تعلیمی حالت بہت زیادہ اچھی نہیں ہے۔ اصلی آبادی کا بڑا حصہ ناخواندہ ہے۔ تعلیمی جدوجہد کی رفتار یہ ہے کہ بہت سے ابتدائی قرآنی تعلیم کے چھوٹے چھوٹے مدرسے ہیں، جا بجا کچھ اُن سے بلند تعلیمی مدرسے ہیں۔ یہ مدرسے مسجدوں میں ہیں اس سلسلے میں فاس میں ایک عظیم الشان یونیورسٹی ہے، جو جامعۂ قرویین کے نام سے اسلامی دنیا میں بہت ہی مشہور و معروف ہے[1]۔ فرانسیسی حصہ میں یوروپین طرز کے اسکول ہیں جنہیں فرانسیسی زبان میں تعلیم دیجاتی ہے

---

[1] جامع قرویین کی بنا پہلی رمضان ۲۴۵ھ کو پڑی، اس زمانہ میں مغرب اقصیٰ میں ادریسیوں کی حکومت قائم تھی اور یحییٰ ابن محمد ابن ادریس فرمانروا تھے، عمارت کے تمام مصارف فاس کی مشہور مخیر اور دیندار خاتون فاطمہ بنت محمد الفہری نے ادا کئے۔ تعمیر میں اتنی احتیاط برتی گئی کہ ذرا سی بھی مشتبہ رقم یا کوئی دوسری مشتبہ چیز اسمیں صرف نہیں ہوئی، مورخین کا بیان ہے کہ فاطمہ موصوفہ کی شدت دینداری کا یہ حال تھا کہ شروع سے اختتام تعمیر تک برابر روزے رکھتی رہیں اور جب عمارت مکمل ہو گئی تو شکرانہ کی نماز پڑھی ادریسیوں کے بعد دولت زناتہ کے عہد میں اس عمارت میں کافی اضافہ ہوا، پھر اندلس کے مشہور فرمانروا عبد الرحمٰن الناصر کے عہد میں مزید توسیع ہوئی (۳۴۴ھ) اسکے بعد مختلف اوقات میں اور ترقیاں ہوتی رہیں یہاں تک کہ جامع قرویین اور اسکی درسگاہ نے عالم اسلامی میں غیر معمولی اہمیت حاصل کر لی۔ (الاستقصاء)

اب نہ اندلس کی اسلامی حکومت کا نشان باقی ہے، نہ مغرب اقصیٰ کا وہ سابقہ جاہ و جلال ہے لیکن جامع قرویین (دیکھو ص ۳۴)

۱۹۳۰ء میں یورپین لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے ۱۸۲ پرائمری اسکول تھے جنہیں ۱۴۸۰۲ لڑکے اور ۱۳۸۵۴ لڑکیاں زیر تعلیم تھیں۔ ان مدرسوں میں ۱۰ ایسے مدرسے تھے جہاں کنڈرگارڈن کے اصول پر تعلیم ہوتی ہے۔ ۲۰ پرائیوٹ پرائمری اسکول ہیں جنہیں ۴۸۴۵ بچے تعلیم پاتے ہیں۔ ۱۶ سکنڈری اسکول ہیں جہاں ۵۶۸۵ لڑکے اور ۳۹۵۷ لڑکیاں زیر تعلیم ہیں۔ کزبلنکا میں ایک صنعتی اور تجارتی اسکول ہے رباط میں [illegible] نام کی ایک مشہور تعلیم گاہ ہے جہاں ۶۵۰ طالب علم عربی پڑھتے ہیں ۵۰ بربری زبان سیکھتے ہیں، ۲۵۰ طالب علم شعبۂ قانون سے متعلق ہیں۔ رباط کے مردانہ اور زنانہ ہائی اسکولوں میں ٹریننگ کے بھی شعبے ہیں۔

مسلمانوں کے لئے خاص تعلیم کی صورت یہ ہے کہ فرانسیسی حصہ میں لڑکوں کے لئے ۸۰ پرائمری اسکول ۱۶ ٹکنیکل اسکول ۴ کالج ۱۹۳۰ء میں تھے جنہیں ۱۴۹۸۲ طلبا زیر تعلیم تھے۔ ان کے علاوہ ۱۱۸ اسکول لڑکیوں کے لئے تھے جنہیں ۳،۰۰۰ طالبات زیر تعلیم ہیں۔ یہودیوں کے لئے ۲۰ اسکول ہیں جنہیں ۹۰۸۷ لڑکے اور ۸۵۲۵ لڑکیاں پڑھتی ہیں۔ ریسرچ کا کام رباط کے سائنٹفک انسٹیوٹ میں ہوتا ہے۔

ہسپانیہ حصہ میں بھی خاص خاص شہروں میں ایسے اسکول ہیں جہاں ملکی باشندوں کو ہسپانیہ اور عربی تعلیم دیجاتی ہے۔ طیطوان میں ایک صنعتی اسکول بھی قائم ہے الصمعان میں ایک وہابی کا مدرسہ ہے۔ طیطوان میں یہودیوں کی اپنی درسگاہیں بھی ہیں۔

کے حصہ میں مسلمانوں کی تعلیم صرف ابتدائی قرآنی مدارس تک محدود ہے۔ البتہ فرنچ انتداب اور حکومت اسپین کی جانب سے چند ابتدائی اسکول ہیں اسکے علاوہ ایک فرنچ ٹکنیکل اسکول بھی ہے۔ البتہ یہودیوں نے متعدد ابتدائی اور قانونی (…) اور اسکی درسگاہ کو اسلامی ممالک میں اب بھی خاصی اہمیت حاصل ہے۔ اسوقت یہاں تقریباً … طالب العلم اور ڈیڑھ سو اساتذہ مصروف درس و تدریس ہیں۔ اس درسگاہ سے صرف مراکش کے باشندے ہی مستفید نہیں ہوتے بلکہ الجزائر تونس سوڈان وغیرہ تقریباً سارے شمالی افریقہ سے طالب العلم یہاں آتے ہیں اور یہاں کی تعلیم و تربیت سے فائدہ حاصل کرتے ہیں۔

جامع قرویین کے علاوہ جامع اندلسین میں بھی درس و تدریس کا سلسلہ ہے مگر اس سے چھوٹے پیمانے پر۔ ان درسگاہوں کے علاوہ اور بہت سے مقامات پر دینی تعلیم ہوتی ہے لیکن باضابطہ مرکزی اور مشہور درسگاہیں تقریباً معدوم ہیں۔

مدرسے قائم کر رکھے ہیں۔ یورومین بچوں کے لئے بھی فرنچ اور اسپینی گورنمنٹ نے کچھ ابتدائی اور ثانوی مدرسے قائم کر رکھے ہیں انہیں سے بعض میں مراکش کے اصلی باشندوں کو بھی داخلہ کی اجازت ہوتی ہو۔ طنجہ ایک اٹالین اسکول ہے جسمیں ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا انتظام ہو اس مدرسیں بھی یوروپین طلبار کے ساتھ دیسی باشندوں کو بھی داخلہ کی اجازت ہے۔

(۲)

الجزائر

الجزائر خاص میں ایک یونیورسٹی ہو جسمیں ۳۱ جولائی ۱۹۱۳ء میں ۲۲۰۸ طالبعلم زیر تعلیم تھے جنمیں سے ۱۰۲۳ شعبہ قانون میں پڑھتے تھے۔ ۴۰۰ طب اور دواسازی سے تعلق رکھتے تھے ۱۲۲ سائنس حاصل کرتے تھے اور ۲۴۴ شعبہ آرٹ سے تعلق رکھتے تھے اس یونیورسٹی کے علاوہ یہاں تجارتی فائن آرٹس ہائیڈروگرافی اور زراعت کیلئے مخصوص مدارس ہیں ان مدرسوں کے علاوہ ۱۹۱۳ء میں ۳۲ مسلم اسکول تھے جنمیں ۱۹۱۰ طلبا زیر تعلیم تھے ان مدرسوں کے علاوہ مسلمانوں کی ثانوی درسگاہیں بھی الجزائر خاص طلسان اور قسطنطنیہ میں ہیں انمیں ۱۷۰ طالبعلم پڑھتے تھے جنمیں ۱۵۲ عرب اور ۱۸ دوسرے تھے۔ ثانوی تعلیم کے ۱۱ سرکاری اسکول ہیں جنمیں ۳۰۰۲ طالبعلم پڑھتے ہیں ان طالبعلموں میں ۲۲۸۰ فرانسیسی ۸۰۱ وطنی اور ۷۰ غیر ملکی ہیں۔ ۶۰ ادارے لڑکیوں کی تعلیم کیلئے ہیں جہاں ۳۵۰۰ طالبات پڑھتی ہیں جنمیں ۳۰۲۱ فرانسیسی اور ۹۹ دیسی اور ۵۴ غیر ملکی ہیں۔ ۱۸ نزدادنچے قسم کے پرائمری اسکول ہیں جنمیں ۵۳۹۱ لڑکے زیر تعلیم ہیں ۱۱ مدرسے بچیوں کے ہیں جنمیں ۲۲۱۳ طالبات زیر تعلیم ہیں، معمولی قسم کے پرائمری اسکول سرکاری اور نجی سب ملاکر ۱۲۱۰ ہیں جہاں ۱۵۰۳۴ طالبعلم ہیں جنمیں ۸۲۴۶۱ لڑکے اور ۶۷۵۰۲ لڑکیاں ہیں۔ ۱۲۶ اطفال کے مدرسے ہیں جنمیں ۱۱۳۵۲ بچے اور ۲۲۴ بچیاں پڑھتی ہیں۔ ۳ نارمل اسکول ہیں جسمیں ۳۰ پروفیسر اور ۲۴۳ طالبعلم ہیں۔ عورتوں کے بھی تین نارمل اسکول ہیں جنمیں ۴۶ پروفیسر اور ۱۰۳ طالبات ہیں۔

حالات ندوہ

حسب معمول ۵ شوال کو دارالعلوم کھلا، لیکن اب کی معمول سے کہیں زیادہ سرگرمی نظر آرہی ہے، اور ہر طرف زندگی اور زندہ دلی کے آثار نمایاں ہیں، مولانا سید سلیمان صاحب ندوی کے تعلق و قیام سے بیداری کی ایک خاص لہر پیدا ہو گئی ہے، دلوں میں تمناؤں کی آبادی اور سینوں میں عزائم کا ہجوم ہے، فکر و نیاں کی شمعیں جلنے لگی ہیں اور عزم و حوصلہ کے مدہم نقوش اجاگر ہو رہے ہیں، سوئی ہوئی طبیعتیں جاگ رہی ہیں، بجھے ہوئے دل پھر ولولوں سے معمور ہیں، ہمتوں کی پستی اور مزاجوں کی گسلمندی دور ہو رہی ہے، ذہنوں میں ایک نئی تازگی دماغوں میں ایک خاص تابندگی اور روحوں میں ایک عجیب بالیدگی ہے، غرضکہ مولانا کی جاذب شخصیت دارالعلوم کے چپہ چپہ کو متاثر کر رہی ہے اور دماں کی انقلاب آفرین ذات یہاں ایک نئے زمین و آسمان کی تشکیل میں مصروف ہے۔

سال نو کے آغاز کے ساتھ ہی نتائج امتحان بھی شائع ہوئے ہیں جنکا نتیجہ ابکی بھی یہی ہوا۔ اس سال ۱۴۴ طلبا شریک امتحان تھے جنمیں ۹۱ کامیاب ہوئے۔ ۲۲ طالبعلموں کو ترقی ملی فیصدی تناسب حسب ذیل ہے

کامیاب	۶۳،۲
ترقی	۱۵،۳
ناکام	۲۱،۵

نتائج کے ساتھ جناب معتمد صاحب تعلیم نے ایک پر اثر تقریر فرمائی جسمیں آپنے عربی تعلیم کی ضرورت اسکی اہمیت، زمانہ کے جدید رجحانات اور عصر حاضر کے انقلاب آفرین خیالات کا ذکر کیا اور اس نازک دور میں علماء کے گوناگوں فرائض اور ان کی اہم ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلائی اور بتایا کہ دنیا کے اس تلاطم میں امت کے سفینہ کی ناخدائی کسقدر دشوار ہے۔ اُمید ہے کہ آپ کی یہ تقریر طلبا کے لئے آیندہ زندگی میں دلیل راہ کا کام دیگی۔

نومبر کو طلبا کی انجمن الاصلاح کا بھی افتتاح ہو گیا اور نئے ناظم صاحب نے چارج لے لیا۔ اسال

حسب ذیل عہدہ دار منتخب ہوئے ہیں۔

صدر	محمد داؤد خاں	(اڑیسہ)
ناظم	محمد اقبال	(اودھ)
نائب ناظم	محمد ابراہیم	(حیدرآباد)
معتمد مال	عبدالستار ملتانی	(پنجاب)
معتمد صحافت	محمد اسحٰق	(سرحد)
معتمد خطابت	صادق اشرف	(بہار)
معتمد دارالکتب	عبدالحلیم	(یوپی)
محاسب	محمد الیاس	(پنجاب)
معتمد نیم ادب	نذیر علی	(اودھ)
معتمد دارالاخبار	محمد یوسف	(یوپی)

دسمبر کو انجمن نیم ادب کے زیر اہتمام ایک مجلس شعر و سخن برپا ہوئی جس میں حضرت حسب گرادآبادی روش صدیقی زاہر حرم حمید صدیقی نے اپنا منتخب کلام سنایا۔ اس تقریب میں دارالعلوم کے متعلقین کے علاوہ باہر کے دوسرے شائقین سخن بھی شریک تھے۔

عربی ادب دارالعلوم کا خاص اور امتیازی وصف ہو۔ عربی زبان چونکہ یہاں ایک زندہ زبان کی طرح سکھائی جاتی ہو اسلئے کتابی استعداد کے ساتھ لکھنے اور بولنے کی بھی کافی مشق کرائی جاتی ہو۔ اس غرض کیلئے دارالاقامہ اور درجوں کی روز مرہ مشق کے علاوہ ہفتہ وار خطابت کے جلسے بھی منعقد ہوتے ہیں جنمیں طلباء عربی میں تقریریں کرتے ہیں۔ اس موقع پر انکی رہنمائی کے لئے اساتذہ بھی موجود رہتے ہیں۔

امسال اس سوق عکاظ کا انتظام اصحاب ذیل کے سپرد ہے۔

ناظر اعلیٰ — شیخ محمد العربی المراکشی استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء،

صدر — عبدالرشید

ناظم — علی احمد

امسال دار العلوم کے اساتذہ میں مولانا شاہ حلیم عطا اور مولانا احمد الحسنی صاحب کا اضافہ ہوا ہے۔ شاہ حلیم عطا صاحب سلون ضلع رائے بریلی کے ایک مشہور خانوادۂ علم و تصوف سے تعلق رکھتے ہیں تفسیر، حدیث، تصوف اور ادب عربی میں خاص مہارت ہے، اللہ تعالیٰ نے ذہن و حافظہ سے حصۂ وافر عطا فرمایا ہے۔

مولانا احمد الحسنی حضرت سید احمد صاحب شہید رحمۃ اللہ تعالیٰ کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں آپ بہت ہی ذہین، مستعد اور صالح نوجوان ہیں، عربی ادب سے خاص مناسبت ہے اور شیخ تقی الدین الہلالی سے تلمذ کی نسبت ہے۔

۱۲ دسمبر کو مولانا محمد عمران خاں ندوی اور مولانا سعد الدین انصاری ندوی مصر سے واپس آگئے۔ ان دونوں نے جامع ازہر سے خادم القرآن اور علوم الحدیث میں سلسلۂ تبلیغ و ارشاد تخصص (ڈاکٹریٹ) کی اول درجے کی سند حاصل کی۔ آپ سے پہلے کسی ہندستانی کو یہ شرف حاصل نہیں ہوسکا جناب ڈاکٹر عبدالعلی صاحب ظلہٗ ناظم ندوۃ العلماء کے ہمراہ اساتذہ اور طلباء دار العلوم نے اسٹیشن پر انکا پر جوش استقبال کیا۔

دو تین دن دار العلوم میں بڑی چہل پہل رہی طلباء، اساتذہ اور طلباء قدیم کی طرف سے مختلف دعوتوں کے علاوہ ۱۰ دسمبر کو جناب ڈاکٹر عبدالعلی صاحب ظلہٗ ناظم ندوۃ العلماء اور جناب مولانا سید سلیمان صاحب ندوی ظلہٗ معتمد دار العلوم کی طرف سے ایک شاندار عصرانہ ہوا جسمیں شہر کے تمام معززین مدعو کئے گئے۔ اس موقع پر سوق عکاظ کی طرف سے عربی میں سپاسنامہ پیش کیا گیا جس کے جواب میں مولانا عمران خاں صاحب نے بڑی ہی سلاست و روانی اور طلاقت و خوش بیانی کے ساتھ عربی میں مصر و مصریات سے متعلق ایک پُر اثر تقریر کی، اور مولوی سعد الدین صاحب نے حاضرین کی درخواست سے اردو میں تقریر کی اور مصر کی علمی و اخلاقی حالت پر تبصرہ کیا۔

آخر میں جناب مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ نے معزز مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور انھیں
ندوہ کے حالات اور اس کی ضروریات کی طرف توجہ دلائی۔

ندوہ کی ان تقریبات کے بعد عمران صاحب اپنے اعزہ کی زیارت و ملاقات کی غرض سے
بھوپال تشریف لے گئے جہاں غالباً اواخر جنوری تک قیام رہے گا۔ اسکے بعد انشاءاللہ وہ لکھنؤ واپس
آئیں گے اور دارالعلوم کی خدمات میں مصروف ہو جائیں گے۔ مصر کے قیام، ازہر کے علمی فیوض و برکات
اور ممالک اسلامیہ کی سیاحت کے بعد اُمید ہے کہ موصوف کا دارالعلوم میں قیام بہت زیادہ مفید ہوگا۔

مجلس ندوۃ العلماء کا ماہوار رسالہ

الندوہ

جس کا مقصد

مسلمانوں کی تعلیمی اور تعمیری خدمت ہے

مرتبہ

سید ابوالحسن علی ندوی

استاذ تفسیر و ادب

عبدالسلام قدوائی

استاذ تاریخ و اقتصادیات

النّدوہ

زیرِ نگرانی

علامہ سید سلیمان ندوی ظلہٗ

جلد ۱ — محرم الحرام ۱۳۵۹ھ مطابق فروری ۱۹۴۰ء — نمبر ۲

بہ سبب قلت گنجائش انجمن طلبائے قدیم کا مضمون شریک اشاعت نہ ہو سکا۔

قیمت سالانہ دو روپیہ — فی پرچہ تین آنہ

خط و کتابت اور ترسیل زر حامد علی ندوی منیجر رسالۂ "النّدوہ" بادشاہ باغ لکھنؤ کے پتہ پر ہونی چاہیے

الندوہ کا انتظار

سیدی وعلامی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

"معارف" میں "الندوہ" کے اجرا کی مسرت انگیز خبر پڑھکر میں نے فی الفور نیجر صاحب کی خدمت میں درخواست خریداری بھیجدی تھی۔ خیال تھا کہ ۱۹۴۱ء کے اوائل میں سالہ مذکورہ افق صحافت سے طلوع ہوکر بچے کھچے خریداران الندوہ قدیمہ کی مسرت معلومات میں افزائش کا باعث ہوگا اور "معارف" جن مضامین کو اپنے وسیع دامن میں بھی سمیٹنے سے قاصر رہتا ہو اس "الندوہ" میں پھر اسی علوم اسلامیہ کے احیا تطبیق معقول ومنقول، علوم قدیمہ جدیدہ کے موازنہ کی بحث چھڑ جائیگی جس کا آغاز ۱۳۲۲ھ میں ہوا تھا۔ لیکن اب تو اسکے اغراض اجرا کو اور بھی بلند کردیا گیا ہے یعنی عربی تعلیم (جو خاص توجہ کے قابل ہو) اسلامی علوم ومقاصد ندوۃ العلماء کی اشاعت اور اسلامی علوم ومسائل کی تحقیق وتشریح اور دین وملت کی خدمت؛ اس کے خاص عنوانات وموضوعات ہوں گے۔

غالباً شملہ میں یا شاید ۲۳ء میں دہلی میں میں نے معروض خدمت گرامی کیا تھا کہ الندوہ کے طرز عمل پر ایک سالہ ضرور نکلنا چاہئے جو وقتاً فوقتاً خالص اسلامی موضوعات پر سیر حاصل مباحث کیلئے وقف ہو، آپنے جواباً فرمایا تھا کہ اگر آئندہ معارف ان مقاصد کی تکمیل نہ کرسکا تو انشاء اللہ ایک دوسرا رسالہ ان اغراض کی تتمیم کے لئے نکالا جائے گا۔ اس بات کو عرصہ گذر چکا اس اثنا میں بہت سے بہی خواہ ندوہ داعی اجل کو لبیک کہگئے۔ رحمہم اللہ علیہم اجمعین۔ تب کہیں آن کر میرا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

اب کہ آپ کو خدائے علیم وبصیر نے حضرت علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی بجا جانشینی کا زریں موقع بہم پہونچایا ہے اور آپ نے قصد صمیم بھی فرمالیا ہے کہ اس کا اجرا عمل میں آجا رہا ہے، پس اس خیال کو جامۂ عمل پہنانے پر نہ صرف ندوہ کے مقاصد حیات کا احیا ہوگا بلکہ آپ کی نگرانی میں علوم اسلامیہ کی نشر واشاعت کا بھی ذریعہ ہوگا، اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ آپ کی قیمتی زندگی کا ایک ایک لمحہ اسلام کی سربلندی اور احیاء علوم اسلامیہ کے لئے وقف ہے اس اجمال کی تشریح یہ ہے کہ دار المصنفین جو اہتم بالشان خدمات سرانجام دے رہا ہے وہ ہندوستان کیا ممالک اسلامیہ کی علمی مجالس کو بھی بہت کم میسر ہے (شبلی) و سلیمان دام عمرہ کے لئے بار بار دل سے دعائیں نکلتی ہیں،

ندوہ کا آوازہ حالات زمانہ سے یا یوں کہئے کہ مرور ایام سے دب ہی چکا تھا، اب پھر

---

۱ - بجا جانشینی کا بھی ایک واقعہ خود علامہ شبلیؒ کی زبانی سن لیجئے جبکہ، وقت علامہ مرحوم اور نیشنل کانفرنس میں شرکت کی غرض سے تشریف لائے تھے تو موصوف کو کھنی کوٹھی کیمپ میں (جو اب محبّ صادق شیخ ریاض الدین صاحب خلف الرشید شیخ شہاب الدین مرحوم کی ملکیت ہے) اور جہاں پہونچکر پھر سے تمام زخم تازہ ہو جاتے ہیں، کرنل عبدالمجید پٹیالوی مرحوم کے یہاں ٹھہرے ہوئے قیام دیا تھے۔ میں اکثر حاضری دیا کرتا تھا اور مرحوم مجھ پر خاص شفقت کا اظہار فرماتے تھے حتیٰ کہ ندوہ میں جانے اور تصنیف و تالیف کا سلیقہ سیکھنے کے واسطے قیام لکھنؤ پر مجھ سے شدید اصرار فرماتے کیونکہ میں ان دنوں پیسہ اخبار میں کچھ لکھا کرتا تھا اور وہ مرحوم و مغفور کی نظر سے گذرا کرتا تھا یہ وہ زمانہ تھا جب لیڈر محمد علی انگلینڈ سے واپس ہوئے تھے اور پیسہ اخبار ہی میں طبع آزمائی فرماتے تھے اور حضرت ابوالکلام آزاد الندوہ کے ایڈیٹر تھے، الحاصل علامہ شبلی کی وسعت خلاق غریب خانہ کو وقتاً فوقتاً شرف آمدورفت سے میمنت لزوم کر دیا کرتی تھی مجھکو خوب یاد ہے جبکہ آغا صاحب مراد آبادی بھی غریب خانہ پر تشریف فرما تھے حضرت علامہ مرحوم نے ایک شب صحبت میں اس قدر دلچسپ علمی و ادبی رموز و نکات کے دریا بہائے کہ آدھی شب بیت گئی، بارہ بجے تو فرمانے لگے گھڑی کیا کہتی ہے میں نے باادب عرض کیا کہ امیر خسروؒ کے تخیل میں نہیں بلکہ میرے خیال ناقص میں آنجناب کے حکیمانہ اور ادب نواز اقادیل کی داد شبی دے رہی ہے، چونکہ پٹھے پٹھے چوبیں کو بے تکلفی سے جوڑا اور بادل ناخواستہ قیام گاہ کی جانب مراجعت فرما ہونے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے میں رکشا کے ساتھ ساتھ اس پیکر علوم و مجسمۂ اخلاق کی اگر دواہ کی طرح چلا جا رہا تھا کہ راہ میں بھی اپنی ہمکلامی سے نوازتے رہے، اسی اثنا میں مجھ کو بہت کو ندوہ میں آنے پر پھر تاکید فرمائی - مولانا ابوالکلام کا ذکر خیر بھی ہوا، بالآخر میرٹھ بنک کی عمارت کے نزدیک باتوں باتوں میں ایک آہ سرد بھری اور فرمایا کہ ؂

کچھ کرو نوجوانو اٹھتی جوانیاں ہیں

کچھ بلند ہونے لگا ہے، وقت سحر قریب ہے، مرغان سحر کی بانگیں کانوں میں پڑنے لگی ہیں
انشاء اللہ پھر وہی گل اور وہی تیر ابستان ہم دیکھا کا نظارہ ہوگا، علاوہ بریں ندوہ سے
جو طلباء دستار فضیلت زیب فرق کرکے اب نکل رہے ہیں وہ اکثر بیشتر ادینحول میں گم ہوجاتے ہیں
تحقیقی مضامین نویسی جو ندوہ کے متعلمین اور فارغ التحصیل طلباء کی امتیازی خصوصیت تھی، اور جو تصنیف
و تالیف مستقلہ کا پیش خیمہ تھی، فقدان الندوہ سے ندوہ کے طلباء کے لئے کچھ شجر ممنوعہ کی سی حالت اختیار
کرچکی ہے، دار المصنفین میں گنتی کے ندوی ملتے ہیں جو تصنیف و تالیف کے بہترین شغلہ میں مصروف ہیں
ورنہ اکثر باہر کے حضرات ہی مصروف کار ہیں۔

پھر کیا اس حالت میں بھی الندوہ کے اجراء میں مزید عوائق در پیش ہیں؟ علمی رسائل کا اجراء
تو آپ کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ خدارا جلد انتظام فرمایئے اور ندوہ کی گرتی عمارت کو تھام لینے
کے لئے الندوہ کا ریختہ بعجلت تمام استعمال کیجئے۔

ٹھنڈی سانس لیتے اور فرماتے جاتے تھے کہ مسلمانوں میں جو صاحب کمال اٹھا اس کا کوئی جانشین نہ اٹھا۔ سرسید، نذیر احمد
ذکا اللہ دہلوی وغیرہم کے نام لیتے اور آہ سرد بھرتے تھے، میں نے عرض کیا کہ آپ اس درجہ متاسف کیوں ہیں؟ ہمیں خدا
کا شکر کرنا چاہیے کہ آپ کی جانشینی کے لئے ایک شخص پیدا ہوچکا ہے فرمانے لگے کون؟ میں نے عرض کیا کہ "سید سلیمان"
پھڑک اٹھے، اور بمسرت فرمایا کہ بالکل درست بالکل بجا، الغرض ساری کاہیدگی بالیدگی سے بدل گئی۔ ہائے
افسوس وہ کیا وقت تھا، خدا غریق رحمت فرمائے میرے روحانی و علمی پیشوا بلکہ استاذ اعظم کو جن کی چند مختصر صحبتوں
نے وہ لگن لگا دی جن کے سامنے سالہا سال کی تدریس کا وثیں بھی گرد ہیں ؎

آں دل کہ رم نمودے از خوبروجواناں دیرینہ سال پیرے بردش بیک نگاہے

وہ چیز کیا تھی جو اب علامہ مرحوم کی یاد میں خون کے آنسو رلاتی ہے، وہ مرحوم کی مخلصانہ محبت تھی ؎

درس وفا اگر بود زمزمہ محبتے جمعہ بمکتب آورد طفل گریز پاے را

اب وہ پاک اور خالص علمی صحبتیں یاد آتی ہیں اور صبر و سکون کو اچک لیجاتی ہیں۔ للہ در من قال

خاب اعمال حیاتی بفراق السلمیٰ
ذاب لحمی و دمی لیت وجودی عدمی

"نقوش سلیمانی" دہلی سے منگوا کر "حرز جان" کر چکا ہوں "قلب مضطر" کو بہت تسکین ہوئی، اب فرمایئے حیات شبلی یعنی اسلامی محقق، مورخ، حکیم، مصنف، ادیب و شاعر اور سب سے بڑھ کر شیدائی اسلام کی سوانحعمری سے کب تک حیات بخشی ہو گی؟ والسلام

محمد عمر نعمانی

نور اللغات

(مرتبہ مولوی نور الحسن صاحب نیر بی اے، ایل ایل بی)

ہماری اردو زبان کی ترقی کے ساتھ ساتھ ایک مفصل اور مستند لغت کی ضرورت شدت محسوس کی جا رہی تھی شکر ہے کہ ملک کے نامور ادیبوں نے اس طرف توجہ کی امیر الشعراء حضرت امیر مینائی کے حضرت سید احمد دہلوی نے فرہنگ آصفیہ کے نام سے کئی جلدوں میں ایک مفصل لغت لکھا اس کے ایک عرصہ کے بعد حضرت نیر کاکوروی نے برسوں کی تلاش و تحقیق کے بعد ایک نہایت ضخیم لغت تیار کیا ہے جو چار حصوں پر مشتمل ہے اس میں اردو زبان کے ایک ایک حرف کے متعلق بہت خوبی اور خوش اسلوبی سے داد تحقیق دی گئی ہے تعجب ہوتا ہے کہ اتنا بڑا کام ایسے اچھے پیمانہ پر ایک فرد واحد کیسے انجام پا گیا بعض بعض جگہ ایک لفظ کی تشریح و تحقیق میں کئی کئی صفحے بھرے ہوئے ہیں، طرز بیان بہت سادہ لیکن عالمانہ اختیار کیا ہے غرض لغت کے سلسلہ میں ابتک یہ آخری اور مستند کوشش ہے اور حامیان اردو کی قدر دانی کی مستحق۔

دو رائیں

اردو زبان کی لغات میں نور اللغات اپنی طرز کی تنہا لغت ہے جو بالکل جدید اصول پر مرتب کی گئی ہے اور الفاظ کے ذخیرے کے لحاظ سے بھی غالباً تمام دوسرے لغت سے افضل ہے مرتب نے اسے بے حد محنت و جانفشانی کے بعد مکمل کیا ہے اس لغت کی اشاعت سے اردو زبان کی کتابوں میں ایک قابل قدر اضافہ ہوا ہے امید ہے کہ اہل علم و قدر دان اہل زبان اس کی قدر کما حقہ کریں گے اور مرتب کی محنت کی داد دیں گے۔

"زمانہ"

اردو کے تمام مروجہ الفاظ، محاورات، ضرب الامثال ذیل کلمات کا پورا استقصا کیا گیا ہے اور شعراء و اساتذہ کے کلام نظم و نثر سے ہر جگہ استناد کیا گیا ہے دیباچہ میں متروک الاستعمال سے بھی دلچسپ بحث کی گئی ہے اور قواعد کے لحاظ سے الفاظ کی فصاحت پر جتنا زور دیا گیا ہے متعدد مثالوں سے سمجھایا گیا ہے۔

"نگار"

نور اللغات حصہ اول الف، ب صفحات ۴۴۲، قیمت للعہ، حصہ دوم پ سے خ صفحات ۵۱۴ للعہ، حصہ سوم د سے ق صفحات ۶۹۲ للعہ، چہارم ک سے ی صفحات ۱۰۴۲ للعہ۔ ملنے کا پتہ:- صدر دفتر مکتبہ جامعہ نئی دہلی

مقامی شاخ:- مکتبہ جامعہ امین آباد لکھنؤ

شذرات

خوشی کی بات ہے کہ لوگوں کی توجہ نئے سرے ندوہ کی طرف منعطف ہورہی ہے، مختلف صوبوں میں ہمارے احباب ہماری امداد کے لئے ہاتھ بڑھا رہے ہیں، پشاور میں حکیم عبدالعزیز اور حکیم عبدالجلیل صاحب، لاہور میں مولوی محمد حنیف صاحب، کلکتہ میں مولوی عبدالرحمن صاحب کانپوری اور پٹنہ میں مولوی مسعود عالم صاحب معین الندوہ کے دائرہ کی توسیع میں مصروف ہیں۔

دارالعلوم ندوہ اودھ میں واقع ہے، اس لئے دارالعلوم کا سب سے بڑا حق اودھ پر ہے لیکن ابھی تک اودھ کے مسلمانوں کو اس کی اعانت و امداد کی طرف متوجہ نہیں کیا گیا، اب معین الندوہ کی توسیع کے سلسلہ میں اودھ میں کام شروع کیا گیا تو بارہ بنکی میں شیخ عبدالعلی صاحب قدوائی، مولوی شاہ مصطفےٰ صاحب اور جناب عبدالسلام خاں صاحب نے ہر طرح کی امداد کا وعدہ کیا، اور تقریباً سو روپیہ سالانہ کا انتظام ہوا، اسی طرح ردولی میں مولوی شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی کی تحریک سے ایک وظیفہ کا انتظام ہوا۔

اودھ کسی زمانہ میں علم و ہنر کا مرکز اور دولت و ثروت کا گہوارہ تھا گو اب اس کی وہ حیثیت نہیں پھر بھی وہاں کے مسلمانوں میں اتنی فیاضی اب بھی موجود ہے کہ اگر ایک صاحب بھی ہمت کریں تو پانچ سو سالانہ کا انتظام وہاں سے نہایت آسانی سے ممکن ہے۔

ہندوستان کے باہر جزائر ہند میں جو ندوہ کے فارغ التحصیل علماء ہیں اُن میں بعض بحمد اللہ علمی و دینی مشاغل میں مصروف ہیں مولوی عدنان صاحب ندوی سوماٹرہ میں سیرت کی کتابوں کا ترجمہ کر رہے تھے، ابھی مالدیپ سے مولوی محمد حسن الدیبی ندوی کا خط آیا ہے کہ وہ دار المصنفین کی خلفائے راشدین کا ترجمہ مالدیپی زبان میں کر رہے ہیں۔

سیال کوٹ سے جو کسی زمانہ میں پنجاب کا علمی مرکز تھا مولانا محمد علی صاحب کاندھلوی کا خط آیا جس سے معلوم ہوا کہ وہاں کے ایک مسلمان مخیر نے وہاں ایک عربی درسگاہ کے قیام کے لئے ایک لاکھ روپے دیے ہیں جس سے دار العلوم الشہابیہ کے نام سے ایک عربی مدرسہ قائم ہو رہا ہے بیس ہزار کی عمارت اور اسی ہزار کی جائداد اسکے لئے خریدی جا رہی ہے، اللہ تعالیٰ اس گمنام فیاض مسلمان کو جزائے خیر دے۔

خوشی اس کی ہے کہ اس مدرسہ کے نصاب تعلیم میں ضروریات زمانہ کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے، ابتدا میں اُردو فارسی اور پانچویں سے انگریزی کی تعلیم ہوگی تاریخ جغرافیہ اور ترجمہ قرآن کا بھی اہتمام ہوگا، کل مدت درس بالفعل سات برس رکھی گئی ہے۔

الندوہ نکلا تو اس کی امداد کی طرف جس کا ہاتھ پہلے بڑھا وہ وہی ہستی تھی جس کا ہاتھ اس قسم کے کاموں کی امداد میں ہمیشہ پہلے بڑھا کرتا ہے (نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی) موصوف کی خدمت میں ہمارا یہ رسالہ عین عید کے روز پہونچا اس لئے انھوں نے رسالہ کو

پچیس روپے کی عیدی عنایت فرمائی، خدا کرے کہ ایسی عیدیں ہر مہینہ آیا کریں۔

مولوی حافظ محمد عمران خان ندوی ازہری نے جو ابھی جامع ازہر مصر سے سند تخصص لیکر آئے ہیں باوجود دوسرے کامیاب مواقع کے سامنے ہونے کے دارالعلوم کی خدمت کو سب پر ترجیح دی اب وہ مدرسہ میں آ گئے ہیں علوم القرآن اور علوم الحدیث کی تدریس اور مدرسہ کے انتظام وانصرام کا کام ان کے سپرد کیا گیا ہے۔

عربی مدرسوں میں ابتدائی صرف نحو کی کتابیں عموماً فارسی میں پڑھائی جاتی ہیں، اب فارسی کی طرف روز بروز توجہ کم ہو رہی ہے اس لئے چھوٹے بچے اکثر اس سے کم مانوس ہوتے ہیں اس لئے فارسی کے ذریعہ سے ان کو عربی صرف نحو پڑھانے میں بڑی دقت ہوتی ہے، اردو میں جن لوگوں نے عربی صرف نحو پر کتابیں لکھی ہیں وہ بالغوں کو سامنے رکھ کر لکھی ہیں مختلف درجوں کے لحاظ سے تدریجی رسائل نہیں لکھے گئے دارالعلوم نے اس مشکل کو حل کرنے کے لئے ان ابتدائی صرف نحو کے فارسی رسالوں کا سلیس اردو میں بمذاق حال ترجمہ کر کے چھاپ دیا ہے، میزان جدید چھپ چکی ہے منشعب جدید اور نحو میر جدید زیر طبع ہے۔

ناظرین کی خدمت میں گذارش ہے کہ وہ اس رسالہ کے حلقہ اشاعت کے بڑھانے میں ہماری مدد فرمائیں تین سو خریداروں کے بغیر یہ رسالہ اپنی جگہ پر قائم نہیں رہ سکتا مضامین کا تنوع صفحات کی کمی کی سبب سے بہت کم ہے لیکن حالات کی مجبوری سے ابھی زیادہ پھیلاؤ ممکن نہیں ہے۔

نہایت درد و قلق کے ساتھ یہ خبر لکھی جاتی ہے کہ جناب مولانا فضل حق صاحب رامپوری مدرس اعلیٰ مدرسہ عالیہ رامپور نے اس مہینہ اسی برس کی عمر میں وفات پائی موصوف نے تقریباً پچاس برس تک علوم و فنون کی تدریس کی خدمت انجام دی مشرقی و اسلامی علوم قدیمہ اور معقولات کے ممتاز ترین فضلا اور اساتذہ میں سے تھے اور ہمارے زمانہ کے ان چند خوش نصیب علماء میں سے تھے جنھوں نے بڑی مدت تک اور وسعت کے ساتھ علوم و فنون کی خدمت کی، مشرقی تہذیب کا نمونہ، قدیم روایات کے حامل اور علمائے سلف کی یادگار تھے۔ آپ کی وفات سے ہماری قدیم بزم علم میں جو روز بروز سونی ہوتی جا رہی ہے جو جگہ خالی ہوئی ہے عام علمی زوال و انحطاط کے پیش نظر اس کا پُر ہونا بہت دشوار معلوم ہوتا ہے، وہ ندوۃ العلماء کے پرانے رکن تھے، اللہ تعالیٰ ان کو فردوس رحمت میں جگہ دے۔

ندوۃ العلما کی تاریخ کا پہلا صفحہ

از حضرت مولینا سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ

(۲)

ندوۃ العلماء کا پہلا اجلاس ۱۵، ۱۶، ۱۷، شوال ۱۳۱۱ھ مطابق ۲۲، ۲۳، ۲۴، اپریل ۱۸۹۴ء میں اسی کان پور میں اور اسی مدرسۂ فیض عام میں ہوا، پہلے دن ۱۵ شوال ۱۳۱۱ھ مطابق ۲۲ اپریل ۱۸۹۴ء کو صبح کے وقت مدرسہ کے چودہ فارغ التحصیل طالبعلموں کی دستاربندی کا جلسہ ہوا، حضرت مولانا لطف اللہ صاحب اس جلسہ کے صدر ہوئے، صدارت کی تحریک مولانا عبداللہ صاحب ناظم دینیات محمڈن کالج علیگڈھ (داماد مولانا محمد قاسم صاحب بانی مدرسہ دیوبند) اور تائید مولانا شاہ محمد حسین صاحب الہ آبادی نے فرمائی، مولوی بشیر الدین اڈیٹر نجم الاخبار اٹاوہ (جو ان دنوں سرسید کے مخالفوں میں تھے اور اب "البشیر" کے اڈیٹر ہیں) نے مدرسہ کی سالانہ کارروائی پڑھکر سنائی، اس کے بعد مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی نے سورۃ جمعہ کا وعظ اس خوبی سے کہا کہ حاضرین پر وجد طاری تھا۔

ندوۃ العلماء کا اجلاس اسی دن ۲ بجے سہپہر سے شروع ہوا، شمس العلماء مولانا محمد شبلی صاحب نعمانی نے مولانا لطف اللہ صاحب کی صدارت کی تحریک کی، اور مولانا شاہ محمد حسین صاحب الہ آبادی نے تائید کی، اس اجلاس کی روح پرور کیفیت کا بیان ایک معتبر

ثقہ شریک مجلس کی زبان سے سنئے :-

"شوال ۱۳۱۱ھ میں پہلا اجلاس ہوا، یہ اجلاس اپنی شان اور اجتماع میں خود اپنی نظیر تھا، ایک شان یہ تھی کہ ہر فرقہ کے صنادید علما شریک جلسہ تھے، علماء حنفی کے علاوہ اہلحدیث میں سے مولوی ابراہیم آروی، مولوی محمد حسین بٹالوی، شیعہ مجتہدین میں مولوی علاء الحسنین کنتوری شریک جلسہ تھے، یہ مشاہدہ تھا کہ تمام علما بلا تخصیص فرقہ صدر نشین کی تعظیم و تکریم میں یکساں سرگرم تھے، کرسی صدارت حضرت سے جمال و کمال دونوں پر نازاں تھی ....

اسی موقع پر جو رسالہ مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی نے پیش کیا تھا اس میں مفتی عنایت احمد صاحب، مولوی لطف اللہ صاحب اور مولوی محمد حسن کی پرشاندار الفاظ میں مدح و ثنا کی تھی (استاذ العلما، ص ۲۴۲ و ۲۴۳ از نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی)

اس کے بعد مولانا شاہ محمد حسین صاحب الہ آبادی نے ندوۃ العلماء کے اغراض اور عربی تعلیم کے موجودہ نقائص پر ایک بسیط اور مدلل تقریر فرمائی، یہ تقریر آج بھی اسی طرح حقائق سے لبریز اور صورت حال کے لحاظ سے تازہ ہے، بعد ازیں مولانا شبلی مرحوم نے ندوۃ العلماء کا دستور العمل پیش کیا، مگر مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی کی تحریک سے یہ دستور العمل علماء کی ایک مجلس کے سپرد ہوا، عصر کے بعد مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی نے دینی و دنیوی ترقی اور مذہبی تعلیم پر وعظ فرمایا۔

دوسرے دن ۱۶ شوال کی صبح کو مولانا شبلی کی تحریک اور مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی کی تائید سے مولانا سید محمد شاہ صاحب محدث رامپوری (راقم کی آنکھیں رامپور کے اتفاقی سفر میں ان کی زیارت سے مشرف ہوئیں اس وقت موصوف کے ہاتھ میں

دیوان علی کا کوئی نسخہ تھا، اور وہ اس کو صاف کر رہے تھے) صدر نشین ہوئے سب سے پہلے مولانا عبدالحق صاحب حقانی نے ندوۃ العلماء کے مقاصد پر ایک پرزور تقریر کی، پھر مولانا ابراہیم صاحب آروی نے دلپذیر وعظ فرمایا۔

۷ شوال کی رات کو مغرب کے بعد دستور العمل پر غور کرنے کے لئے جلسہ خاص ہوا اس جلسہ میں تیس جید علما شریک تھے، کچھ اور اہل الرائے معززین بھی تھے، شمس العلماء مولوی شبلی صاحب ہر ایک دفعہ پڑھ کر سناتے تھے، اور بعد غور و بحث کے وہ دفعہ منظور ہوتی تھی۔ اس طرح تمام دستور العمل منظور ہوا جو درج روداد ہے۔

تیسرا جلسہ، ۸ شوال مطابق ۱۴ اپریل کی صبح کو ہوا، مولانا لطف اللہ صاحب صدارت کی کرسی پر تھے، شمس العلماء مولوی محمد شبلی صاحب نعمانی نے اٹھ کر کہا کہ آج کے جلسہ میں حسب ذیل تجویزوں کا پیش ہونا اور ان پر غور و بحث ہونا قرار پایا ہے۔

پہلی تجویز:- موجودہ طریقہ تعلیم قابل اصلاح ہے۔

دوسری تجویز:- اس امر کی کوشش کی جائے کہ مدارس اسلامیہ کے مہتمم ہر سال ندوۃ العلماء کے اجلاس میں شریک ہوں یا اپنے مدرسہ کے کسی مدرس یا وکیل کو بھیجیں۔

تیسری تجویز:- اس امر میں سعی کی جائے کہ مدارس اسلامیہ جو کثرت سے جا بجا قائم ہیں ان کو ایک سلسلہ میں مربوط کرنے کے لئے دو تین بڑے بڑے مدرسے مثل مدرسہ دیوبند، مدرسہ فیض عام کانپور، مدرسہ احمدیہ[1] آرہ وغیرہ بطور دار العلوم کے قرار دیے جائیں، اور چھوٹے چھوٹے مدرسے ان کی شاخیں قرار دی جائیں اور ان چھوٹے چھوٹے

---

[1] ہندوستان میں اہلحدیث کے نام سے تحریک مولانا سید نذیر حسین صاحب دہلوی اور انکے شاگردوں کے ذریعہ شروع

مدرسوں کی تمام کارروائی ان دارالعلوموں کی نگرانی میں رہے۔

چوتھی تجویز:۔ مدرسۂ فیض عام کانپور چونکہ باعتبار تعلیم نہایت اعلیٰ مرتبے کا مدرسہ ہے، اور بہ تعداد کثیر عربی پڑھنے والے طلبا اس میں موجود ہیں لیکن مدرسہ کا مکان نہ ہونے کی وجہ سے نہ صرف تعلیم میں حرج ہوتا ہے بلکہ ان کی آسایش اور آرام کا کافی انتظام نہیں ہوسکتا، لہٰذا کل ہندوستان کے مسلمانوں کو بلحاظ محبت و ہمدردی ضرور ہے کہ مدرسۂ فیض عام کے ایسے مکان بنانے کے واسطے جس میں دو سو پردیسی طلبا رہ سکیں حسب حیثیت چندہ دیں اور مستحق ثواب ہوں۔

غور کا مقام ہے کہ یہ وہ تجویزیں ہیں جو عربی تعلیم کی اصلاح اور عربی مدرسوں کی تنظیم کے لئے آج سے سینتالیس برس پہلے پیش کی گئی تھیں اور سینتالیس برس کے بعد بھی ہم آج اسی وادی تیہ میں حیران و سرگرداں ہیں، مدرسۂ فیض عام کی جگہ، مدرسہ

ہوئی، اس تحریک کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ طبیعتوں کا جمود دور ہوا اور جب ایک بند ٹوٹا تو اجتہاد کے دوسرے دروازے بھی کھلے، مولوی نذیر حسین کے شاگردوں میں مولوی ابراہیم صاحب آروی خاص حیثیت رکھتے تھے وہ نہایت خوش گو اور پردرد واعظ تھے، وعظ کہتے تو خود روتے اور دوسروں کو رلاتے، نئی باتوں میں سے اچھی باتوں کو پہلے قبول کرتے، چنانچہ نئے طرز پر انجمن علماء عربی مدرسہ اور اس میں دارالاقامہ کی بنیاد کا خیال انھیں کے دل میں آیا اور انھیں نے سنہ ۱۸۹۰ء میں مدرسۂ احمدیہ کے نام سے ایک مدرسہ آرہ میں قائم کیا اور اسکے لئے جلسۂ مذاکرہ علمیہ کے نام سے ایک مجلس بنائی جس کا سال بسال جلسہ آرہ میں ہوتا تھا، اس میں انگریزی بھی پڑھائی جاتی تھی، ندوہ کے قیام کے بعد ۱۳۱۲ھ مطابق سنہ ۱۸۹۵ء میں اس کا سب سے پہلا جلسہ آرہ سے باہر دربھنگہ میں ہوا اور وہاں بحث پیش آئی کہ ندوہ کے رہتے ہوئے اس کے قیام کی ضرورت ہو یا نہیں، بہرحال وہ قائم رہا اور مدتوں خوش اسلوبی کے ساتھ چلتا رہا (۱۹۱۰ء میں میرے والد مرحوم مجھے اسی مدرسہ میں بھیجنا چاہتے تھے مگر تقدیر کچھ اور تھی یہ تجویز عمل میں نہ آئی) مولانا حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری المتوفی سنہ ۱۳۳۷ھ

دارالعلوم ندوہ رکھ لیجئے ،صورت حال کیا بعینہ وہی نہیں۔

اس کے بعد پہلی تجویز مولانا شاہ محمد حسین صاحب الہ آبادی نے پیش کی، موصوف نے اپنے رنگ میں اصلاح نصاب کے مسئلہ کو بڑی جامعیت سے بیان فرمایا، اس کے بعد مولانا شبلی نعمانی نے کھڑے ہوکر اس تجویز کی تائید پر ایک عالمانہ بحث فرمائی اور دکھایا کہ اسلام میں آغاز تعلیم سے طریقہ تعلیم کیا رہا، نصاب کیونکر بدلتا رہا۔ علوم معقولات کا رواج کیسے ہوا، درس نظامیہ کی بنیاد کیوں کر پڑی، اور موجودہ نصاب میں کیا کیا نقائص ہیں، مثلاً معقولات کی کتابیں اس میں ضرورت سے زیادہ ہیں، منطق کی کتابوں میں متاخرین نے الٰہیات کے مسائل مخلوط کردیے ہیں، منطق کی تعلیم کو اس سے پاک رکھنا چاہیے کتاب کے لفظوں کی نہیں فن کی تعلیم ہونی چاہیے۔ ادب کی کتابیں پڑھائی جائیں، قرآن پاک کی اور علوم قرآن کی کتابیں داخل کی جائیں، طریق تعلیم میں اصلاح کیجائے۔

سالہا سال تک اس میں پڑھاتے رہے، مولانا عبدالسلام صاحب مبارک پوری، مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری اور ہمارے دوست مولانا ابوبکر محمد شیث صاحب جونپوری اور بہت سے علما یہاں کے شاگرد ہیں، حافظ صاحب کے بعد مدرسہ پر زوال آیا، ابھی چند سال ہوتے ہیں کہ یہ مدرسہ آرہ سے دربھنگہ کو منتقل ہوگیا، اور مدرسہ احمدیہ سلفیہ کے نام سے مشہور ہے۔ مولانا ابراہیم صاحب نے سفر حجاز میں ۱۳۲۲ھ میں انتقال فرمایا۔

مولانا شبلی صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ ایک دفعہ مولوی ابراہیم صاحب نے اپنا مدرسہ اور خاص طور پر اپنا بورڈنگ دکھایا، میں نے ان سے کہا کہ آپ کبھی علی گڈھ آیئے اور کالج اور اس کا بورڈنگ دیکھئے تاکہ خیال کی بلندی اور سلیقہ کی ستھرائی معلوم ہو، بہر حال عربی مدرسوں کی یہ نئی بدعت ،، اہل حدیث سے شروع ہوئی۔

ؔ مدرسہ فیض عام سے کچھ دنوں کے بعد مولانا احمد حسن صاحب نے الگ ہوکر مدرسہ جامع العلوم قائم کیا تو مدرسہ کی حالت گر گئی، مدرسہ اب بھی کسی نہ کسی حال میں ہے انگریزی کا اسکول ہے اور عربی کے کچھ درجے ہیں۔

اس تجویز کے بعد اسی سے متعلق مولانا حبیب الرحمن خان شروانی نے اپنا مضمون پڑھ کر سنایا جو شاید مولانا شروانی کی پہلی تقریر ہو، مگر اس میں وہی متانت، وہی زور انشار اور وہی جدید و قدیم معلومات کا خوبصورت میل موجود ہے، جو آج بھی انکی تحریر کی خصوصیات ہیں۔

یہ تینوں تقریریں اس سال کی روداد میں موجود ہیں اور پڑھنے کے قابل ہیں۔

اس کے بعد بارہ علمار کی ایک مجلس ترتیب نصاب کے لئے مقرر کی گئی جس میں ایک نام مولانا کا بھی تھا، ان بزرگوں نے اپنی اپنی رائے کے مطابق نصاب کے رسالے لکھے اور مولانا نے دارالعلوم کے نصاب کے بجائے دارالعلوم کا مسودہ (خاکہ) تیار کیا جس کو پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کا مسافر قسطنطنیہ کے کسی بڑے دارالعلوم میں کھڑا ہے یہ رسالے آج بھی مل سکتے ہیں۔

تیسری تجویز منظور ہو جانے کے بعد مولانا شبلی مرحوم نے فرمایا کہ جو دستورالعمل منظور ہوا ہے اس کی دفعہ ا کے مطابق اس کے جلسۂ انتظامیہ کے ارکان کا انتخاب ہونا چاہئے چنانچہ سولہ ارکان کے نام تحریک و تائید سے چنے گئے اور ندوۃ العلمار کا لبدِ قانونی شکل میں جلوہ گر ہو گیا اور مولانا نے ندوہ کی طرف سے حاضرین کا شکریہ ادا کیا، اور ندوہ کا پہلا اجلاس ختم ہو گیا۔

ندوۃ العلما کے مقاصد پر پہلی تقریر

(علامہ شبلی نعمانی)

(۲)

دوسرا بہت بڑا فرض جو علما پر ہے وہ اس دہریت اور الحاد کے اثر کا روکنا ہے جو آجکل یورپ میں پھیل کر ہندوستان کی طرف بڑھتا آتا ہے، غالباً اس مرض کے پھیلنے سے کسی کو انکار نہیں ہے گفتگو جو کچھ ہے وہ علاج کے طرز و طریقے میں ہے لیکن میرے نزدیک ہمکو اس باب میں زیادہ غور و فکر کی حاجت نہیں ہے، یہ بیماری پہلے بھی ایک دفعہ اسلامی ممالک میں پھیل چکی ہے اور طبائے شریعت یعنی علمائے سلف کا علاج اس کے دفع کرنے میں کارگر ثابت ہوا ہے، عباسیوں کا اول اول زمانہ تھا کہ فلسفۂ یونان کا ترجمہ ہوا اور ساتھ ہی چاروں طرف الحاد کی ہوا چل گئی، اکثر فقہا اور بعض محدثین نے اس کا یہ علاج تجویز کیا کہ سرے سے فلسفہ پڑھایا نہ جائے یہاں تک کہ علم کلام کو بھی اس لحاظ سے ممنوع قرار دیا کہ اس میں عقلیات کی آمیزش تھی، امام شافعی کا قول ہے کہ حکمی فی اہل الکلام ان یضربوا بالجرید یطاف بہم فی القبائل، یعنی اہل کلام کے بارے میں میرا یہ فیصلہ ہے کہ ان کو دُرے لگائے جائیں اور قبائل میں ان کی تشہیر کیجائے، اس علاج نے بلحاظ حالت موجودہ کسیقدر فائدہ دیا، یعنی بعض نیک دل فلسفہ پڑھنے سے رک گئے لیکن پورا نفع نہ ہوا کیونکہ سیکڑوں ہزاروں مسلمان منطق و فلسفہ پر ایسے فریفتہ ہو گئے تھے کہ اس کو بالکل چھوڑ نہ سکتے تھے، آخر علما نے دوسرا علاج

سوچا یعنی فلسفہ کے مسائل پر اطلاع حاصل کرکے فلسفہ کی رد کے لئے علم کلام ایجاد کیا اس علاج کے مجوز امام غزالی، امام رازی، ابن رشد، قاضی عضد وغیرہ تھے اور واقعی انکی یہ تدبیر نہایت کارگر نکلی اسی کا اثر ہے کہ اگرچہ درس نظامیہ میں تمام علوم وفنون سے زیادہ منطق وفلسفہ کی کتابیں زیر درس ہیں تاہم مذہبی عقائد کو ان سے کچھ ضرر نہیں ہوسکتا۔

ہمارے زمانے میں بھی اسی مرض نے ظہور کیا ہے اور پہلی قسم کا علاج بھی ہو چکا ہے اگر وہ علاج مفید ثابت ہو تو فبہا ورنہ دوسری قسم کا علاج شروع کیا جائے اور امام غزالی اور امام رازی کی روحیں تازہ کی جائیں۔

ترکی حکومت میں اس ضرورت کو تسلیم کرکے علامہ حسین جسر نے جو تمام روم وشام میں علوم دینیہ وعقلیہ کا استاد تسلیم کیا جاتا ہے ایک کتاب تصنیف کی جس کا نام حمیدیہ ہے تمام مسلمانوں نے اس تصنیف کی نہایت قدر کی اور خود سلطان المعظم خلد اللہ دولتہ نے علامہ مذکور کو اس کتاب کے صلہ میں بہت کچھ صلے اور عطیے عنایت کئے، یہ کتاب ترکی زبان میں بھی ترجمہ کی گئی اور عام طور پر اسکا رواج ہوگیا ہے۔

میں نے اس کتاب کو دیکھا ہے اور اگرچہ میرے نزدیک وہ موجودہ ضرورت کے لئے ناکافی ہے تاہم اس بات سے مسرت ہوتی ہے کہ اس نے ایک عمدہ کام کی بنیاد ڈالی، یہ دوسروں کا فرض ہے کہ اس بنیاد پر مضبوط اور مستحکم عمارتیں بنائیں۔

تیسرا امر جس کی طرف میں علماء کی توجہ مائل کرنا چاہتا ہوں علوم اسلامیہ کے درس و تدریس میں وسعت پیدا کرنا ہے۔

اے حضرات! اس امر سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ پچاس ساٹھ برس سے ہماری

علمی حالت برابر تنزل کی طرف بڑھ رہی ہے جس درجہ کے علما پچاس برس پہلے موجود تھے اس زمانہ کے بعد اس درجہ کے علما نہیں پیدا ہوے اور زمانہ مابعد میں جس رتبہ کے علما پیدا ہوے اس زمانہ کے بعد اس درجہ کے بھی پیدا نہیں ہوے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب شاہ عبدالقادر صاحب مفتی صدر الدین صاحب مولوی فضل حق صاحب جیسے علما کا پیدا ہونا اب گویا ممکن معلوم ہوتا ہے بلکہ اب تو یہ بھی توقع نہیں کہ مولوی عبدالحی صاحب مرحوم، مولوی ارشاد حسین صاحب مرحوم مولانا احمد علی صاحب مرحوم جیسے بزرگ بھی قوم میں پیدا ہوں، تصنیفات کا یہ حال ہے کہ عربی زبان میں اب بہت کم کتابیں لکھی جاتی ہیں، اردو زبان میں جو کتابیں لکھی جاتی ہیں وہ بھی کچھ محققانہ نہیں ہوتیں بلکہ صرف چند نزاعی مسئلوں کے متعلق ادہر ادہر کی خوشہ چینی ہوتی ہے پھر کیا اس کی یہ وجہ ہے کہ اب علوم عربیہ کی قدردانی نہیں رہی اور ان علوم کے پڑھنے والوں کو مناصب اور عہدے نہیں ملتے لیکن ذرا سے غور سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ اس بات کی وجہ نہیں ہو سکتی۔

خدا کا شکر ہے اور ہم اس پر فخر کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے علم کو کبھی تحصیل دولت کے لئے نہیں پڑھا، نہ علما کسی زمانہ میں بہت دولتمند یا صاحب جاہ و منصب تھے، ملا نظام الدین ملا حسن، ملا کمال، شاہ ولی اللہ صاحب، شاہ عبدالعزیز صاحب کو کونسی دولت و ثروت حاصل تھی،

پھر کیا اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ علوم کی تحصیل کے سامان کم ہیں، یہ بھی صحیح نہیں اب جس کثرت سے ہندوستان کے ہر گوشہ میں عربی مدارس موجود ہیں پہلے کبھی نہ تھے جسقدر کتابیں اب چھپ کر شائع ہو گئیں، اگلے زمانے میں کہاں دستیاب ہوتی تھیں، سفر کے وسائل جیسے اب

آسان ہو گئے ہیں پہلے کب تھے۔

پھر کیا اس کی یہ وجہ ہے کہ یہ آخیر زمانہ ہے اور اس بُرے زمانہ کا اقتضا ہی یہ ہے کہ اگلی سی ہمتیں اور اگلی سی حوصلہ مندیاں زمانہ سے مفقود ہو جائیں لیکن اگر ایسا ہے تو زمانہ تمام دنیا کو محیط ہے اس لئے دنیا کے ہر گوشے میں ایسی ہی پستی اور ایسا ہی تنزل پایا جانا چاہئے حالانکہ دنیا کے . ورحصول میں علوم وفنون کی بہار آ رہی ہے ، میں اسی قدر اجمال کے ساتھ دکھانا چاہتا ہوں کہ دنیا کے اور حصوں میں انھیں علوم وفنون کو کسقدر ترقی ہے اور ترقی کے کیا کیا وسائل پیدا ہو گئے ہیں۔

اے حضرات! اگرچہ ہندوستان کی موجودہ حالت دیکھ کر یہی قیاس ہوتا ہے کہ اب علمی ترقی کے میدان میں کوئی نئی وسعت پیدا نہیں ہو سکتی لیکن شام و مصر اور بالخصوص یورپ کی علمی رفتار کے لحاظ سے میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس زمانہ میں جو سامان پیدا ہو گئے ہیں اور علوم وفنون کے متعلق نظر وفکر کے جو طریقے ایجاد ہوئے ہیں پہلے ان کا نام ونشان بھی نہ تھا، اگرچہ ممکن تھا کہ میں اس مضمون پر منطق حکمت تاریخ جغرافیہ طبعیات وغیرہ ہر ایک علم کے لحاظ سے بحث کرتا لیکن اسقدر وقت وفرصت نہیں ہے اس لئے صرف فن ادب کے متعلق کچھ عرض کرتا ہوں۔

اے حضرات! فن ادب کوئی معمولی فن نہیں ہے ، قرآن مجید اور احادیث کے سمجھنے اور اس کے نکات سے واقف ہونے کا اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں یہی وجہ ہے کہ تمام بڑے بڑے مفسرین اور محدثین ادب میں نہایت کمال رکھتے تھے ، فن ادب میں ہمارے یہاں صرف مقامات حریری ، متنبی ، سبعہ معلقہ درس میں داخل تھا اور بعض لوگ

تاریخ تیموری وغیرہ ان میں بھی پڑھتے تھے، صرف یہی نہیں تھا کہ درسی کتابیں انھیں
میں منحصر تھیں بلکہ ادب کا کل سرمایہ جو ہمارے ملک میں دستیاب ہو سکتا تھا وہ یہی
کتابیں یا ان کی شرحیں اور حاشیے تھے۔

اب خیال فرمایئے کہ آجکل ادب کا کس قدر سرمایہ پیدا ہو گیا ہے، جاہلیت اور
شروع اسلام کے اشعار کی نسبت مفسرین نے لکھا ہے کہ قرآن مجید کے مطالب سمجھنے
کے لئے ان پر اطلاع حاصل ہونی ضرور ہے، حضرت عبد اللہ بن عباس کا قول ہے
اَلشِّعْرُ دِیْوَانُ الْعَرَبِ فَاِذَا خَفِیَ عَلَیْنَا الْحَرْفُ مِنَ الْقُرْاٰنِ رَجَعْنَا اِلٰی دِیْوَانِهَا انھیں کا
قول ہے اِذَا سَأَلْتُمُوْنِیْ عَنْ غَرِیْبِ الْقُرْاٰنِ فَالْتَمِسُوْهُ فِی الشِّعْرِ جن اشعار کو حضرت عبد اللہ
ابن عباس نے فہم قرآن کے لئے ضروری سمجھا ان میں سے ہمارے پاس صرف سبعہ معلقہ
موجود تھا لیکن اب تمام مصر وغیرہ میں اشعار عرب کا بے انتہا ذخیرہ موجود ہو گیا ہے شعرائے
جاہلیت ومخضرمین میں سے امرؤ القیس، زہیر بن ابی سلمیٰ، لبید بن ربیعۃ العامری، نابغہ ذبیانی
علقمۃ الفحل، عروۃ بن الورد، حاتم طائی، اوس بن حجر، خنساء، عنترہ بن شداد العبسی، طرفہ
بن عبد بکری، حادرہ کے دیوان چھپ گئے ہیں، قبیلہ ہذیل جن کی نسبت تسلیم کیا گیا ہے
کہ عرب کے تمام قبائل میں سب سے فصیح تر تھے۔ اس قبیلے کے تمام شعراء کا کلام ایک مجموعہ
میں چھاپا گیا ہے، خلیفہ مہدی کی تعلیم کے لئے خلیفہ منصور عباسی نے اشعار عرب کا جو
مجموعہ تیار کرایا تھا اور جس کو علامہ مفضل ضبی نے جمع کیا تھا بیروت میں چھپ کر شائع ہوا،
باون قصیدے جو مختارات اشعار العرب کہلاتے ہیں پورے چھپ گئے ہیں، جمہرۃ
العرب شائع ہو چکا ہے، اسلامی شعراء میں سے جن کا کلام مستند مانا گیا ہے انمیں سے حطیہ،

عمر بن ابی ربیعہ، اخطل، فرزدق، ابو محجن ثقفی کا دیوان چھپ چکا ہے اور زمانہ مابعد کے شعراء کا کلام تو نہایت کثرت سے شائع ہو چکا ہے، عباس بن الاحنف، صریع الغوانی عبداللہ بن المعتز، ابوتمام، ابو عبادہ بحتری، ابوالعتاہیہ، ابو فراس، ابونواس کہ انہیں سے ہر ایک فن شعر کا امام تھا سب کے دیوان چھپ چکے ہیں، انکے سوا ادب کی وہ کتابیں جن میں کثرت سے اشعار عرب مذکور ہیں بکثرت شائع ہو چکی ہیں۔

یہ تو فقط اس سرمایہ کا بیان تھا جو فن ادب میں اب موجود ہے لیکن جب آپ یہ خیال فرمائیں گے کہ اس فن کے متعلق پہلے واقفیت اور تحقیقات کا کیا طرز تھا اور اب کیا ہے؟ تو اور بھی تعجب ہوگا، پہلے یہ طریقہ تھا کہ سبعہ معلقہ کے ساتوں قصیدے معمولی طور پر پڑھا دیے جاتے تھے، اور شوقین طالب علم لغات کو حفظ کر لیتے تھے اسکے سوا انکو کچھ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ یہ شعراء کون تھے انکو اور شاعروں سے کیا نسبت ہے انکے کلام میں کیا کیا خوبیاں ہیں، کہاں کہاں انمیں بلاغت کی کمی ہے لیکن اب ان امور کی تحقیقات کی جاتی ہے کہ عرب میں شاعری کب پیدا ہوئی کن اسباب سے پیدا ہوئی، کس قبیلہ میں اول اسکا رواج ہوا، اقسام شعر میں سے کون کون سی قسمیں کس کس زمانہ میں ایجاد ہوئیں، شعرائے جاہلیت نے کن کن مضامین پر شعر لکھے انمیں عہد بعہد کیا کیا ترقیاں ہوئیں، بلاغت کے کون کون سے اسلوب انھوں نے استعمال کئے، انکی شاعری سے عرب پر کیا اثر پڑا؟ اسلامی شعراء نے فن شعر میں کیا تصرفات کئے، زبان کو کیونکر صاف کیا، کتنے الفاظ چھوڑ دیے، کن کن نئے مضامین پر اشعار لکھے اسی طرح عہد بعہد اس فن میں کیا کیا ترقیاں ہوئیں، ادب کی طرح اور علوم وفنون

میں بھی تحقیقات کا طرز بدل گیا ہے لیکن اسکے بیان کرنے کے لئے وقت نہیں۔

(۳)

اے حضرات! علماء کا ایک اور سب سے بڑا فرض بلند حوصلگی اور عالی ہمتی کا پیدا کرنا ہے، اس سے خدانخواستہ میری یہ مراد نہیں کہ وہ بڑی بڑی نوکریوں کی خواہش کریں، دولت کے جمع کرنے کی تدبیریں سوچیں بلکہ میری مراد علمی اور مذہبی حوصلہ مندی ہے وہ حوصلہ مندی جس کا یہ اثر تھا کہ محدثین ایک ایک حدیث کے لئے ہزاروں کوس کا سفر کرتے تھے جس کا یہ اثر تھا کہ اندلس کے طلبا ہندوستان میں تحصیل علم کے لئے آتے تھے جس کا یہ اثر تھا کہ ابن بیطار نے نباتات کی دریافت کے لئے اندلس سے چل کر یونان اور بحر روم کے تمام جزائر کی خاک چھان ڈالی تھی جسکا یہ اثر تھا کہ جغرافیہ کی تحقیقات کے لئے علامہ بشاری نے پورے ۲۸ برس دنیا کے سفر میں صرف کر دیے تھے جسکا یہ اثر تھا کہ ابو الفرج اصفہانی نے پورے پچاس برس صرف کر کے کتاب الاغانی لکھی اور دنیا کو علم ادب کے بڑے بڑے کتب خانوں سے مستغنی کر دیا جس کا یہ اثر تھا کہ اصمعی محاورات عرب کی تحقیقات کے لئے عرب کے بیابانوں کی خاک چھانتا پھرتا تھا۔

اے حضرات! کیا موجودہ زمانے میں ان حوصلہ مندوں کی ایک بھی مثال پائی جاتی ہے اور کیا ان حوصلہ مندیوں کے بغیر علما اپنے فرض سے ادا ہو سکتے ہیں۔

افسوس اور سخت افسوس یہ ہے کہ علمی حوصلہ مندی اسقدر مفقود ہو گئی ہے کہ ہم اسکے امکان کا بھی تصور نہیں کر سکتے حالانکہ وہ حوصلہ مندیاں دوسری قوموں میں موجود ہیں اور اگر آپ اجازت دیں تو میں مثال کے طور پر صرف ان عجیب و غریب کوششوں کا ذکر کر دوں

جو دوسری قوموں نے خاص ہمارے علوم و فنون کے ترقی دینے میں کی ہیں۔

ان سب سے بڑا احسان جو یورپ کا عربی زبان اور عربی علوم و فنون پر ہے یہ ہے کہ عربی کی وہ کتابیں جو مسلمانوں کے لئے مایۂ فخر ہیں اور باوجود اسکے اسقدر نایاب تھیں کہ کہیں انکا پتا بھی نہیں لگتا تھا یورپ نے نہایت تلاش سے بہم پہونچائیں، انکی تصحیح کی حاشیے چڑھائے، اختلاف نسخ قلمبند کئے، مضامین و الفاظ کی فہرست مرتب کی اور نہایت حسن و خوبی کے ساتھ چھاپ کر مشتہر کیا۔

ان محنتوں کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جس جرمن پروفیسر نے کتاب الفہرست کی تصحیح و ترتیب کی اُس کے پورے بیس سال اس کام میں صرف ہوئے، پروفیسر وایٹ ۱۸ برس سے جریر کے دیوان کے مرتب کرنے میں مصروف ہے، برلن کی ایک کمیٹی نے لاکھ روپے صرف اسی کام کے لئے وقف کر دیے کہ طبقات ابن سعد کا پورا نسخہ جو بارہ جلدوں میں ہے چھاپ دیا جائے چنانچہ خاص اسی غرض سے پروفیسر زاخو اپریل ۱۸۹۵ء میں مصر پہنچا اور اب تک وہیں مقیم ہے، اس طرح کی اور بہت سی مثالیں ہیں، اسوقت تک عربی کی جسقدر نایاب کتابیں یورپ نے چھاپ کر شائع کیں اُن سب کے نام تو میں گنا نہیں سکتا لیکن تاریخ کے تصنیفات کی ایک فہرست ذیل میں لکھتا ہوں جنمیں سے اکثر خود میری نظر سے گذری ہیں، یہ وہ کتابیں ہیں جو یورپ کے چھاپنے سے پہلے ناپید تھیں اور ہمارے ہندوستان کے علما اب بھی ان کے ناموں سے بے خبر ہیں انمیں سے بعض مصر وغیرہ میں چھپی ہیں تو یورپ ہی کے نسخے سے منقول ہو کر چھپی ہیں،

۱۔ تاریخ ابو جعفر محمد بن جریر الطبری تمام و کمال ۱۲ جلد۔ ۲۔ اخبار الطوال ابو حنیفہ دینوری

کتاب التنبیہ والاشراف للمسعودی، انساب الاشراف للبلاذری، تاریخ یعقوبی، فتوح البلدان بلاذری، کتاب الفہرست ابن الندیم بغدادی، رحلۃ ابن جبیر، المعجب، البیان المغرب فی اخبار المغرب للمراکشی، سیرۃ صلاح الدین للقاضی بہاء الدین بن شداد، الفتح القسی للعماد الاصفہانی، ذیل للطبری، المشتبہ للذہبی، نجم ابن بار، اخبار مکہ للازرقی، المنتقی باخبار ام القری، اعلام باعلام بیت اللہ الحرام، استبصار فی عجائب الامصار، الآثار الباقیہ عن القرون الخالیہ، کتاب الاعتبار لابن منقذ، المام للمقریزی، البیان والاعراب بما بارض مصر من الاعراب، کتاب الہند للبیرونی، الخبر عن اول دولۃ من دول الاشراف العلویین، عیون والحدائق، زبدۃ الحلب فی تاریخ حلب، تاریخ آل سلجوق، زبدۃ النصرۃ فی اخبار الوزراء السلجوقیہ، سلسلۃ التواریخ، اخبار العصر، اخبار مجموعہ فی فتح الاندلس، تاج التراجم لقاسم بن قطلوبغا، الفخری فی الآداب السلطانیہ، مروج الذہب للمسعودی، کتاب الصلۃ لابن بشکوال، تکملہ کتاب الصلہ، بغیۃ الملتمس فی تاریخ رجال اہل الاندلس، طبقات المفسرین للسیوطی، اخبار ملوک مغرب والفاس للمقریزی، عجائب الہند لبزرک بن شہریار، المکتبۃ صقلیہ، تہذیب الاسماء للنووی، کتاب الانساب للمقدسی، فتوح الشام للازدی، ملخص طبقات الحفاظ للسیوطی، معارف ابن قتیبہ۔

ان کتابوں کے علاوہ یورپ نے جغرافیہ کی تصنیفات کا پورا سلسلہ مرتب کرکے چھاپا ہمارے خیال میں بھی نہ تھا کہ جغرافیہ کے فن میں جو اس ملک میں خاص انگریزوں کی بدولت آیا ہے اور اسی وجہ سے ہمارے علماء اس سے بالکل ناآشنا ہیں، مسلمانوں نے کوئی خاص کمال پیدا کیا تھا لیکن ان تصنیفات کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں سے پہلے اس فن کی کیا حالت تھی اور مسلمانوں نے اس کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا، کس کو خیال تھا کہ تیسری صدی ہجری

میں عرب کا ایسا جغرافیہ تیار ہوا ہوگا جو بالکل آجکل کی تحقیقات کے موافق ہے جس میں عرب کے ایک ایک شہر ایک ایک گاؤں کی تفصیل ہے اور ہر ہر گاؤں کی پیداوار، عمارتوں، معدنیات، اشجار، نباتات، جانور، تجارت وغیرہ کے حالات تفصیل سے مذکور ہیں، عرب کا یہ جغرافیہ ابن الحائک ہمدانی نے ۳۳۴ھ میں لکھا جو یورپ میں بمقام لیڈن ۱۸۸۴ء میں چھاپا گیا۔

جغرافیہ کے سلسلہ میں جو نایاب کتابیں یورپ میں چھاپی گئیں اُن کے نام حسب ذیل ہیں۔

معجم البلدان یاقوت حموی چار جلد، مشترک یاقوت حموی، مراصد الاطلاع، احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم، جغرافیہ ابن حوقل بغدادی، مختصر کتاب البلدان لابن الفقیہ الہمدانی، کتاب البلدان للیعقوبی، تقویم البلدان، المسالک والممالک لابن خرداذبہ، مسالک الممالک للاصطخری، نزہۃ المشتاق للشریف الادریسی۔

یہ سب بڑی بڑی ضخیم کتابیں ہیں اور ان کے دیکھنے سے مسلمانوں کی علمی کوششوں کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

۴۔ دوسری تیسری صدی میں جو نئے الفاظ عربی تصنیفات خصوصاً تاریخ میں شامل ہوتے گئے لغت کی کتابوں میں کہیں ان کا پتہ نہیں لگتا، تاریخ طبری بلاذری و مقریزی میں سیکڑوں ہزاروں الفاظ ایسے موجود ہیں جو قاموس، لسان العرب شرح قاموس وغیرہ بڑی بڑی کتابوں میں نہیں ملتے اور مجکو اسکا خاص تجربہ ہوچکا ہے، یورپ نے اس مشکل کی عقدہ کشائی کی، فرانس کے ایک پروفیسر نے جسکا نام

دوزی ہے خاص اس قسم کے لغات پر ایک کتاب لکھی جو دو جلدوں میں چھپ کر شائع ہوئی ہے اور جس میں سترہ سو صفحات ہیں یہ کتاب میرے مطالعہ میں ہے اور میں دفعہ مصنف کی محنت اور تحقیق پر حیران رہ جاتا ہوں، ہمارے ملک کے علماء شاید یورپ کی وسعت نظر اور کثرت معلومات کا اعتراف نہ کریں لیکن مصر و شام کے فضلا ان تصنیفات کو پڑھ کر کیونکر انکار کر سکتے تھے۔ علامہ حمزہ فتح اللہ جو مصر میں فن ادب کا استاد الکل ہے اُس نے اپنے رسالہ باکورۃ الکلام میں علانیہ تسلیم کیا ہے کہ نَحْنُ فِی اللُّغَةِ الْعَرَبِيَّةِ کَالْعَائِلَةِ عَلَيْهِمْ یعنی عربی زبان میں ہم یورپ کے دست نگر ہیں"۔

۳- عربی زبان میں ایسی کوئی تصنیف موجود نہ تھی اور نہ کبھی لکھی گئی جو مسلمان فلاسفروں کی تصنیفات کے ریویو کے طور پر ہو اور جس سے یہ ظاہر ہو کہ یونانیوں کے کیا مسائل تھے اور حکمائے اسلام نے اس پر کیا ترقی کی، یورپ میں اس قسم کی تصنیفات کثرت سے لکھے گئے اور برابر لکھے جا رہے ہیں۔

ارسطو کی قاطیغوریاس جس کو حنین بن اسحاق نے عربی میں ترجمہ کیا تھا اصل یونانی زبان میں معہ عربی ترجمہ کے چھاپی گئی ہے اور اس کے دیباچہ میں اس امر پر بحث کی ہے کہ ترجمہ کہاں تک صحیح اور اصل کے مطابق ہے۔

جرمن کے ایک پروفیسر نے فارابی کے تمام تصنیفات اور مسائل پر تین سو صفحوں میں ایک مفصل ریویو لکھا، اسیطرح امام غزالی کے تصنیفات پر تین سو صفحوں میں ایک کتاب لکھی گئی میں نے یہ دونوں کتابیں دیکھی ہیں اگرچہ افسوس ہے کہ جرمن زبان نہ جاننے کی وجہ سے اُن سے متمتع نہیں ہو سکا۔

پروفیسر مونک نے فرنچ زبان میں خاص اس بحث پر کہ مسلمانوں نے یونانیوں کے علوم کی کیونکر تحصیل کی اور ان سے یہودیوں نے کیونکر سیکھا ایک مستقل کتاب لکھی چنانچہ میں نے اس کتاب کے بعض مقامات سبقاً سبقاً پڑھے ہیں، پروفیسر رینان نے حکیم ابن رشد کے فلسفہ پر چار سو صفحوں میں ایک عجیب و غریب کتاب لکھی جس میں اس تفصیلاً بیان کیا ہے کہ جرمن اور فرانس میں کئی سو برس تک خاص ابن رشد کا فلسفہ جاری رہا اور وہاں بہت سے فرقے پیدا ہو گئے تھے جو اپنے تئیں بجائے ارسطو و افلاطون کے ابن رشد کیطرف منسوب کرتے تھے۔ پار سال تمام جنیوا میں جو اورینٹل کانفرنس منعقد ہوئی اسمیں ایک یہ تجویز منظور ہوئی کہ ایک کمیٹی قائم ہو جسمیں عربی زبان کے بڑے بڑے کامل الفن ممبر مقرر کئے جائیں اس کمیٹی کا یہ کام ہوگا کہ مسلمانوں نے فلسفہ، ہیئت، طب اور لٹریچر میں جو ترقی کی اسکی ایک مفصل انسائیکلوپیڈیا تیار کرے چنانچہ اسی کانفرنس میں یہ کمیٹی قائم ہو گئی اور بڑے بڑے عربی داں پروفیسر اسکے ممبر مقرر ہوئے۔

اے حضرات علما! جبکہ دوسری قومیں خود ہمارے علوم و فنون میں ایسی عجیب و غریب کوششیں کر رہی ہیں اور عربی زبان کے میدان میں اسقدر وسعت پیدا ہو گئی ہے تو کیا ہم کو اسی پر قناعت کرنی چاہئے کہ ایک محدود کورس کی چند کتابیں پڑھائی جائیں اور تمام عمر اسی محدود دائرے میں بند پڑے رہیں علمی حوصلہ مندی جسکو میں نے علماء کا فرض بتایا ہے اسکا یہ تقاضا ہے کہ اگلوں نے ہمارے لئے جو سرمایہ چھوڑا تھا دنیا سے ہم جائیں تو اس میں اضافہ کر کے جائیں یہ خیال غلط اور بالکل غلط ہے کہ علمی کارخانہ میں کام کرنے کے لئے اب کچھ باقی نہیں رہا، ابھی بہت وسعت ہے اور بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔

فیض روح القدس ار باز مدد فرماید　　دیگران نیز کنند آنچہ مسیحا میکرد

حالات ندوہ

ہندوستان کے مشہور دینی مرکزوں کی زیارت اور وہاں کے بزرگوں سے استفادہ کا ہمیشہ سے خیال ہے اس غرض سے اساتذہ وطلبہ کبھی کبھی سفر بھی کرتے ہیں چنانچہ ابھی حال میں ہمارے دوست مولانا ابوالحسن علی نے سہارنپور، دیوبند، رائے پور، دہلی اور مضافات دہلی کی سیاحت کی اور تقریباً ڈیڑھ ہفتہ وہاں کے علمی و دینی بزرگوں کی ملاقات و زیارت میں صرف کئے۔

سفر سے واپسی کے بعد الاصلاح کے زیراہتمام ایک جلسہ ہوا جس میں آپ نے اپنے مشاہدات اور تاثرات بیان کئے، اس تقریر کا سامعین پر بڑا گہرا اثر پڑا خصوصاً مولانا عبدالقادر رائے پوری اور مولانا محمد الیاس کاندھلوی کے تذکرہ سے لوگ بیحد متاثر ہوئے اور دینی خدمت کا ایک خاص ولولہ پیدا ہوگیا امید ہے کہ یہ سفر آئندہ بہت سی سیاحتوں کا پیش خیمہ ہوگا۔

نصاب و نظام تعلیم کی اصلاح سے ندوہ کا مقصد یہ تھا کہ ایسے صاحب بصیرت اور وسیع النظر علما تیار ہوں جن کی علمی گہرائی اور فنی مہارت قرون اولیٰ کی یاد تازہ کردے اس غرض سے اس نے عام جماعتی تعلیم کی اصلاح کے ساتھ تکمیل کے درجے بھی قائم کئے تاکہ طالب علم اپنے ذاتی ذوق اور طبعی رجحانات کے مطابق کسی خاص علم میں کمال پیدا کرے دارالعلوم میں تکمیل کے یہ درجے عرصے سے قائم ہیں لیکن تجربہ نے بتایا کہ طلبہ کے رجحان کا اندازہ شروع ہی سے لگانا چاہیے جب اندازہ ہوجائے اور ابتدائی

تعلیم پختہ ہو چکے تو آہستہ آہستہ کسی خاص علم کی طرف انھیں متوجہ کیا جائے، استاذ مرحوم مولانا عبدالرحمٰن نگرامی نے سب سے پہلے اس جانب توجہ کی اُنکی نگاہ دوررس نے ہونہار طلبہ کو جگایا ان کے دلوں میں ذوق و شوق اور طبیعتوں میں جوش و ولولہ پیدا کیا ۱۹۲۶ء سے باضابطہ آغاز کار کا ارادہ تھا لیکن افسوس کہ۔

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

مولانا کی ناگہانی وفات نے سارے ولولے سرد کر دیے اور طبیعتیں ایسی بجھیں کہ عرصہ تک اس راہ میں کوئی قدم نہ اٹھ سکا۔

تقریباً دو برس کے بعد مولانا کے شاگردوں میں پھر حرکت پیدا ہوئی مستعد طلبہ کا انتخاب ہوا فنون تقسیم ہوئے اور ایک علمی مجلس مرتب ہوگئی، مولوی مسعود عالم مدیر الضیا مولوی رئیس احمد جعفری مدیر خلافت و ہندوستان، مولوی حامد علی مدیر خضر راہ، مولوی محمد حنیف جامع مبارک لاہور، مولوی منت اللہ ایم ایل اے بہار وغیرہ اس مجلس کے خاص ارکان تھے راقم الحروف شروع سے آخر تک اس مجلس میں شریک رہا، ہر ہفتہ علمی جلسے منعقد ہوتی تھیں اور مختلف مسائل پر عالمانہ و سیر حاصل بحثیں ہوتی تھیں، ان مضامین کا پورا مجموعہ تو محفوظ نہیں رہ سکا لیکن حدیث، رجال، تاریخ اور ادب سے متعلق بعض مضامین اب بھی الاصلاح کے کتب خانہ میں موجود ہیں جنھیں دیکھ کر ارکان مجلس کے ذوق جستجو اور تلاش و تفحص کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

بعد کو کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا، کئی برس کے وقفہ کے بعد ہم لوگ پھر جمع ہوئے تو اس مجلس کا خیال آیا لیکن عرصہ تک بات آج کل پر ٹلتی رہی با آخر

پچھلے مہینہ اس مجلس کا قیام عمل میں آ ہی گیا اور مولانا مرحوم کی یادگار میں بزم علم رحمانی نام تجویز ہوا متوسطا اور اعلیٰ جماعتوں کے ذہین طلبہ اس میں شریک ہیں جو اپنی صلاحیت و رجحان کے مطابق اساتذۂ فن کی رہنمائی میں مختلف علوم و فنون کا خاص توجہ سے مطالعہ کر رہے ہیں وسط جنوری میں اس کا افتتاحی جلسہ ہوا دوسری نشست شروع فروری میں ہوئی

اس مرتبہ سوق عکاظ کے علمی و ادبی اجتماع بھی خاصے دلچسپ رہے موضوع کی موافقت و مخالفت میں بڑی پرزور تقریریں ہوئیں اساتذہ نے بھی اس بحث میں حصہ لیا اور شیخ مجید الولی، مولانا ابوالحسن علی، مولانا محمد ناظم اور شاہ حلیم عطا صاحب نے اپنے خیالات سے طلبہ کو مستفید فرمایا۔ اس ڈبیٹ کے علاوہ ایک شعری مقابلہ بھی ہوا اس میں بھی طلبہ نے بڑی سرگرمی سے حصہ لیا شیخ عربی نے حکم کے فرائض انجام دیے۔

عربی اور دینی تعلیم کے ساتھ دارالعلوم کے نصاب میں انگریزی زبان اور جدید علوم بھی داخل ہیں انگریزی کی تعلیم محض کتاب خوانی ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ تحریر و تقریر کی مشق کی بھی کوشش کی جاتی ہے، اس سلسلہ میں سوق عکاظ کے عربی اجتماعات کی طرح ENGLISH SPEAKING SOCIETY کے نام سے ایک مجلس قائم کی گئی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ طلبا میں انگریزی بولنے اور لکھنے کی قوت پیدا ہو اور وہ اس سوسائٹی کے ماتحت ہر ہفتہ جمع ہو کر انگریزی خطابت کے جلسے منعقد کریں اس مجلس کا انتظام حسب ذیل اصحاب کے سپرد ہے۔

ناظر اعلیٰ جناب عبدالسمیع صاحب ایم اے، بی ٹی ہیڈ ماسٹر دارالعلوم

پریسیڈنٹ - امیر الدین متعلم دارالعلوم

سکرٹری۔ عبدالحفیظ قدوائی متعلم دارالعلوم

جدید علوم کے سلسلہ میں سیاسیات ومعاشیات ECONOMIC کی تعلیم بھی ندوہ
کے نصاب میں شامل ہے، ان فنون کی تعلیم میں طلبہ کو معاشی اور سیاسی اداروں کا معائنہ بھی
کرایا جاتا ہے تاکہ عملی مثالوں سے نظری مسائل کی وضاحت ہو سکے، سیاسی واقفیت کی غرض سے
یوں تو طلبا کبھی کبھی اسمبلی و کونسل کے اجلاس میں شریک ہوتے رہتے ہیں لیکن دنیا کے دوسرے
دستوری اداروں کے تجربہ کا موقعہ نہ تھا اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ طلبہ خود اس قسم کے مصنوعی
ادارے قائم کریں تاکہ کتابی مسائل عمل کے قالب میں نظر آسکیں آجکل انگلستان کا نظام حکومت
زیر درس ہے اس لئے طے پایا کہ فی الحال وہیں کے نمونہ پر ایک نقلی پارلیمنٹ قائم کی جائے چنانچہ
اسکیم بنی اور وسط جنوری میں پہلا اجلاس منعقد ہو گیا۔

اسپیکر کی آمد کے بعد کارروائی شروع ہوئی سب سے پہلے ہز مجسٹی کا پیغام پڑھا گیا پھر ممبران
کی طرف سے مختلف سوالات کئے گئے جنکا وزرا متعلق نے جواب دیا اس کے بعد وزیراعظم نے
مسائل حاضرہ کے متعلق بیان دیا پھر زعیم حزب مخالف LEADER OF THE OPPOSITION PARTY
نے ہندوستان کی موجودہ آئینی پیچیدگیوں کا ذکر کیا اور حکومت سے درخواست کی کہ وہ ہندوستان
کو جلد ذمہ دار حکومت عطا کرے، اس تقریر کے جواب میں پہلے وزیر ہند پھر وزیراعظم نے تقریر کی
اور حکومت کی پالیسی کی وضاحت کی۔ ان دلچسپ بحثوں کے بعد اسپیکر نے ایوان کا شکریہ ادا
کیا اور کسی آئندہ موقع کے لئے پارلیمنٹ کا اجلاس برخاست ہو گیا۔ اس سلسلہ میں یہ بات
قابل ذکر ہے کہ ایوان کی ترتیب، پارٹیوں کی نشست، اجلاس کی کارروائی، وزراء کے نام
غرضکہ ہر چیز میں مختلف سالناموں YEARBOOKS آئینی رپورٹوں، دستوری کتابوں اور

اخبارات کے فائلوں کی مدد سے اصل کی مطابقت کی کوشش کی گئی تھی، اب ارادہ ہے کہ آیندہ دارالعلوم کے ساتھ دارالامرا کے جلسے بھی کیے جائیں تاکہ پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں سے واقفیت ہو سکے۔

طلبہ کی تربیت کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انھیں بات بات پر ٹوکنے اور قدم قدم پر گھسیٹنے کے بجائے ان میں خودداری اور خودنگرانی کی خو پیدا کی جائے پھر رفتہ رفتہ ذمہ داری کے بوجھ سے انمیں عزم و ہمت اور بلندی و پختگی پیدا کی جائے اسی اصول کے مطابق ندوہ میں قیامت گاہوں کا نظام قائم کیا گیا ہے جہاں کوشش کیجاتی ہے کہ طلبہ کی خوددارانہ تربیت کے ساتھ انمیں ذمہ داری کا احساس پیدا ہو تاکہ وہ زندگی کے میدان میں عزت و کامیابی کی زندگی بسر کر سکیں اس مقصد کی تکمیل کے لئے بورڈنگ کے تمام انتظامات ناظر دارالاقامہ کی رہنمائی میں طلبہ ہی کے سپرد کئے گئے ہیں امسال یہ کابینہ حکومت حسب ذیل اصحاب پر مشتمل ہے۔

ناظم عام	محمد نواب خاں	معین ناظم	محمد یونس صادق آباد
ناظم تعلیم و تربیت	عبدالرشید۔ نذیر علی	ناظم دینیات	غضنفر احمد۔ محمد نبیہ

ناظم صحت و امور عامہ صدرالدین مجیب اللہ

ورزشی کھیلوں کے انتظام کے لئے اب کی حسب ذیل طلبہ منتخب ہوے ہیں۔

جنرل کیپٹن	مسعود شاہ پونوی
ہاکی کیپٹن	محمد یوسف نیسوروی
والی بال کیپٹن	محمد صابر جاوی

پبلشر حامد علی نقوی، پرنٹر بانکے لال سکسینہ، مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ

مجلس ندوۃ العلماء کا ماہوار رسالہ

الندوہ

جس کا مقصد

مسلمانوں کی تعلیمی اور تعمیری خدمت ہے

مرتب

سید ابوالحسن علی ندوی

استاذ تفسیر و ادب

عبدالسلام قدوائی

استاذ تاریخ و اقتصادیات

الندوہ

زیر نگرانی

علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ

جلد ۱ | صفر المظفر ۱۳۵۹ھ مطابق مارچ سنہ ۱۹۴۰ء | نمبر ۳

قیمت سالانہ دو روپیہ　　فی پرچہ تین آنہ

خط و کتابت اور ترسیل زر حامد علی ندوی منیجر رسالہ الندوہ بادشاہ باغ لکھنؤ کے پتہ پر ہونی چاہیے

الندوہ کا پہلا نمبر پڑھکر

(۱)

از نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی

۱۱ ذی الحجہ ۱۳۵۸ھ

مکرمی السلام علیکم۔ کل عید کے دن الندوہ کا پہلا پرچہ آیا۔ دل کو وہی خوشی حاصل ہوئی جو عید کے روز کسی دور سے آئے ہوئے عزیز سے مل کر ہو۔ مبارک ہو، خوب رسالہ نکلا۔

آپکے مضامین نے کیا کیا یاد دلایا۔ اس یاد سے دل پر کیا عالم طاری ہوا، نہ قلم میں قوت نہ بیان میں کہ انکو ادا کرے۔ سب اپنے مخدوم و مشفق تھے جو یکے بعد دیگرے اللہ تعالیٰ کو پیارے ہوئے اپنی یاد کا نقش دل پر چھوڑ گئے۔ وہ یاد آپکے مضامین سے تازہ ہوئی۔

(۲)

از مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی

۹ فروری ۱۹۴۰ء

"الندوہ ملا، ترجمہ مراصد الاطلاع مفتی (عنایت احمد) صاحب کا نہیں میرے حقیقی دادا مولانا مظہر کریم صاحب کا ہے، وہ بھی مفتی تھے اور وہ بھی بالزام بغاوت کالے پانی بھیجے گئے، وہیں مفتی عنایت احمد صاحب اور مولانا فضل حق خیرآبادی وغیرہ کا ساتھ رہا تھا۔ آخر اسی کتاب کے صلہ میں سزائے حبس دوام معاف ہوئی۔ کتاب کا پورا مسودہ قلمی مع دیباچہ ہمارے ہاں موجود ہے۔

الندوہ یہ سنکر بڑی خوشی ہوئی کہ ہمارے فاضل دوست مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی ایسے باعظمت دادا کے پوتے ہیں، اور یقیناً موصوف کے موجودہ علمی کارناموں میں ان بزرگ کی موروثی برکت بھی داخل ہے۔

موصوف سے درخواست ہے کہ مولانا مظہر کریم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حالات اور کتاب مذکور کے دیباچہ سے الندوہ کو مشرف فرمائیں، تاکہ مجاہدین سلف کے کارناموں میں ایک بزرگ نام کا اور اضافہ ہو۔ "س"
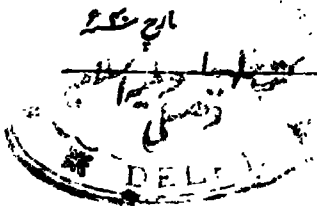
شذرات

اخیر جنوری سے اخیر فروری تک کا زمانہ مجھے حیدرآباد دکن، پونا اور بمبئی میں بسر کرنا پڑا۔ بحمد اللہ کہ انہیں سے ہر شہر میں ندوہ کے عالم و تعلیم یافتہ اور ندوۃ العلماء کے ہمدردوں سے ملنے جلنے کا اتفاق ہوا، اور ہر جگہ ندوہ کے پیام کو دوبارہ زندہ کیا گیا، اور لوگوں کو اسکی امداد کی جانب متوجہ کیا گیا

حیدرآباد میں ہمدرد امراء عام اہل علم اور متعلقین ندوہ کو اس درسگاہ کی طرف ملتفت کیا گیا، سب سے بڑی کامیابی یہ ہوئی کہ اعلیحضرت شہریارِ دکن خلد اللہ ملکہ کے یہاں جب باریابی ہوئی، تو دارالعلوم میں علوم جدیدہ کی تعلیم کی توسیع کے باب میں ایک معروضہ پیش کیا، اُمید ہے کہ اعلیحضرت کمال قدردانی سے اُس معروضہ پر غور فرمائیں گے، انشاء اللہ العزیز۔

بمبئی میں میرا قیام پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب ندوی (اسماعیلی کالج) کے یہاں ہوا۔ تمام دوستوں نے اپنے طعام و کلام سے نوازا اور دوستان ندوہ نے متعدد صحبتوں میں جمع ہوکر ندوہ کے پیام کو سنا، مولوی حکیم حبیب احمد صاحب ندوی اور مولوی رئیس احمد صاحب جعفری ندوی نے اپنے روزنامہ ہندوستان کے دفتر میں دوستوں کو چائے کی دعوت دی، دعوت کے بعد مولوی رئیس احمد صاحب نے ندوہ کی ضرورت اور فوائد پر ایک تقریر کی اور میں نے جواب میں عربی مدارس کی ضرورت پر ایک مختصر گذارش پیش کی جو توجہ سے سنی گئی۔

بمبئی میں ہمارے دوست اور کسی زمانہ میں "ندوہ کے پڑوسی" ڈاکٹر بدل الرحمان صاحب نے جو پہلے لکھنؤ یونیورسٹی میں پروفیسر تھے اور اب اسماعیل کالج میں پرنسپل ہیں، ندوہ سے بڑی ہمدردی

ظاہر فرمائی اور امید ہے کہ دارالعلوم کے دارالاقامہ کے سلسلہ میں ایک کمرہ کی تعمیر انکی کوششوں سے انجام پا جائے۔ سیٹھ میاں محمد دین صاحب نے جو ایک مخیر تاجر ہیں ایک وظیفہ کا وعدہ فرمایا ہے اور آئندہ بھی ان سے امیدیں ہیں۔

اسوقت دارالعلوم کو دو سخت ضرورتیں پیش ہیں۔ ایک غریب طالبعلموں کو وظیفوں کی اور دوسری دارالاقامہ میں جدید کمروں کی۔ اسوقت تقریباً سو روپیہ ماہوار کی مستقل وظائف کی مد میں کمی ہے جو ہمدردی پسند مسلمانوں کی معمولی توجہ سے پوری ہو سکتی ہے۔ دارالعلوم کے جدید کمروں کے مد میں اسوقت چھوٹے بچوں کے لئے چند ایسے کمروں کی ضرورت ہے جنمیں کم از کم پچاس طالبعلموں کی گنجائش نکلے۔ خیال ہے کہ یہ کمرے ۲۰ فٹ لمبے اور ۱۵ فٹ چوڑے ہوں جنمیں ۱۲ لڑکوں کی گنجائش ہے۔ اس حساب سے ہمکو چار کمرے سردست چاہئیں۔ امنیں سے ایک ایک کمرہ کا تخمینہ ۱۵ سو لگایا گیا ہے۔ علوم دینیہ کے قدرشناس مسلمانوں سے امید ہے کہ وہ اس سعادت کے حصول کی کوشش فرمائیں گے یہ بھی ممکن ہے کہ چند مسلمان ملکر کسی ایک کمرہ کے بنانے کی کوشش کریں اور ہر شخص علیٰ قدر مراتب اسمیں حصہ لے۔ مجھے امید ہے کہ آئندہ پرچہ میں ہم ان سابقین اولین کے اچھے نام پا سکیں کہ جو اس سعادت کے حصول کے لئے سب سے پہلے قدم اٹھائیں گے۔

ناظرین کی خدمت میں گذارش ہے کہ اس نووارد مہمان جس کا نام الندوہ ہے اپنی فطری فیاضی سے نوازیں گے۔ ہم صرف چند قدردانوں کی نوازش سے اسکو مستقل وجود حاصل ہو سکتا ہے، گو ابھی ہمارے دو ہی پرچے نکلے ہیں مگر خریداروں کی تعداد ایسی ہے جو ہمارے حوصلہ کو بڑھاتی ہے، ضرورت ہے کہ ہمارے ناظرین اپنے دوستوں کے حلقے میں اس نووارد کا تعارف کرائیں اور ان کو اس کا ہمدرد بنائیں۔

غیر مذہبی عربی تعلیم

خدا کا شکر ہو کہ ہندوستان میں عربی مدرسے ہر صوبہ میں اور صوبہ کے ممتاز شہروں میں کثرت سے موجود ہیں، اور ان مدرسوں میں عربی طالبعلموں کی تعداد بھی تھوڑی نہیں، اور خدا کا سب سے بڑا شکر یہ ہو کہ یہ مدرسے زیادہ تر مسلمانوں ہی کی فیاضی اور امداد سے چل رہے ہیں، اسی لئے ہمکو اسپر غور کرنا ہے کہ ہماری یہ محنت اور یہ دولت بیکار تو ضائع نہیں جا رہی ہے؟

اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے ہمکو پہلے یہ دیکھنا ہو کہ ان عربی مدرسوں کے بانیوں کی غرض کیا ہے بات صفائی سے کہنی ہے، اسلئے دوستوں کی آزردگی کا خیال دل سے نکال دینا چاہئے۔

۱۸۵۷ء کے بعد جب ہندوستان میں اسلامی طاقت کا زوال ہوا اور ہر طرف سے عیسائی مشنریوں نے مسلمانوں پر حملے شروع کئے اُسوقت علماء میں جو شیر مرد آگے بڑھے اور جنھوں نے اپنے علم اور زبان اور قلم سے اس فتنہ کا مقابلہ کیا، اُنھیں میں سے چند اہل دل اور عاقبت بین ہستیاں ایسی تھیں جنکی دُور بین نگاہوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ اگر ملک میں اسلامی علوم و فنون کے قلعے نہ بنائے گئے تو حملہ آور ہمارے مورچوں کو ایک دن فتح کرلیں گے، اس خیال کے آتے ہی انھوں نے خدا پر بھروسہ کرکے عربی مدرسوں کی بنیاد ڈالی، ۱۲۸۳ھ میں مفتی عنایت احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مدرسۂ فیض عام کانپور بنایا، جس سے ندوہ کا وجود ہوا، اور اسی زمانہ میں مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی اور ان کے دوسرے نیک نیت رفیقوں نے مل کر مدرسۂ اسلامیہ دیوبند کی بنیاد ڈالی۔

یہ دیکھکر انگریزوں نے ایک اور فتنہ کھڑا کیا جسکی تشریح یہ ہو کہ انگریزی گورنمنٹ کو یہ یقین تھا کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کے برخلاف جو یہ عظیم الشان طاقت اُٹھ کھڑی ہوئی تھی وہ دراصل

علما کی مذہبی تحریک کا نتیجہ تھی۔ اس کے لئے انھوں نے یہ چال اختیار کی کہ عربی تعلیم کے ایسے کالج
اور مدرسے بنائے جائیں جنکی زبان عربی ہو مگر اسمیں اسلامی روح نہو تاکہ اس روح سے خالی ہو کر
عربی محض ایک لاشیں بیجان زبان بن جائے جس میں حسن و جمال تو پورا ہو مگر زندگی کی طاقت نہ ہو۔ دلی کالج، لاہور
الہ آباد اور کلکتہ کے شرقی سیغے اس خیال کے بہترین مظہر ہیں ہمارے علی گڑھ کالج میں سنہ ۱۹۱۹ء میں
یورپین اور مانند عربی پروفیسر کی تقرری کا بھی یہی منشا تھا کہ عربی تعلیم مذہبی روح کے بغیر
پڑھائی جائے۔ حالانکہ بے دین کی عربی تعلیم کا درجہ اس عربیت جاہلیت سے کم نہیں جس کے مٹانے
کے لئے اسلام آیا۔

ہمکو امراء القیس، طرفہ، نابغہ، اعشیٰ، حاتم طائی، عمرو بن کلثوم وغیرہ جاہلیت کے شعراء سے
فی نفسہ کوئی دلچسپی اس سے زیادہ نہیں جتنی دنیا کی دوسری زبانوں کے ادبیات سے ہمکو ہو سکتی ہے
لیکن اسکے باوجود اگر شعرائے جاہلیت کے کلام اور اشعار سے ہمکو دلچسپی ہے تو صرف اسلئے کہ یہ قرآن پاک
کے سمجھنے اور سمجھانے میں ہمکو کچھ مدد دیں جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بتایا ہے اور
حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے دیوان العرب کہکر ہم کو سمجھایا ہے۔

اگر یہ ہو تو سچ یہ ہے کہ بیروت کے عیسائی ادیبوں اور لغویوں نے عربی زبان اور ادب کی جو
خدمت کی ہے بلکہ یورپ کے بعض عربی کے عالموں نے عربی دواوین و لغات کی تصحیح اور اشاعت
میں جو زحمت اٹھائی ہے وہ آجکل کے بہت سے مسلمانوں کی خدمت سے زیادہ ہے۔

منشا یہ ہے کہ عربی تعلیم صرف عربی تعلیم کے لئے نہ ہماری قومی زندگی کا مقصد ہو سکتا ہے نہ
ہماری مذہبی زندگی کا تقاضا ہے، نہ اسکے لئے ہماری محنت اور دولت کا صرف کچھ سود مند ہے بلکہ جو
بات ہے وہ یہ ہے کہ ہماری زندگی کا مدار جس صحیفۂ الٰہی پر ہے اور ہمارے رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم
کی تعلیم و سیرت اور آپکی اور آپکے رفقائے کرام رضی اللہ عنہم کے ارشادات گرامی جس زبان سے

خزانہ میں محفوظ ہیں وہ یہی مقدس زبان ہے، اسلئے اس زبان کے جاننے اور اسمیں مہارت پیدا کئے بغیر ہم خدا اور اُسکے رسُول کے صحیح منشا سے واقف نہیں ہو سکتے اور نہ اُس فیض سے سیراب ہو سکتے ہیں جو اس زبان کے سرچشمہ سے بہ رہا ہو، اسلئے اس زبان کو جاننا اسمیں ہر طرح مہارت پیدا کرنا اور اسکے الفاظ کی تحقیق، محاوروں کی تفتیش اور طرز و اسلوب کلام کی واقفیت فرض کفایہ کی حیثیت سے مسلمانوں پر واجب ہو، اور اسی لئے ملک کے مختلف گوشوں میں عربی مدرسوں کا قیام ہو۔

میرا خیال ہو کہ ہندوستان میں انقلاب حکومت کے بعد سے جو مذہبی فتنے پیدا ہوئے وہ اسی غیر مذہبی عربی تعلیم کا نتیجہ ہے، سرسید، مولوی چراغ علی اور ان کے رفقار کی تحریک، قادیان کا ہنگامہ، اہل قرآن کا فتنہ، مشرقی صاحب کی تحقیق، ان سب کا سرچشمہ وہ عربی تعلیم یا عربی زبان کی واقفیت ہو جسمیں مذہبی تعلیم و تربیت کا عنصر شامل نہ تھا۔

بات یہ ہو کہ عربی زبان کی تھوڑی سی واقفیت جسمیں مذہبی تعلیم کی تاثیر نہو اُن کو یہ باور کراتی ہو کہ جب ہم عربی زبان جانتے ہیں تو قرآن پاک اور حدیث کی تفسیر و تشریح کا بھی ہمکو پورا حق ہے اور یہی خیال ہر قسم کی اجتہادی غلطیوں کا دروازہ کھولتا ہے۔

اس موقع پر قرآن پاک اور حدیث کی دو اجتہادی غلطیوں کی مثال یاد آئی، ایک ڈپٹی صاحب جو قرآنی اجتہاد کے مدعی اور حدیث کے منکر تھے، ایک دفعہ ملنے آئے، اثنائے گفتگو میں فرمایا کہ قرآن تو ایک ایسی آسان اور سہل کتاب ہو کہ ہر شخص جو تھوڑی بہت عربی جانتا ہو وہ اسکا مطلب آسانی سے بیان کرسکتا ہو، میں نے عرض کی کہ قرآن پاک کی کس آیت سے آپنے ہر کس و ناکس کا یہ حق تفسیر قیاس کیا ہے، فرمانے لگے کہ قرآن پاک کی اس آیت سے ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر اور اس کا ترجمہ یوں کیا (اور ہم نے قرآن کو سمجھنے کے لئے آسان کیا تو ہے کوئی سمجھنے والا) میں نے پوچھا کہ سمجھنا اور سمجھنے والا کس کا ترجمہ ہو ارشاد ہوا ذکر اور مدکر کا

تھیں نے دریافت کیا اور مقرر کیا اور کیا ہو بڑی صفائی سے ارشاد ہوا ادراک اور سمجھنا اور دریافت کرنا ہے انہوں نے سر پیٹ لیا کہ اس عربی دانی پر قرآن پاک کی تشریح کا حق مانگا جاتا ہو۔

مصر کے مشہور عیسائی ادیب و مورخ جرجی زیدان نے اپنی کتاب التمدن الاسلامی میں تہذیب و تمدن کے جلائے جانے پر ایک باب لکھا ہو اور مولانا شبلی مرحوم کے دلائل کو رد کرکے ثابت کیا ہو کہ حضرت عمر کے حکم سے مسلمانوں نے ہی اسکو جلایا تھا، اس دعوے کے ثبوت میں جہاں اور دلیلیں دی ہیں ایک دلیل یہ ہو کہ پیغمبر اسلام علیہ السلام نے فرمایا ہو ان الاسلام یھدم ما قبلہ یعنی اسلام اپنے پہلے کی چیز کو منہدم کر دیتا ہو تو پیغمبر اسلام کے اس حکم کے موجب ہر مسلمان کا فرض ہو کہ اسلام سے پہلے کی عمارتوں کو ڈھادے۔ حالانکہ جس شخص کی نظر میں پوری حدیث ہو وہ اس عربی داں عیسائی ادیب کی اس دلیل کا جواب ایک تحقیر آمیز ہنسی کے سوا کچھ اور نہیں دیسکتا، حدیث تو یہ ہو کہ ایک شخص نے بارگاہ رسالت میں آکر دریافت کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمنے اسلام سے پہلے جو گناہ کئے تھے کیا اسلام کے بعد بھی وہ گناہ باقی رہے گا، آپنے ارشاد فرمایا کہ اسلام اپنے سے پہلے کے کام کو ڈھا دیتا ہو یعنی اسلام سے پہلے جو کچھ برے کام جہالت اور نادانی سے ہوئے تھے وہ سب منہدم ہو جائیں گے اور اب اسلام کے بعد سے مسلمان کی نئی زندگی شروع ہو گی، اس حدیث کو اسلام سے پہلے کی عمارتوں اور مکانوں کے انہدام کے حکم سے کیا تعلق؟

یہ دو باتیں مثال کے طور پر لکھی گئی ہیں ورنہ غیر مذہبی عربی تعلیم کے برے نتائج ہمیشہ کسی نہ کسی صورت میں ظاہر ہوتے ہی رہتے ہیں۔ آج بعض انگریزی کالجوں میں عربی تعلیم جس طرح دیجا رہی ہے اسکا منشا تنہا یہ ہو مگر مذہبی نقطۂ نظر سے وہ ہمارے کام کی چیز نہیں اور اسکے بھروسہ پر ہمکو اپنی عربی درسگاہوں سے غافل نہیں برتنا چاہئے، اور کوشش کرنی چاہئے کہ اسکولوں اور کالجوں اور مشرقی امتحانوں کی عربی تعلیم میں بھی مذہبی رنگ جگہ پائے۔

ندوہ کا مشرقی مطلع

از نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی

عزیزی مولوی سید سلیمان صاحب نے "الندوہ" میں "ندوۃ العلماء کی تاریخ کے پہلے صفحے" مضمون لکھکر اگلی صحبتوں کی یاد تازہ کردی ہو۔ وہ یاد جو اپنے اندر ایک عالم حسرت رکھتی ہو سہ

صحبتیں اگلی مصور ہیں یاد آئینگی	کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز

اُسی مضمون میں جتایا ہو کہ "اس سلسلہ کا رابطہ ایک اور روحانی مرکز سے بندھا تھا، جس کا نام نامی حضرت مولانا فضل رحمان صاحب مجددی گنج مرادآبادی تھا...... مشرق و مغرب کے یہی دونوں مطلع تھے جن سے ندوۃ العلماء کا آفتاب طلوع ہوا۔"

مغربی مطلع کا ذکر مولوی صاحب کے مضمون میں بہت کچھ آچکا ہو۔ مشرقی مطلع کا ذکر میں اپنی ایک پُرانی تحریر کے ذریعہ سے سُناتا ہوں، جو آج سے چونتیس برس پہلے لکھی گئی تھی۔ میں اُس زمانہ میں آگرہ کالج میں پڑھ رہا تھا وہیں سے گنج مرادآباد حاضر ہوا تھا۔ ۲۲ رجب ۱۳ھ رجب کو حاضر خدمت بابرکت ہوا، ۲۵ رجب کو آگرہ واپس جاکر یہ یادداشت لکھی تھی۔

ایک اور بات کہنی تھی، جب میں نے اپنے یہاں کی قلمی کتابوں کی فہرست ختم کی تو اُسکی خوشی میں ایک پُرانا مضمون حاضری پانی پت پر نقل کرکے معارف میں شائع ہونے کے واسطے بھیجا تھا، جو شائع ہوا، اور مؤثر ٹھہرا۔ اب "الندوہ" کے دوبارہ اجرا کی خوشی میں یہ ایک قدیم تحریر آپ کو بھیج رہا ہوں۔	"حبیب الرحمٰن"

مجھکو ایک عرصہ سے مراد آباد کی حاضری کی آرزو تھی، اور باعث آرزو اشتیاق قدمبوسی
حضرت شبلی عہد حنفیہ مولانا فضل رحمان صاحب مدظلہم تھا. چندبار قصد کیا، لیکن محروم رہا، بارے
اب آرزو پوری ہوئی اور شرف پابوسی موجب سربلندی ہوا. جمعہ ۲۰ رجب کو بقصد مراد آباد [illegible]
روانہ ہوکر کانپور پہونچا. ایک وجہ خاص سے ایک روز توقف کرنا پڑا، دوسرے دن کانپور سے
[illegible] میں آیا. یہاں سے پالکی میں سوار ہوکر مراد آباد کو چلا، راستہ میں تھوڑی دیر میں ایک
ندی الین نامی پڑی، کچھ دور جاکر گنگا ملی، صبح کا وقت ابر گھرا ہوا گنگا پر عجب لطف دیتا تھا،
دس بجے مراد آباد پہونچا. دریافت ہوا کہ اسوقت حضرت درس حدیث میں مشغول تھے، اسلئے
بازار کے کنارے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا، تھوڑی دیر کے بعد مسجد کے اندر کے مقبرے میں
جا بیٹھا. یہ مقبرہ خدا جانے کس زمانہ کا ہے، بیچ میں ایک قبر بنی ہوئی ہے، دھوئیں کے سبب سیاہ
ہو رہا ہے. ایک طرف سیتل پاٹی کا فرش پڑا تھا اسپر اور چند آدمی جو حصول زیارت کے واسطے
آئے تھے بیٹھے ہوئے تھے، میں بھی جا بیٹھا. مولانا اگرچہ فاصلہ پر تشریف رکھتے تھے مگر یہاں اور
مسجد سے باہر تک رعب طاری تھا کہ کوئی فرد بشر آواز بلند بات کہنے کی تاب نہیں رکھتا تھا
اور بے تکلف یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی زبردست حاکم کے باہر آنے کے منتظر ہیں، ایک گھنٹہ کے بعد
شرف حضوری حاصل ہوا. حضرت چارپائی پر تشریف رکھتے تھے میں زمین پر بیٹھ گیا، کچھ
تھوڑے سے دریافت حال کے بعد اشعار نعتیہ بکمال شوق و ولولہ پڑھنے لگے، چند منٹ کے
بعد حجرہ میں تشریف لیگئے، مجھکو بھی اندر آنے کے لئے ارشاد فرمایا، بزرگوں کے حالات بیان
فرمائے، مثنوی شریف کے شعر پڑھے. الحق کہ مثنوی کے شعر عجب درد سے پڑھتے تھے، منجملہ ان
اشعار کے یہ شعر بھی تھا ؎

صحبت مرداں اگر یک ساعت است بہتر از صد خلوت و صد طاعت است

کچھ عرصہ کے بعد استراحت کے واسطے رخصت فرمایا۔

حضرت کا قامت بلند، بدن دُہرا، داڑھی چھوٹی نہایت سفید، آواز بھاری اور دردناک، اور باطنی کیفیت میں ڈوبی ہوئی، حضرت کا لباس۔ ڈھیلا انگرکھا، ڈھیلا پاجامہ، دو پلی ٹوپی تمام سر کو ڈھکے ہوئے، کیمخت کا جوتہ جسکی ایڑی بیٹھی ہوئی، حضرت کا حجرہ پُرانا اور تنگ، ایک طرف چارپائی اُسپر فرد اور دری پڑی ہوئی، فرد اور دری دونوں نئے شاید پندرہ روز کے ہوں گے۔ ایک طرف چوکی، اُسپر مٹی کے برتن اور قلمدان، باقی جگہ میں شکستہ و کہنہ بوریا بس۔

بعد ظہر مسجد میں تشریف لاکر حدیث شریف کا درس فرمایا جسمیں حاضر ہونیکی مجھکو بھی عزت حاصل ہوئی، ایک گھنٹہ کے بعد حجرہ میں رخصت کیواسطے طلب فرمایا، اور دُعائے خیر کے بعد اجازت فرمائی۔ یہ مسجد جسمیں حضرت کا قیام ہو نہایت پُرانی اور مرمت طلب ہو رہی ہو۔ مسجد کے دروازہ میں داخل ہونے پر جانب راست ایک مقبرہ ہو جسکا اوپر ذکر ہوا اُسکے سامنے مغربی جانب کو چند قبریں، ایک کنواں اور کچھ دو رحجرہ مبارک ہو، گرد کے مکان بھی کہنہ و ویران ہیں، غرض کوئی چیز اہل دُنیا کی دلچسپی کی نہیں ہو، مگر صدہا امیر و غریب، تونگر و مفلس آتے ہیں اور جاتے ہیں ایک کشش ہو کہ سب کو کھینچتی ہو کسی فن کا آدمی ہو جبتک ہمکو اُسمیں مداخلت نہو ہم نہیں جانتے کہ وہ کیسا ہو آیا کامل یا ناقص استاد یا اناڑی۔ اگر ہم اصول اقلیدس سے واقف نہیں تو اگر ایک شخص کسی شکل مشق کو حل کرے تو ہم یہی کہیں گے کہ کچھ لکیریں کاڑتا ہو اسکا کیا نفع ہو یا اسکا حل کس ذہن و دماغ کا کام ہو، یہ ہماری سمجھ سے باہر ہو ایسا ہی کچھ تصوف کا

حال ہو، جبتک ہم صاحب حال نہ ہوں یہ حاصل نہیں ہو سکتا اور یہ مطلب صاف ہونا ممکن نہیں ہو
عوام کرامات کو دیکھتے ہیں گر صوفیائے کرام نے اس کو...... صوفی کہا ہے۔

حضرت کی خدمت میں پہونچکر دو زبردست خیال میرے دل میں طاری ہوئے، جنکے
سبب یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میں نے حضرت کا مرتبہ پہچان لیا لیکن یہ جانا کہ ہم میں اور اُن میں سوائے
ظاہری شباہت کے اور کوئی مشابہت نہیں۔ ہمارے خیالات سے اُن کے خیال الگ اور ہمارے
ارادوں سے اُن کے ارادے جدا، ہمارے مشاغل سے اُن کے مشاغل علیحدہ۔ اُن کی امیدیں
اور خوشیاں اور خوف اور مقصود اور آگ لکڑی کو جلاتی ہو۔ ہم بھی دیکھتے ہیں اور ان کے بھی پیش نظر
ہے۔ لیکن ہم کیا سمجھتے ہیں اور ان کے ذہن میں کیا آتا ہے۔

اول تو خیال یہ تھا کہ مرادآباد دنیا میں ہو اور گاؤں نہیں قصبہ ہو لیکن حضرت کی مسجد میں
ایک دوسرا عالم نظر آتا تھا۔ دنیاوی معاملات کا کوسوں پتہ نہ تھا خود حضرت کی گفتار و کردار اور
وہاں کے اہل قیام کے احوال سے عام اس سے کہ وہ چند گھنٹے کے آئے ہوئے ہوں یا دو چار برس
سے رہتے ہوں یہ معلوم ہوتا تھا کہ کچھ ایسے لوگ ہیں جو تعلقات دنیا سے کنارہ کر آئے ہیں حیدرآباد
کے امیر کبیر نواب خورشید جاہ بہادر جو ۲۵ لاکھ کے معافی دار ہیں میرے پہنچنے سے صرف ایک دن
پہلے وہاں آئے تھے مگر ان کا ذکر بھی نہ تھا اور نہ کوئی وقعت اُنکی کسی کے ذہن میں معلوم ہوتی
تھی۔ حالانکہ کانپور اور لکھنؤ اُن کے تذکروں کی صدا سے گونج رہے تھے اور ہر ایک سوسائٹی
خواہ اعلیٰ ہو یا ادنیٰ اُن کے تذکرہ کو اپنے جلسوں کا دلچسپ بحث بنائے ہوئے تھی۔ یہ کس کا
اثر تھا۔ آیا مرادآباد کے پانی کا، ہرگز نہیں۔ وہاں کی خاک کا، ہرگز نہیں۔ در و دیوار کا، ہرگز نہیں
حضرت کے ہاتھ پاؤں کا، ہرگز نہیں حضرت کی باتوں کا، ہرگز نہیں۔ البتہ اُس کیفیت کا

اثر تھا جو حضرت کے قلب میں تھی۔ وہ کیفیت کیا تھی، اس سے کون واقف ہو، اور کوئی کیا جانے مریض کا بدن بخار سے جلتا ہو مگر وہ سوائے اثر کے مؤثر کو نہیں جانتا ہے سبب کو تشخیص کرنا طبیب کا کام ہے، ہم بدن پر ہاتھ رکھکر گرمی محسوس کر سکتے ہیں، مریض کو اپنا جسم گرم اور منھ کا مزہ تلخ معلوم ہوتا ہو لیکن یہ جاننا کہ یہ غلبہ صفرا کا نتیجہ ہو طبیب کا کام ہے۔

دوسرا خیال یہ تھا کہ خود میرا ذہن مجھکو ذلیل سمجھتا تھا اور ہر چند حیرت سے غور کرتا تھا لیکن کوئی وقعت اپنی میرے ذہن میں نہیں آتی تھی، دنیاوی جلسوں میں لفٹننٹ کے دربار دیکھے رؤسا کے مجمع دیکھے اہل علم کی مجلسیں دیکھیں، مگر کہیں اپنے نفس کو اتنا بے حقیقت نہیں پایا۔ اپنے اعمال ذمیمہ پر خود نفس ملامت کرتا تھا، اور اپنی بے مائگی پر خود نفرین کن تھا۔ ہر شخص سے خواہ وہ کوئی ہو اپنے تئیں کم تصور کرتا تھا غرض ایک عجیب خیال تھا کہ پورا بیان میں آنا مشکل ہے وہاں سے آنے پر یہ خیال ایسے رہے جیسے کہ کسی دلچسپ خواب کا صبح کو خیال اور لطف ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ کیفیت زائل ہو گئی اور چند لمحہ کے بعد پھر نفس امارہ أنا ولا غیری، اور ہمچو ما دیگرے نیست کے پھندے میں جا پھنسا۔ یہ خیال میرے نزدیک محض نئے اور نرالے تھے جو مدت العمر میں کسی جگہ اور کبھی پیدا نہیں ہوئے۔ اس سے قیاس چاہتا ہو کہ وہ جگہ بھی کچھ اور جگہوں سے نرالی تھی۔ اللہ بس باقی ہوس

۲۵ رجب المرجب ۱۳۰۵ھ
پنجشنبہ۔ اکبر آباد

مشاہدات و تاثرات

از ابوالحسن علی ندوی

[illegible] کے آخری اور [illegible] کے ابتدائی دن ہمنے سہارنپور اور دہلی کے بعض دینی اور علمی مرکزوں میں گذارے، اس سفر کے بعض مشاہدات اور تاثرات امید ہے کہ قارئین کے لئے دلچسپی سے خالی نہ ہوں گے -

شہر سہارنپور سے ۲۰-۲۱ میل کے فاصلہ پر کوہ شوالک کے دامن میں رائے پور نامی ایک قصبہ ہے، جو حضرت مولانا شاہ عبدالقادر مدظلہ (خلیفہ حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ) کی اقامت گاہ ہے، ہمنے ایک دن اور دو راتیں بڑے حظ و کیف کیساتھ اس گمنام یا کمنام خانقاہ میں گذاریں اور ان زندہ خانقاہوں کا نمونہ دیکھا، جو اس عہد انقلاب میں بھی مسلمانوں کیلئے مفید اور بعض دینی اور اصلاحی وجوہ سے ضروری ہیں، مولانا شاہ عبدالقادر صاحب ایک باخبر، روشن ضمیر اور روشن دماغ جامع عالم اور شیخ طریقت ہیں، اور زمانۂ حاضر کے ان مخصوص بزرگوں، اور روحانی پیشواؤں میں سے ہیں، جنکے انفاس و برکات اور رہنمائی کی مسلمانوں کو ضرورت ہے مولانا کی حالات زمانہ سے مکمل باخبری سیاسی فہم و فراست دینی و دنیوی جامعیت اور جذبۂ عمل نے اس خانقاہ میں سنوسی خانقاہوں کی جھلک پیدا کر دی ہے اور مولانا کے کریمانہ اخلاق، بزرگانہ شفقت تواضع اور مسافر نوازی نے مدینۂ منورہ کی نبوی خانقاہ کی (اگر یہ کہنا درست ہو) یاد تازہ کر دی۔

حضرت شاہ صاحب کے ارشادات اور مشاہدات و تجربات اور ربع صدی کی اسلامی سیاست،

اور اسلامی تحریکوں اور اداروں پر منصفانہ اور مبصرانہ تبصرے سے ہم کو گرانقدر علمی فائدہ ہوا، اور بزرگان دیوبند اور حضرت سید احمد شہیدؒ اور آپکے رفقاء کے وجد انگیز واقعات سے ایمان تازہ اور دل زندہ ہوا۔

سہارنپور میں ہمنے مدرسۂ مظاہر علوم کی زیارت کی، طلبہ کی دینداری اور جذبۂ احترام و خدمت سے ہم بہت متأثر ہوئے۔

دیوبند میں ہمنے مسلمانوں کی قابل فخر عظیم الشان اسلامی درسگاہ کی زیارت سے اپنی آنکھیں روشن کیں، ہمارا غیر متزلزل یقین ہو کہ مسلمانوں کی حقیقی زندگی کے سرچشمے عربی مدارس ہی ہیں اور ہندوستان میں اسلامی تہذیب کی بقا اور مسلمانوں کے مذہبی مستقبل کا انحصار سراسر انھیں غریب درسگاہوں پر ہو، لیکن ضرورت ہو کہ ان بنے بنائے اسلامی قالبوں میں بیداری اور زندگی کی روح پھونکی جائے، دنیا میں کسی عمارت اور ادارے کے استحکام اور مرمت اور تجدید کی اتنی ضرورت نہیں جتنی فوجی قلعوں اور جنگی مورچوں کے استحکام اور تجدید کی ہو اور یقین کیجئے کہ یہ مدارس ہندوستان میں اسلام کے قلعے ہیں، انمیں بننے والے سپاہیوں، اور یہاں سے نکلنے والی فوج کو تہذیبوں اور عقلیتوں، رجحانات اور خیالات کے موجودہ خونیں معرکہ میں جدید فنون جنگ سے واقف اور نئے ہتھیاروں علمی و تبلیغی اسلحہ سے مسلح ہونا چاہیئے۔

ہم پر دارالعلوم کے اسلامی ماحول کا ہمیشہ سے اثر ہو، ابکی یہ معلوم کرکے اور مسرت ہوئی کہ یہاں تجدید و اصلاح کا نیا رنگ بھی شروع ہونیکو ہو۔ ہم حضرت مولانا حسین احمد صاحب کی اصلاحی کوششوں سے ناواقف نہیں تھے، اب یہ دیکھکر مزید مسرت ہوئی کہ مولانا طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند بھی اصلاح نصاب اور بعض اہم مضامین کے اضافہ و تکمیل کےلئے کوشاں ہیں۔

مولانا پچھلے دنوں دارالعلوم کے کام سے کابل تشریف لےگئے تھے وہاں آکر وقت کے تقاضوں اور بات کی اس ملک میں اپنے علما اور مذہبی رہنماؤں سے ، توقعات و مطالبات کا پورا اندازہ ہوا اور آپ نے افغانستان جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں اور اہل حکومت سے مل کر ہندستان کی دینی درسگاہوں میں عموماً اور دارالعلوم دیوبند میں خصوصاً صحیح اور مفید تعلیمی انقلاب تجدید کی ضرورت کا شدت سے احساس کیا ، کابل کی مجلس ادبی کے جلسہ میں آپ نے تقریر کی اور فرمایا کہ مسلمانوں کی موجودہ مشکلات کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ ملت کے دو صاحب اقتدار اور با اثر (مذہبی و غیر مذہبی) طبقوں میں کسی قسم کا فکری اور عملی تعاون اور یکجہتی نہیں ہے ، بدقسمتی سے نمائندگان مذہب وقت کی ضرورتوں اور جدید رجحانات سے بے خبر ہیں ، اور ہمارا جدید طبقہ مذہب سے عاری اور نابلد ہے ، اگر ان دونوں طبقوں کی ان خامیوں اور نقائص کو دور کر دیا جائے اور مذہبی جماعت کو دنیاوی تعلیم اور سیاسی جماعت کو مذہبی تعلیم دیدی جائے تو اسلامی ممالک کی موجودہ ذہنی اور اجتماعی کشمکش ختم ہو جائے ، حاضرین مجلس نے جنھیں افغانستان کے منتخب تعلیم یافتہ اصحاب تھے ، تقریر کی پرجوش تائید کی اور اس نقطہ سے پورا اتفاق کیا ، اور اس سلسلہ میں انھوں نے بیان کیا کہ ہم نے اس بات کی کوشش کی کہ ہم حکومت کے ذمہ دار عہدے اپنی قوم کے علما کے سپرد کر دیں لیکن ہم کو جلد اس تجربہ کی ناکامی کا علم ہو گیا ، اور ہم کو معلوم ہوا کہ وہ اپنے فرائض کی ادائیگی کے سلسلہ میں بعض اہم ابتدائی معلومات سے بےخبر ہیں ، انھوں نے یہ بھی کہا کہ ہم کو تعجب ہے کہ دارالعلوم دیوبند سے جو ہمارے افغانی فضلا فارغ ہو کر آتے ہیں وہ قومی اور سیاسی خدمات کی اہلیت نہیں رکھتے ، مولانا نے فرمایا کہ اس کا میں نے ان کو یہ جواب دیا کہ آپ ایسے لوگوں کو بھیجتے ہیں جو ذہنی حیثیت سے

پست اور فطری صلاحیت سے محروم ہوتے ہیں ہم ان کی قلب ماہیت تو نہیں کر سکتے اُسکے مقابلہ میں دیوبند کے بعض فضلا اپنی سیاسی بصیرت اور قابلیت ملک سے تسلیم کرا چکے ہیں، مثال کے طور پر مولانا محمد منصور صاحب جو آپکے یہاں موجود ہیں اعلیٰ سیاسی دماغ رکھتے ہیں، اور ان کا سیاسی علم مسلم ہے، وہ دارالعلوم ہی کے فاضل ہیں: حاضرین نے کہا کہ ہاں مولانا ہمارے رہنما اور استاد ہیں اور ہم ان کے مشوروں اور رہنمائی کے ممنون اور محتاج ہیں۔

مولانا طیب صاحب نے فرمایا کہ میں نے انکو یہ جواب تو دیدیا، لیکن خود اپنی جگہ پر اس جواب سے مطمئن نہیں تھا، میں نے محسوس کیا کہ انکی شکایت بہت حد تک حق بجانب ہے اور میں دل میں یہ خلش لیکر آیا، اور میں نے یہ عزم کرلیا کہ دارالعلوم کی اس کمی کو پورا کیا جائے، میں ابھی تک مجلس شوریٰ میں "محافظین" کی اس جماعت کا خاص رکن تھا جو نظام ونصاب میں ہرقسم کی تبدیلی اور تجدید کی مخالف تھی، لیکن اب میں مجلس شوریٰ کے آیندہ جلسہ کے لئے اصلاح وتکمیل کی ایک مفصل تجویز مرتب کر رہا ہوں اور اسکی تحریک کرنیوالا ہوں کہ دارالعلوم کے نظام اور نصاب میں ضروری تبدیلی اور اصلاح ہونی چاہئے اور طلبہ کو عملی تجربہ اور بیرونی دنیا سے واقفیت کا موقع دینا چاہیئے۔

اس سلسلہ میں مولانا نے جن تفصیلات کا اظہار فرمایا ان سے ہمکو بڑا اطمینان اور بے پایاں مسرت حاصل ہوئی، ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے وہ دن بڑا مبارک ہوگا جس دن دارالعلوم دیوبند میں ضروری اصلاح اور تجدید عمل میں آئے گی۔

مولانا طیب صاحب نے ایک مشہور بزرگ اور عالم کا حوالہ دیتے ہوئے انکی اس رائے سے اختلاف کیا کہ دیوبند کے فضلا سیاسی کارکنوں اور قومی رہنماؤں کے ساتھ رہکر انکی نگرانی میں کچھ دن عملی تجربہ حاصل کریں، مولانا نے یہ صحیح فرمایا کہ یہ خود ان کے نقص اور مذہب کے غیر مکمل ہونے کا اعلان ہے

نے غور کیا کہ مذہب اور اہل مذہب کے ساتھ جب کبھی دنیا اور اہل دنیا کا ضمیمہ لگایا گیا ہے تو
یہ اسلام کی پوری تاریخ میں ہمیشہ غیر خوش آیند اور ناکام رہا ہے اور اسلام کی ترقی کی رفتار اس
اس طریقہ پر ہمیشہ غیر ہموار اور ناہموار رہی ہے بلکہ مختلف اسباب کی بنا پر اہل دنیا کو ہمیشہ غلبہ اور
اقتدار حاصل ہو گیا ہے اور مذہبی و اخلاقی پہلو ہمیشہ بے اثر اور مغلوب ہو کر رہ گیا ہے صحیح اور فطری طریقہ
یہی ہے کہ ایک ہی شخص اور ایک ہی جماعت دین و دنیا کی جامع ہو اور وہی مسلمانوں کی رہنمائی کرے دینی
دنیاوی لحاظ سے سب سے کامیاب اور معیاری دور خلافت راشدہ کا عہد ہے اور اسکی کامیابی کا
راز یہی جامعیت و وحدت اور دینی و دنیاوی جامعیت ہے اب بھی طریق کار یہی ہے کہ ع

اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

مولانا نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اور ندوۃ العلماء اس کام میں
ہمارے ساتھ تعاون کریں، ہم مولانا کو اطمینان دلاتے ہیں کہ ندوۃ العلماء کے خادم اور کارکن
اس سلسلہ میں ہر مدد اور مشورہ کیلئے حاضر ہیں، ندوۃ العلماء کے وجود کا مقصد یہی تھا اور آج
بھی وہ اپنا سب سے بڑا فرض یہی سمجھتا ہے، ہمارا مستحکم عقیدہ ہے کہ وقت کا سب سے اہم فریضہ
عربی مدارس کا تعاون اور تنظیم ہے، آیندہ ہندوستان میں صرف دو گروہ ہوں گے، ایک
وہ گروہ جو مذہبی اور شرعی نظام کو قائم اور باقتدار دیکھنا چاہتا ہے، دوسرا وہ گروہ جو مذہب کو
ترقی کے لئے سد راہ سمجھتا ہے یا اسمیں تحریف کرنا چاہتا ہے، عین وقت ہے کہ محافظ مذہب جماعت
اپنے تمام اندرونی اختلافات اور امتیازات کو بھول کر ایک متحدہ محاذ قائم کرے اور پورے
غور و فکر کے بعد مستقبل میں کام کرنے کا مشترک تعمیری و تعلیمی پروگرام بنالے اگر یہ وقت ہاتھ سے
نکل گیا تو کبھی ہاتھ نہ آئے گا۔

اس موقع پر کچھ نامناسب نہیں ہو اگر ہم اسکا بھی اظہار کردیں کہ ندوۃ العلماء نے عملاً اس تعاون میں پیشقدمی سے کام لیا ہو اور اپنی مجلس انتظامی میں دیوبند کے حلقہ کے متعدد فضلا اور اہل الرائے حضرات کو شریک کیا ہو جنہیں سے مولانا حسین احمد صاحب شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند، مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب، مولانا عبید اللہ صاحب سندھی، مولانا محمد صادق صاحب، مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی، خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ہمارے نزدیک اگر دار العلوم دیوبند بھی دوسرے حلقوں کے علما اور مفکرین کو اپنے تعلیمی مشوروں میں شریک کرے تو یہ علماء کے اتحاد و تعاون اور مدارس کی تنظیم کے لئے بہت مفید ہوگا۔

اس سفر میں ہمنے جو سب سے حیرت انگیز چیز دیکھی اور جس سے ہمکو لازوال مسرت اور روحانی شادمانی حاصل ہوئی وہ میوات کے علاقہ میں حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کا تبلیغی کام اور نظام ہے۔ ہم نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ بیویں صدی عیسوی کا منظر نہ تھا بلکہ پہلی صدی ہجری کا نقشہ معلوم ہوتا تھا، عہد بعثت کی اصلاح اور انقلاب حال، اور قرن اول کے نومسلموں کے جوش و جذبہ اور تبلیغ کے ذوق و شوق کے جو قصے ہمنے سیرت اور تاریخ اسلام میں پڑھے تھے، گوڑ گانوہ کی جامع مسجد اور قصبہ نوح اور شاہ پور کی گلیوں میں اسکا ایک نمونہ دیکھا۔ واقعہ یہ ہو کہ یہ چشتی درویش اور مجددی عالم، قدیم غیاث پور احال بستی نظام الدین) میں حضرت نظام الدین اولیاؒ کے پہلو میں بیٹھکر حضرت معین الدین چشتیؒ کی اشاعت اسلام اور حضرت مجدد سرہندیؒ اور حضرت شہیدؒ رائے بریلوی کی حفاظت اسلام کی سنت زندہ کر رہا ہے۔

مولانا کا تبلیغی نظام یہ ہے کہ ہر گاؤں کے لوگ ہفتہ میں ایک دن پانچ کوس کے اندر اور مہینہ

تین دو دن اس سے بڑے حلقہ میں قصبات و مواضعات میں تبلیغی گشت کریں، لوگوں کے کلمے

صحیح کرائیں، نمازیں درست کریں اور تبلیغ کا شوق دلائیں. سال میں دو مہینہ دوسرے اضلاع

اور صوبجات میں پاپیادہ تبلیغ کے لئے نکلیں. بلغین کو ہدایت ہو کہ وہ اپنی ہی ہدایت اور اصلاح

کی نیت رکھیں، خدا پر بھروسہ کریں اور کثرت سے اسکا ذکر، دعا اور تضرع، کرتے رہیں، ہر مسلمان کا

خواہ کیسا ہی ہو انتہائی احترام کریں. تبلیغ میں انتہائی لجاجت اور نرمی سے کام لیں، اپنا کھائیں،

کسی کی دعوت اور عطیہ قبول نہ کریں.

یہاں تک اصول و قواعد اور ہدایات کا تعلق ہے، ہندوستان کی تقریباً تمام انجمنیں اور ادارے

شاندار اور مکمل ہیں، لیکن ہم پر جس چیز کا سب سے زیادہ اثر ہوا وہ مبلغین کا عمل، جذبہ اور انکی روحانیت

ہے. ہم کو یقین ہو گیا کہ تبلیغ اسلام کا کام بغیر ذاتی شوق، جذب و جنون اور خلوص و روحانیت کے

نہیں ہو سکتا، اجرت اور معاوضہ، اشتہار اور پروپگنڈا سے دنیا کا ہر کام ہو سکتا ہے، مگر مسلمان بنانے کا

کام اور اخلاق کی اصلاح بیغمبرانہ طریق ہی سے ہو سکتی ہے۔

جن دنوں، ہم دہلی میں تھے ہم نے سنا کہ میوات سے تبلیغی قافلے، دہلی اور یوپی کے اضلاع میں

تبلیغ کے لئے نکلے ہیں ہم نے ارادہ کیا کہ ہم ان کو تبلیغ کرتے ہوئے دیکھیں، چنانچہ ہم گوڑگانوہ گئے،

جہاں تیس مبلغین کی ایک جماعت پہونچ چکی تھی، یہ جماعت دس دس آدمیوں پر تقسیم تھی، ہر دس آدمیوں پر

ایک امیر اور ایک معلم مقرر تھا، اور یہ تین مختلف راستوں سے روانہ ہوتے تھے، ان مبلغین کو دیکھکر ہمیں

بے اختیار اصحاب صفہ رضؓ یاد آئے، ہم نے گوڑگانوہ میں ٹھہر کر ان کے کام اور نظام کو دیکھا اور جو کچھ سنا تھا

اس سے زیادہ دیکھا۔

اسپر اکتفا نہ کرتے ہوئے ہم خاص علاقہ میں بھی گئے اور ہم نے ہر جگہ تبلیغ کے کامیاب اثرات

دیکھے بعض جگہ بالکل انقلاب ہوگیا ہے، ایک گاؤں میں (جو کوئی نمونہ کا گاؤں نہ تھا) ہمنے خود جاکر دیکھا
کہ کوئی بچہ، جوان اور بوڑھا ایسا نہ تھا جسکو کلمہ صحیح نہ یاد ہو تقریباً پورا گاؤں نمازی تھا ہندو چماروں کو
بھی سن سن کر کلمے یاد ہوگئے تھے، گاؤں کے نمبرداروں نے بیان کیا کہ یہ گاؤں ڈاکہ زنی میں دور دور
مشہور تھا، انسان کو مار ڈالنا ایسا ہی تھا جیسے خرگوش کو شکار کرلینا، پچھلے دنوں تک یہاں پچاس
چور تھے اور پار سال تک ۵ آدمی دس نمبر کے بدمعاشوں میں تھے اب یہاں ایسا امن ہو کہ دور دور
نہیں، جرائم کا مکمل انسداد ہوگیا ہے۔ یہاں کے نو آدمی تبلیغ کے لئے اسوقت باہر گئے ہوئے ہیں گوالے
اور چرواہے تک جانور چرانے جاتے ہیں تو قرآن کے پارے ساتھ لیجاتے ہیں۔

مولانا کا نظام نہایت سادہ اور قابل عمل ہو، ضرورت ہے کہ ہر مقام پر علما اور اہل شوق
مسلمان اس نظام کو جاری کریں اور تبلیغ کی مردہ سنت کو زندہ کریں کہ صحیح اور بنیادی طریق کار یہی ہے
اور یہی مسلمانوں کی موجودہ مشکلات کا حل ہے۔ جتنا کام ہوچکا ہو اُسپر دلی مبارکباد، اور جو کچھ
ہو رہا ہے اسپر کامل اطمینان کے ساتھ ہم چند گزارشیں کرتے ہیں۔

(۱) ہمارے نزدیک تبلیغی علاقہ کے مدارس و مکاتب میں عربی مدارس کے قدیم نصاب
کی پابندی کی ضرورت نہیں، تبلیغ و اصلاح اور زمانۂ حال کی ضروریات کے مطابق اسمیں مناسب
ترمیم ہونی چاہئے۔

(۲) گاؤں اور قصبات میں بیت المال یا امداد باہمی کی اسلامی طریقہ پر انجمنیں قائم
ہوں اور معاشی اصلاح و ترقی کی کوشش کیجائے اسلئے کہ اس علاقہ میں بڑی غربت ہے۔

(۳) اپنی نگرانی میں کسی عسکری تنظیم و تربیت کا انتظام کیا جائے تاکہ بے راہ غیر مذہبی
جماعتوں کو دراندازی اور دخل درمعقولات کا موقع نہ مل سکے۔

انجمن طلبائے قدیم ندوہ
کی
کارگزاری

پھلواری شریف کے گذشتہ اجلاس کے بعد سے تجاویز کے سلسلہ میں جو کارروائی کی گئی اسکا خلاصہ درج ذیل ہے۔ قارئین کی سہولت کے لئے پہلے ہر تجویز کو مختصراً درج کیا گیا ہے پھر اسکے بعد تجویز سے متعلق کارروائی لکھی گئی ہے۔

پہلی تجویز "طلبائے قدیم دارالعلوم ندوۃ العلماء کا یہ سالانہ اجلاس ضروری سمجھتا ہے کہ دارالعلوم اور اسکی روح وطریق کار کی بقا کے لئے ندوہ کے تمام شعبوں میں ذی فہم ذی علم ندویوں کا انتخاب کیا جائے۔ لہٰذا یہ اجلاس مجلس ندوۃ العلماء سے درخواست کرتا ہے کہ خصوصیت کیساتھ معلمین وارکان مجلس انتظامیہ ندوۃ العلماء کے تقرر میں ندویوں کی اکثریت کو ملحوظ رکھا جائے۔"

اس تجویز نمبر ا کے سلسلہ میں مجلس ندوۃ العلماء کے ناظم صاحب سے خط وکتابت کرنے اور صاحب موصوف کے توسط سے اس تجویز کو مجلس مذکور کے سامنے پیش کرنے کے بعد جو فیصلہ حاصل کیا گیا ہے وہ حسب ذیل ہے۔

" یہ طے ہوا کہ جب یہ ارکان (یعنی موجودہ نمائندگان انجمن طلبائے قدیم) مجلس انتظامیہ میں شریک ہونے لگیں گے اور طلبائے قدیم میں دلچسپی پیدا ہو جائیگی

تو طلبائے قدیم کے منتخب کردہ ارکان کی تعداد کے اضافہ کی کوشش کیجائیگی
نیز یہ بھی طے پایا کہ ندوہ کے شعبوں میں ندویوں سے کام لینے کا اصول پسندیدہ
ہے اور اسی کے مطابق عمل بھی ہو رہا ہے۔"

دوسری تجویز چونکہ بغیر روپیہ انجمن کا کوئی کام چل نہیں سکتا، لہذا سرمایہ جمع کرنے کیلئے طلبائے قدیم ندوۃ العلما کا یہ جلسۂ عام حسب ذیل صورتیں اختیار کرتا ہے

(الف) چندہ رکنیت (ممبری) فراہم کیا جائے

(ب) نیز اور صاحب استطاعت ندوی حضرات سے عطایا لئے جائیں۔

اس تجویز نمبر۲ کے سلسلہ میں جو کچھ کام کیا گیا اسکا اصل تذکرہ بجٹ کے سلسلہ میں آئے گا تاہم اتنا عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دفتر نے اسکی تکمیل پر زیادہ زور نہیں دیا کیونکہ کچھ کام کئے بغیر پیسہ مانگنا بار خاطر ہوتا ہے نیز سالہائے ۳۹ء کو صرف ایسے کاموں کے لئے وقف رکھا گیا جو انجمن کی کارگزاری کو نمایاں اور اسکی ضرورت کو واضح کرسکیں، خدا کا شکر ہے کہ ہمارے طرز عمل نے ندویوں کی جماعت میں اتنا احساس پیدا کردیا کہ حسب ذیل حضرات نے خاص طور پر ہماری امداد فرمائی ہے اور سچ پوچھئے تو انھیں حضرات کی بر وقت امداد سے انجمن کو زندگی اور قوت عمل حاصل ہوئی۔

مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی (احمد آباد)	مولانا اکرام اللہ خاں صاحب ندوی (علیگڑھ)	
مولانا غلام حسین صاحب پھلواروی (پٹنہ)	مولانا عبدالرحمٰن صاحب کاشغری (کلکتہ)	
مولانا مسعود عالم صاحب ندوی (پٹنہ)	مولانا نور الحق صاحب ندوی (پشاور)	

تکیلہ عبدالعزیز صاحب ندوی (اپنا نام) حکیم عبدالجلیل صاحب ندوی (اپنا نام)

تیسری تجویز۔ حسب ذیل تقسیم کے مطابق ناظم صاحب مرکزی انجمن کو شاخیں قائم کرنے کی ہدایت کیجاتی ہے۔

(۱) شاخ یوپی و سی پی مع ریاست نیپال (۲) شاخ بہار، اڑیسہ اور بنگال

(۳) دہلی، پنجاب، سرحد مع ریاست کشمیر (۴) سندھ، بمبئی، مدراس اور حیدرآباد

(۵) آسام، سیام، برما مع جزائر متعلقہ،

مختصر کارروائی تجویز نمبر ۳۔

اس تجویز کے سلسلہ میں جو کام ہوا اسکی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

(۱) شاخ یوپی و متعلقات کے قیام کیلئے عارضی طور پر مولانا داؤد صاحب ندوی کو آرگنائزر بنایا گیا۔

(۲) شاخ دہلی پنجاب و متعلقات کے قیام کیلئے حکیم عبدالرؤف صاحب ندوی کو آرگنائزر بنایا گیا۔

(۳) شاخ بہار و متعلقات باضابطہ قائم ہو چکی ہے اور اسنے کام بھی شروع کر دیا ہے۔

(۴) سندھ وغیرہ کے لئے مولانا عبدالقدوس صاحب کو آرگنائزر بنایا گیا۔

(۵) آسام و متعلقات کا مسئلہ زیر غور ہے اور فی الحال آرگنائزر کے تقرر کے لئے خط و کتابت کیجا رہی ہے، امید کیجاتی ہے کہ امسال آرگنائزران اتنا کام کرلیں گے کہ شاخ کا قیام آخر سال تک ہو سکے گا۔ خاص طور پر شاخ بہار پیش پیش ہے اور امید کیجاتی ہے کہ یہ

خاطرخواہ مرکز کا ہاتھ بٹاکر "قیام شاخ" کی تجویز و تحریک کو مفید ثابت کر دیگی اور دوسری شاخوں کے لئے "نمونہ" کا کام دیگی۔

چوتھی تجویز مالی حالات سازگار ہونے پر ندوی کے نام سے اردو ماہنامہ کا اجرا۔ الحمدللہ کہ تجویز نمبر ۱ (جسکی تفصیلات آگے آئیں گی) نے انجمن کے لئے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ اب سر دست ماہنامہ کے جاری کرنیکا سوال باقی نہیں رہا کیونکہ "الندوہ" کی اشاعت سے ہم بڑی حد تک وہ فائدہ حاصل کر سکیں گے جسکے لئے ندوی کا نکالنا تجویز کیا گیا تھا۔ صورت حال یہ ہو کہ "الندوہ" کی اشاعت سے اول تو زیر بار ہوئے بغیر فی الحال ہمارا مجوزہ کام ہو سکے گا، دوسرے ندوی نہ نکلنے سے "الندوہ" کو ہماری برادری سے کافی خریدار مل جائیں گے۔ لہذا اس تجویز کے مفہوم کی تکمیل کے پیش نظر الفاظ کی پابندی کی کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ مجھے اُمید ہو کہ ندوی حضرات بھی اس صورت کو مناسب قرار دیں گے۔

پانچویں تجویز۔ مجلس ندوۃ العلماء کی باضابطہ منظوری لینے کے بعد اخراجات حصول مالیات کے سلسلہ میں نصف رقم لیکر انجمن ہذا ندوہ کے لئے چندہ جمع کرے اس شرط پر کہ سفرا ندوہ کی طرح ندوہ کا ضروری لٹریچر انجمن کو فراہم کیا جائے منظوری ملنے پر مجلس کارکن کے مشورے کے بعد کام کیا جائے۔"

تجویز مذکور کو مجلس ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ سے باضابطہ منظوری حاصل ہو گئی ہے اور سر دست انفراداً کچھ کام بھی ہو گیا، اب اس مجلس کی منظوری اور اعانت سے انشاءاللہ

اس سلسلہ میں معقول کام بھی کیا جا سکے گا۔

چھٹی تجویز دارالعلوم ندوۃ العلماء کی ترقی و اصلاح اور اسکی تعلیمی و انتظامی حالت سنبھالنے کے لئے ضروری معلومات حاصل کرنا، مالی اعانت کرنا، اور مناسب صورت اختیار کرنا۔

مجلس کارکن کے سابقہ جلسہ کے مشورہ سے اس سلسلہ میں مجلس ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ میں یہ تجویز پیش کیگئی کہ چونکہ حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی سیرۃ النبی کی ترتیب سے فارغ ہو چکے ہیں اور دارالمصنفین مستحکم نظام کی شکل اختیار کر چکا ہے اسلئے حضرت علامہ کو آمادہ کیا جائے کہ اب وہ مستقل طور پر لکھنؤ میں قیام فرمائیں اور دارالعلوم کی ترقی کیلئے جدوجہد کریں۔ خدا کا شکر ہے کہ مجلس ندوۃ العلماء نے ہماری اس درخواست کو شرف قبولیت بخشا اور ناظم صاحب مجلس ندوۃ العلماء نے بالفاظ ذیل ہم کو خوشخبری دی کہ:۔

"جلسہ انتظامیہ ندوۃ العلماء مورخہ ۳۰ راگست ۱۹۳۶ء نے یہ طے کیا ہے کہ مولانا سید سلیمان صاحب دارالعلوم لکھنؤ میں قیام فرمائیں اور موصوف کو دارالعلوم اور اس کے تمام متعلقات کے تمام اختیارات انتظامی دیے جائیں اور اسکے متعلقہ صیغوں کے تمام مداخل اور مخارج ان کے اختیار میں رہیں، اور یہ انتظام سردست تین سال کے لئے کیا جاتا ہے۔"

اجلاس پھلواری شریف کے بعد سے جو کچھ کیا جا سکا اس کا مختصر تذکرہ اس نمبر میں درج کیا گیا۔ اب آیندہ کے لئے جو کچھ طے پایا ہے وہ انشاءاللہ العزیز آیندہ نمبر میں شریک اشاعت کیا جائے گا۔

حالات ندوہ

ٹونک میں عربی کی ایک مرکزی اور معیاری درسگاہ قائم کیجا رہی ہو۔ اس سلسلہ میں وہاں کے ارباب کار نے مولانا حید رحسن خاں مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء کی ضرورت محسوس کی چنانچہ عرصہ سے تحریک تھی کہ مولانا کچھ دنوں کے لئے وہاں قیام کریں اور اپنے قیمتی مشوروں سے کارکنوں کی رہنمائی کریں مگر ندوہ کی غیر معمولی مصروفیتیں سد راہ تھیں بالآخر جب وہاں سے اور اصرار ہوا تو مجبوراً آمادہ ہونا پڑا۔ چند ماہ کی رخصت لیکر مولانا ٹونک تشریف لیگئے ہیں اور آجکل وہیں مقیم ہیں۔

مولانا حافظ محمد عمران خاں کی مصر سے واپسی اور ندوہ میں آمد کا ذکر ان صفحات میں ہو چکا ہو۔ آخر جنوری سے وہ باضابطہ دار العلوم آگئے ہیں اور نائب مہتمم کی حیثیت سے پورے جوش و سرگرمی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ مولانا حید رحسن خاں کی عدم موجودگی میں آجکل وہی دار العلوم کے انچارج ہیں۔

تاریخی مقامات کی سیاحت کا مدت سے خیال تھا، اس سلسلہ میں پچھلے دنوں الاصلاح کی مجلس نے ایک تجویز منظور کی جسے سب نے پسند کیا اور طلبا کی ایک جماعت مرتب ہو گئی، امتحان ششماہی کے بعد اس سفر کا آغاز ہوا اور فروری کے آخری ایام دہلی اور آگرہ کے اطراف میں بسر ہوئے۔ آگرہ میں جامع مسجد کے قریب ہی ایک ہوٹل میں قیام رہا اور خوب

عمومی کارخانہ اور شہر کی زندگی کے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔
تاریخی عمارتیں تاج، قلعہ، اعتماد الدولہ اور سکندرہ کی خوب تفصیلی زیارت رہی ایک دن
پوری بستی جانا ہوا اور وہاں کے آثار بھی غور سے دیکھے گئے۔ طلبا نے عظمت اسلامی کے اس
رقع کو چشم عبرت سے دیکھا کاروان رفتہ کی یاد نے دل میں ٹیس پیدا کی کچھ دیر سناٹا رہا، پھر
ماضی کے شاندار تذکروں نے مستقبل کا تصور دلایا۔ حال کی یاس انگیز فضاؤں میں کہیں کہیں
امید کی کرنیں نظر آئیں، فکر و خیال نے آرزوؤں کی تخم ریزی کی۔ دل کو ایک نئے عالم کی
پیدائش کے سامان نظر آئے اور ذہن و دماغ کے منصوبوں نے سعی و عمل کا ایک میدان تیار کر دیا۔

آگرہ کے اس قیام میں دیال باغ کے دیکھنے کا بھی موقع ملا۔ اب اس نے ایک اچھی
خاصی نو آبادی کی شکل اختیار کر لی ہے جہاں عبادت گاہ، مدرسہ، اسکول، کالج، صنعتی ادارے
کارخانے، شرکتیں، بینک، میونسپلٹی، فارم، ڈاکخانہ، بجلی، نل، غرضکہ ضرورت کے تمام سامان
فراہم ہیں۔ ہم لوگوں نے گھوم پھر کر ان کے کاموں کو دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی حیرت
ہوتی ہے کہ ایک چھوٹی سی جماعت اتنے مختصر زمانہ میں اپنے اتحاد، انتظام اور ولولۂ کار سے
کہاں سے کہاں جا پہونچی ہے۔ دیال باغ کو دیکھکر طلبا میں جوش عمل کی ایک لہر دوڑ گئی اور
اسی عالم میں انھوں نے اپنے ادارہ کے مستقبل کے نقشہ میں کچھ نشان لگائے۔

آگرہ کی سیاحت سے فارغ ہو کر ہم لوگ علی گڑھ آئے تاکہ مسلمانوں کی تعلیم جدید کے
مرکز پر ایک نظر ڈال سکیں۔ مسلم یونیورسٹی کی زیارت کے سلسلہ میں ندوی دوستوں سے بھی

سلام وکلام کا موقع ملا، برادران گرامی مولوی محب اللہ ندوی، مولوی مصطفیٰ اکریم ندوی اور مولوی ضیاء اللہ ندوی سے بڑی پُرلطف گفتگو رہی۔ عزیزی محمد فضیل ندوی نے ندوہ کے قافلہ کی رہنمائی کی اور اپنا قیمتی وقت صرف کرکے گوشہ گوشہ کی سیر کرائی۔

اس سلسلہ میں حضرت مولانا ابوبکر شیث ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی کی عیادت کی سعادت بھی حاصل ہوئی، مولانا عرصہ سے سخت علیل ہیں خدا جلد شفایاب فرمائے۔ آمین

علی گڑھ سے چل کر ہمارا قافلہ دہلی پہونچا، جامعہ ملیہ سے ندوہ اور ندویوں کا دیرینہ تعلق ہے اسلئے وہیں قیام کا ارادہ تھا، اہل جامعہ کے روایتی حسن اخلاق نے اس ارادہ کو اور قطعی بنا دیا، اسٹیشن پر برادرم مولوی محمد عرفان ندوی صدر مجلس اتحاد جامعہ نے استقبال کیا، ان کی رہنمائی میں ہم لوگ جامعہ پہونچے اور مولانا سعد الدین ندوی کیساتھ انصاری منزل میں قیام ہوا۔

دہلی میں ہم لوگ پانچ دن رہے، لیکن شیخ الجامعہ، اساتذۂ جامعہ اور طلبائے جامعہ اس محبت خلوص اور حسن اخلاق سے پیش آئے کہ ہم لوگوں کو مسافرت میں گھر کا مزہ آیا۔ مولانا سعد الدین کی بزرگانہ شفقتوں اور برادرم عرفان وعبد اللطیف کی عزیزانہ محبتوں نے ندوہ کی یاد تازہ کردی۔ اہل جامعہ کی نوازشیں اور ان کی پرلطف صحبتیں ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ اُمید ہو کہ تعلقات کا یہ رشتہ روز بروز مستحکم ہوتا جائے گا۔

دہلی اسلامی آثار کا مرکز ہو اور یہاں کا چپہ چپہ "گوہر یکتا کا مدفن ہو" تفصیلی زیارت

کے لئے مہینوں کی مدت بھی ناکافی ہو۔ اس چند روزہ قیام میں یہی غنیمت تھا کہ تمام اہم مقامات پر ایک سرسری نظر ہی پڑ جائے۔ ہم لوگوں سے جہاں تک ہو سکا گھومے پھرے اور ماضی کے ان شکستہ آثار کی روشنی میں اسلاف کی شاندار تاریخ پڑھنے کی کوشش کی۔ نئی دہلی نے ماضی کا ورق الٹ کر حال کا مرقع سامنے کر دیا، لیکن دل نے کہا کہ یہ اپنا حال نہیں ہے۔ رائے سینا کی صاف سڑکیں، ستھری عمارتیں، آب رواں کی بہاریں، تختہ ہائے گل اور فرش ہائے زمردیں سبھی جاذب نظر تھے لیکن دل کا بُرا ہو کہ وہ اب بھی لال قلعہ اور ہمایوں کے مقبرہ کی قریبی یاد میں سوگوار رہتا۔

دہلی کے فیروزی محلات نے تغلق آباد کی یاد دلائی اور ہم وہاں بھی جا پہونچے۔ اب صرف غیاث الدین کا مقبرہ مکمل حالت میں ہے، باقی پتھروں کے منتشر ڈھیر ہیں جو اپنی عظمت رفتہ پر ماتم کناں ہیں۔ عبرت ہوتی ہے کہ زاغ و زغن کا یہی آشیانہ کبھی تغلقوں کی عظمت و جلال کا مرکز رہ چکا ہے۔ انھیں مناظر کو دیکھ کر جہاں گشت ابن بطوطہ پر حیرت و استعجاب کا عالم طاری ہو گیا تھا۔ یہیں کے عجائب روزگار تذکرے تھے جو مغرب اقصیٰ کے باشندوں کو باور نہ آسکے اور مدتوں خلاف عقل سمجھے گئے یہاں تک کہ ابن خلدون کو وزیر ابن فارس سے ملنا پڑا، اور ان واقعات کی صحت ثابت کرنے کے لئے اپنے مقدمہ میں ایک فصل لکھنی پڑی۔

ماضی کے ان آثار کے ساتھ ہم لوگوں نے شہر کی موجودہ زندگی کو بھی دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی۔ اس سلسلہ میں مختلف مرکزوں اور اداروں کی زیارت کی، عربی مدرسوں میں گئے اور وہاں کے طلباء و اساتذہ سے گفتگو کی۔ جامعہ کے بزرگوں اور دوستوں کی عنایت سے

کے مختلف اداروں اور شعبوں کو تفصیل سے دیکھنے کا موقع ملا، جماعتوں میں حاضر ہوئے۔ جلسوں میں شریک ہوئے، اقامت گاہوں میں گئے، طلبا کی بے تکلف صحبتوں میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا، اساتذہ کی پرخلوص مجلسیں دیکھیں، اس سلسلہ میں اوکھلے کی نئی آبادی میں بھی حاضر ہوئے، جوش عمل اور ولولہ کار قدم قدم پر نمایاں تھا۔ ان مناظر کو دیکھکر بعض بعضوں کے منھ سے بیساختہ نکلا کہ اوکھلے کے میدان میں ایک نیا دیال باغ تیار ہو رہا ہے۔

عمران صاحب کے آجانے سے دارالعلوم میں کافی سرگرمی پیدا ہو گئی ہے۔ دفتر کی از سر نو ترتیب ہو چکی ہے، عمارت کی اصلاح و درستی کی طرف بھی توجہ ہے، درجوں میں رنگ و روغن ہو رہا ہے، اب دارالعلوم کے ہال کی مرمت شروع ہوئی ہے تعلیمی رفتار بھی کافی تیز ہے، اساتذہ و طلبہ غیر معمولی انہماک و توجہ سے کام لے رہے ہیں۔

فروری کے تیسرے ہفتہ میں اساتذہ طلبا اور ادارہ کے اشتراک و تعاون سے ایک کوآپریٹو اسٹور قائم ہوا ہے جناب ڈاکٹر عبدالعلی ناظم ندوۃ العلماء نے رسم افتتاح ادا کی۔ اس موقع پر محب گرامی مولانا ابوالحسن علی نے ایک پراثر تقریر کی، اس اسٹور کے انتظامات کیلئے ڈائرکٹروں کی مجلس اور حسب ذیل عہدہ دار منتخب ہوئے ہیں۔

صدر	جناب عبدالسمیع صاحب ایم اے بی ٹی صدر شعبۂ انگریزی
سکریٹری	مولانا مفتی محمد سعید صاحب ندوی فقیہ دارالعلوم
محاسب	مولانا محمد ناظم صاحب ندوی ادیب دارالعلوم
منیجر	مولانا نجم الدین احمد ندوی منصرم دارالعلوم

مارچ کو پٹنہ جاتے ہوئے مولانا سید سلیمان ندوی دار العلوم بھی تشریف لائے سفر کی وجہ سے قیام مختصر رہا لیکن قیام کے اس اختصار کے باوجود افادہ کا دائرہ کافی وسیع رہا چند گھنٹہ کی مختصر علمی صحبت کے علاوہ طلبا اور اساتذہ کے عام مجمع میں حیات اسلامی اور نسبت محمدی پر ایک موثر اور دلنشین تقریر فرمائی اور طلبہ کو ان کے بلند مقصد زندگی کی طرف توجہ دلائی۔

معین الندوہ ندوہ کا بہت ہی قدیم شعبہ ہے لیکن پچھلے چند برس سے اس میں کافی اضمحلال پیدا ہو گیا تھا۔ چار سال ہوئے کارکنوں کو اس جانب پھر خاص توجہ ہوئی۔ عمران خاں صاحب اس زمانہ میں دار العلوم کے ناظم تھے انھوں نے اس غرض سے اطراف و جوانب کا دورہ کیا بنگال میں بھی کچھ دن قیام کرکے وہاں بھی اس کام کی داغ بیل ڈالی۔ ان کے مصر جانیکے بعد اس کام کی نگرانی راقم الحروف کے سپرد ہوئی۔ تین چار برس کی جد و جہد کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس شعبہ میں بھی جان آگئی اور دار العلوم کو اس سے خاصی امداد حاصل ہونے لگی اب کام اتنا کافی بڑھ گیا ہے کہ مستقل وقت کی ضرورت ہے اسلئے ضرورت محسوس ہوئی کہ معین الندوہ کا مستقل انتظام کیا جاوے اس کام کے لئے ہمارے دوست مولوی حامد علی ندوی بہت ہی موزوں نظر آئے۔ چنانچہ فروری سے یہ شعبہ ان کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ دفتری کاروبار بدستور منشی افتخار حسین انجام دے رہے ہیں ہمیں موصوف کے حسن کار اور جذبۂ عمل سے امید ہے کہ معین الندوہ کا کام بہت ترقی کریگا اور بہت ہی جلد وہ زمانہ آجائے گا جب ہر جگہ اسکی شاخیں قائم ہو جائیں گی۔

آجکل حامد صاحب اودھ کے شہروں اور قصبوں کا دورہ کر رہے ہیں امید ہے کہ ہر جگہ ندوہ کے ہمدرد ان کی مدد کریں گے۔
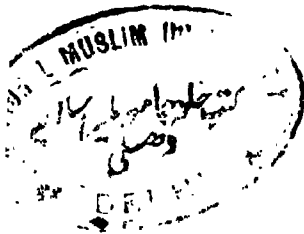
جلد ۱ نمبر ۵

خوشخبری

ہم کارخانہ کے سرپرستوں کو خوشخبری دیتے ہیں
کہ ہمارے یہاں اونٹیل امتحانات الہ آباد اور لکھنؤ یونیورسٹی نیز
اعلیٰ قابلیت کی تمام کتابیں مستند و معتبر شرحیں خلاصے اور
متعلقہ تمام امدادی کتابیں جو مقابلتہً سب جگہ سے عمدہ ہیں
موجود ہیں اور نسبتاً مناسب نرخ پر مہیا کرتے ہیں۔ آپ
لائبریری کی کتابوں کے ساتھ یہ بھی طلب فرما سکتے ہیں
اگر ضرورت ہو تو ان امتحانات کی کتابوں کی فہرست
طلب فرمالیں

منیجر صدیق بکڈپو امین آباد پارک لکھنؤ

پبلشر حامد علی ندوی، پرنٹر بانکے لال سکسینہ، مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ

مجلس ندوۃ العلماء کا ماہوار رسالہ

الندوہ

جس کا مقصد

مسلمانوں کی تعلیمی اور تعمیری خدمت ہے

مرتبہ

سید ابوالحسن علی ندوی

استاذ تفسیر و ادب

عبدالسلام قدوائی ندوی

استاذ تاریخ و اقتصادیات

طلبائے قدیم سے

ایک ضروری گذارش

اسوقت تک میں رسالہ الندوہ کے اجراء پر مبارکباد کے سلسلہ میں ندوی بھائیوں کے خطوط کے جواب دیتا رہا لیکن اب انکی تعداد بہت زیادہ ہوگئی ہے کہ فرداً فرداً ہر ایک کا جواب دینا میرے امکان سے باہر ہے۔ کیا امید کی جائے کہ اظہار مسرت کی طرح خریداری میں بھی اسی مستعدی کا اظہار کیا جائے گا؟

میں اپنے ان تمام بزرگوں اور دوستوں کا جنھوں نے الندوہ کے اجراء پر اظہار مسرت کیا ہے اور مجھے مبارکباد دی ہے صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتا ہوں اور انھیں یقین دلاتا ہوں کہ اس تہنیت کے اصلی مستحق آپ ہی ہیں "اس لئے کہ ابتک جو کچھ ہوا وہ آپ ہی حضرات کی امداد و اعانت اور تعاون و ہمدردی کی بدولت ہو سکا ہے اور آئندہ بھی جو کچھ ہوگا وہ آپ ہی حضرات کی توجہ و عنایت سے ظہور میں آئے گا۔

نامناسب نہ ہوگا اگر میں اس موقع پر دو باتیں آپ کو یاد دلا دوں۔

(۱) حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی نے اعلان فرمایا ہے کہ اب پرچہ اس منزل پر پہنچ گیا ہے کہ "صرف تین سو قدردانوں کی نوازش سے اس کو مستقل وجود حاصل ہو سکتا ہے"

یہ تعداد ہم ندوی جماعت سے پوری کر دیں اس طرح کہ خود اپنا چندہ بذریعہ منی آرڈر بھیجدیں اور ہمارے علم میں جو ندوی بھائی ہوں اور اب تک اس کے خریدار نہ بن سکے ہوں انکو خریدار بنا دیں۔

(۲) اجلاس پھلواری شریف میں انجمن طلبائے قدیم نے ۵۰۰ روپیہ دارالعلوم کو دینے کی تجویز منظور کی ہے جسکا کھاتہ میں نے شعبہ معین الندوہ میں انجمن طلبائے قدیم کے نام سے کھول دیا ہے۔

لہذا حسب حیثیت خود اور جتنا آسانی سے جمع ہو سکے اتنا اپنے حلقہ اثر سے وصول کر کے ماہانہ ناظم معین الندوہ کے نام بادشاہ باغ لکھنؤ کے پتہ پر بھیجدیجئے اور کوپن پر اس کی تشریح کر دیجئے کہ یہ رقم منجانب انجمن طلبائے قدیم شمار کی جائے اس امداد میں کم و بیش کا خیال نہ کیا جائے قطرہ ہی قطرہ دریا ہو جاتا ہے فیس منی آرڈر اسی میں سے ادا کر دینا چاہئے اور کم رقم ہو تو ٹکٹ ڈاک کی صورت میں لفافہ کے اندر رکھکر بھیجدیجئے۔

مجھے امید ہے کہ طلبائے قدیم کی توجہ فرمائی حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی کے لئے زیادہ سے زیادہ کام کے مواقع بہم پہنچانے کا موجب ہوگی

حامد علی ندوی
ناظم انجمن طلبائے قدیم

الندوہ

زیر نگرانی
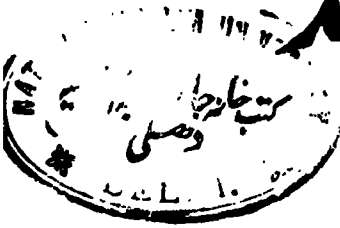
علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ

ربیع الاول ۱۳۵۹ھ مطابق اپریل ۱۹۴۰ء

جلد ۱ نمبر ۴

قیمت سالانہ دو روپیہ عہ قیمت فی پرچہ تین آنے

خط و کتابت اور ترسیل زر حامد علی ندوی منیجر رسالہ "الندوہ" بادشاہ باغ لکھنؤ کے پتہ پر ہونی چاہئے

شذرات

خدا کا شکر ہے کہ دار العلوم کے منتشر اجزا پھر یکجا ہو رہے ہیں، ابھی دکن سے واپس ہی آیا تھا کہ پنجاب صوبہ سرحد اور بہاولپور کے سفر کا اتفاق ہوا، ہر جگہ دار العلوم کے فرزندوں اور ہمدردوں نے اپنی محبت سے بڑھکر خیر مقدم کیا اور دار العلوم کی خدمت پر آمادگی ظاہر کی۔

پشاور میں اسلامیہ کالج اپنے احاطہ میں دینیات اور طب کی تعلیم کا ایک نیا شعبہ کھولنا چاہتا ہے اسی شعبہ کے نصاب کی ترتیب کی خاطر ایک ہزار میل کا سفر ہوا، اور پانچ سال کا ایک ایسا نصاب تیار ہوا جسمیں تھوڑی عربی متوسط فقہ حدیث اور تفسیر کے ساتھ طب کی پوری کتابیں رکھی گئیں طب کا نصاب طبیہ کالج دہلی کے ایک لائق استاد نے مرتب کیا، اس شعبہ سے مقصود یہ ہے کہ ایسے طبیب تیار ہوں جو صوبہ سرحد اور علاقہ جات کے دیہاتوں میں پھیل کر مسلمانوں کی جسمانی و روحانی خدمت بجالاسکیں خیال اچھا ہے کامیابی خدا کے ہاتھ ہے، اس نصاب میں ندوۃ العلماء کے حالیہ صرفی و نحوی رسالوں کو رکھا گیا ہے۔

پشاور کے احباب نے ندوہ کا بھی خیر مقدم کیا اور برادرم حکیم عبد الجلیل صاحب ندوی کے مکان پر ایک دعوت میں جسمیں آنریبل ملک خدا بخش خاں اسپیکر سرحد اسمبلی اور دوسرے معززین شریک تھے، پشاور میں حلقۂ معین الندوہ کے قیام اور اسکی طرف سے احباب کی خدمت میں سالانہ و ماہانہ چندوں کی اپیل کی تجویز منظور ہوئی، سردست حسب ذیل صحاب

نے اس آواز پر لبیک کہا۔

۱۔ آنریبل ملک خدا بخش خاں — عسہ/ سالانہ

۲۔ جناب حکیم عبدالعزیز صاحب ندوی — عسہ/ سالانہ

۳۔ جناب حکیم عبدالجلیل صاحب ندوی — شہ/ سالانہ

۴۔ جناب مولوی نورالحق صاحب ازہری ندوی ناظم دینیات اسلامیہ کالج پشاور — سہ/ ماہوار

۵۔ خواجہ عبدالعزیز صاحب ندوی — صہ/ 〃

۶۔ حاجی رحیم بخش صاحب — عہ/ 〃

اسکے بعد پورے شہر میں کام کرنے کا فیصلہ ہوا۔

پشاور میں چند روز قیام کے بعد لاہور ہوکر بہاولپور کا سفر ہوا۔ سفر کی تقریب بہاولپور کے سرکاری کالج صادق ایجرٹن کالج میں کانوکیشن ایڈریس کی خدمت تھی، عین تقریب کی شام کو بمجبوری اَرات کو ۱۱ بجے رات تک ایڈریس لکھا گیا اور ۴ تاریخ کے گیارہ بجے دن کو پڑھا گیا جسکو ناظرین آیندہ صفحوں میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

بہاولپور میں ۱۹۲۵ء سے جامعہ عباسیہ کے نام سے ایک سرکاری عربی درسگاہ ندوہ کے اصول پر قائم ہے یعنی اسمیں دوسرے علوم کے ساتھ انگریزی بھی پڑھائی جاتی ہے یہ درسگاہ اس اسلامی ریاست کی واحد اعلیٰ مذہبی درسگاہ ہے۔ مولانا غلام محمد صاحب

جو مولانا احمد حسین صاحب کانپوری مرحوم (صدر ندوۃ العلماء) اور مولانا فضل حق صاحب رامپوری مرحوم (رکن ندوۃ العلماء) کے خاص شاگردوں میں ہیں اور دوسرے لائق اساتذہ بھی درس دیتے ہیں۔

موجودہ وزیر تعلیم ریاست بہاولپور عالی مرتبت میجر شمس الدین محمد صاحب کو جو ایک مخلص و دیندار تعلیم یافتہ ہیں، جامعۂ مذکور کی اصلاح و ترقی کا خیال ہوا اور جناب بقا محمد خاں صاحب چیف انسپکٹر تعلیمات کی بھی ادھر پوری توجہ ہو، محکمۂ تعلیمات ریاست مذکور کا مدت سے اصرار تھا کہ جامعہ کو دیکھکر اُسکے لئے مفید اصلاحات کی تجویز پیش کروں اس سفر میں بحمداللہ کہ یہ کام بھی انجام پایا، تمام اساتذہ اور افسران تعلیم نے جس محبت اور اخلاص سے اس فقیر کی پذیرائی کی اُس کا شکریہ!

بہاولپور کا تعلق ندوہ سے بہت پرانا ہے، اس سفر میں ان قدیم تعلقات و روابط کی تجدید ہوئی، احباب نے حلقۂ معین الندوہ کے قیام پر مستعدی ظاہر فرمائی، اور میرے مخلص دوست مولانا عبداللہ صاحب مدیر مراسلات تعلیمی نے اور دوسرے دوستوں نے اسکے لئے مستعدی ظاہر کی اور محکمۂ تعلیم نے اپنے مدارس میں الندوہ کا اجرا منظور کیا، جسکے لئے ہم سراپا شکرگزار ہیں۔

اس سفر کے نتیجہ میں ہمارے ناظرین ایک عظیم الشان خوشخبری کے منتظر رہیں جس کے اعلان کا موقع شاید آئندہ پرچہ میں مل سکے، انشاء اللہ جو کام اخلاص سے شروع ہوگا اُس کو حسن قبول حاصل ہوگا۔

خطبۂ اسناد

صادق ایجرٹن کالج بہاولپور

۱۴ مارچ ۱۹۴۰ء کو صادق لائبریری ہال بہاولپور میں علامہ سید سلیمان ندوی نے پڑھا

جناب صدر! وزیر صاحب تعلیم! اساتذہ اور عزیز طلبہ!

سب سے پہلے میں آپ حضرات کی اس محبت کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے ایک ہزار میل سے مجھے اسلئے یاد فرمایا کہ میں اس اہم موقع پر آپکے سامنے اپنے خیالات ظاہر کروں آپنے اس موقع پر جبکہ دنیا کی ہر چیز میں انقلاب اور تغیر برپا ہو پرانے تعلیمی دستور کی متعدد دفعات کی خلاف ورزی کی جرأت کی ہو، آپنے شاید سب سے پہلی دفعہ اس کرسی کو جو اب تک صرف اعلیٰ منصب کے انگریزی تعلیم یافتوں کیلئے خاص تھی، اس حد تک نیچے کر دیا ہے کہ پرانے طرز کے ایک "مولوی" کو اُس پر بیٹھنے کی عزت دی ہو، اس سے پرانے آئین کی ایک اور دفعہ کی خلاف ورزی ہوئی، یعنی یہ کہ انگریزی کے بجائے اردو کو یہ شرف بخشا گیا ہے کہ وہ اس موقع پر اظہار خیال کا ذریعہ بنے۔

ندوہ اور بہاولپور کا پرانا تعلق ٹھیک اُسی تاریخ کو مجھے اسلامیہ کالج پشاور اور صادق ایجرٹن کالج بہاولپور دونوں کی طرف سے کانووکیشن ایڈریس کی صورت میں اظہار خیال کی دعوت دی گئی، مگر ان روابط کی بنا پر جو مجھے بحیثیت تعلیم یافتہ و خدمتگذار ندوۃ العلما اس سرکار بہاولپور سے ہیں اس کالج کی حاضری کے فریضہ کو ترجیح دینی پڑی۔

سرکار بہاولپور کا نام سب سے پہلی دفعہ میرے کانوں نے سنہ ۱۹۱۰ء میں سنا جب میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ایک معمولی طالب علم تھا، علیا حضرت جنت ماجدہ صاحبہ نے یکمشت پچاس ہزار کی شاہانہ رقم دارالعلوم ندوۃ العلماء کی تعمیر کے لئے عطا فرمائی تھی، اور یہ ۳۲ برس کی بات یاد ہوں رکھی کہ اس خوشی میں اُس دن ہم تمام طالب علموں نے اپنے کھانے مستحقین کو تقسیم کر دیئے تھے اور خود بھوکے رہے تھے۔

یہ پُرانی داستان سنہ ۱۹۲۶ء میں امرتسر میں دوبارہ دُہرائی گئی اور پھر ندوۃ العلماء اور بہاولپور کے سلسلہ کو جوڑ گیا۔ اب چودہ برس کے بعد سنہ ۱۹۴۰ء میں جب پھر وزیر تعلیمات بہاولپور نے سلسلہ جنبانی فرمائی تو ایک قدیم خدمتگزار اور ممنون احسان ندوی کی حیثیت سے باوجود بہت مشغولیتوں کے اس دعوت کے انکار کی جرأت کسی طرح نہیں ہوئی۔

میرے لئے بہاولپور کی سرزمین میں عقیدت کا ایک اور مرکز بھی ہے، آپ صاحبوں کو معلوم ہوگا کہ مجھے تاریخ اسلام سے تھوڑی بہت دلچسپی ہے اور اس بنا پر عباسی خاندان کے علمی کارناموں کی تحقیق و تفتیش زندگی کا دلچسپ مشغلہ رہا ہے۔ بہاولپور کے تخت پر جو خاندان فرمانروائی کر رہا ہے وہ اپنی تاریخ کے صفحات میں اُن کارناموں کی بہت کچھ جھلک رکھتا ہے اسلئے اس عباسی فرمانروا کے پایۂ تخت سے مجھے والہانہ عقیدت ہے۔

مجھے یاد ہے کہ سنہ ۱۹۳۳ء کے اکتوبر میں جب ڈاکٹر اقبال اور سر راس مسعود مرحوم کی معیت میں کابل سے قندھار و چمن ہو کر کوئٹہ سے لاہور جا رہا تھا تو بہاولپور کے اسٹیشن پر پہونچ کر میری عقیدتمندانہ آنکھوں نے در و دیوار پر نظر ڈالی اور جی چاہا کہ ایک نظر بھر کر اسکو دیکھوں مگر ریل کی تیز رفتاری نے ایک چشم زدن میں اِدھر سے اُدھر پہونچا دیا۔

بھاولپور کی اہمیت ہندوستان کی تمام اسلامی ریاستوں میں اس ریاست کو یہ خاص حیثیت حاصل ہو کہ اسکی آبادی میں ۸۵ فیصدی مسلمان بستے ہیں۔ اس بنا پر اسکے ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک خاص وابستگی ہو۔ اور چونکہ عدل و انصاف اور بے تعصبی اس ریاست کا خاص دستور ہو اسلئے بلا تفریق ہر قوم و مذہب کے لوگوں میں اسکو ہر دلعزیزی حاصل ہو۔

بھاولپور کی ترقیاں کون نہیں جانتا کہ آج سے پچیس برس پہلے اس ریاست کا اچھا خاصہ حصہ غیر آباد اور صحرائے ریگستان تھا۔ مگر اعلیحضرت فرمانروائے کشور بھاولپور نے اس صحرائے ریگستان کے گوشہ گوشہ میں اپنے فیض تدبیر سے خیر و برکت کی نہریں بہادیں۔

اس ریاست کے کام و دہن میں ایک اور تشنگی باقی تھی، اور وہ علم و فن کی تھی، فرمانروائے حال کی موجودہ حکومت نے اس پیاس کو بجھانے اور اس تشنگی کے دور کرنیکی جو سبیل کی وہ ریاست کے محکمۂ تعلیم کی کوششوں اور جناب پرنسپل صاحب کی رپورٹ سے ظاہر ہے، مجھے یہ سنکر بڑی خوشی ہوئی کہ اسوقت اس کالج میں تین سو سے زیادہ طالبعلم ہیں جنمیں سے دو سو کے قریب تو اسی ریاست کے باشندے ہیں۔

یہ بھی فال نیک ہو کہ ریاست کے باشندوں میں تعلیم کا ذوق پیدا ہو گیا ہو اور جیسے جیسے رعایا کا شوق بڑھتا جاتا ہو ریاست اپنی قوت کے مطابق اس سلسلہ کو پھیلا رہی ہو۔

مسئلۂ التعلیم تعلیم کا مسئلہ اس زمانے میں جو اہمیت حاصل کر رہا ہو، اس سے آپ آگاہ ہیں۔ اب کسی ملک کے تہذیب و تمدن اور ترقی کا معیار اُسکے رقبہ کی وسعت اور آبادی کی کثرت نہیں بلکہ اُسکے باشندوں میں فیصدی تعلیم کا رواج ہو، یہی وجہ ہے کہ

آج ہر ریاست اپنے حدود میں فیصدی تعلیم کی رفتار کو تیز سے تیز تر کر رہی ہو، لیکن اس سلسلہ میں ایک بہت بڑی غلطی کیجارہی ہو جو درحقیقت برطانی ہندوستان کی اندھا دھند تقلید سے پیدا ہو رہی ہو، اور یہ اُسوقت تک دور نہیں ہوسکتی جبتک تعلیم کی غرض وغایت کی تعیین نہ کی جائے۔

تعلیم کی غرض وغایت تعلیم کی اصلی غرض وغایت اگر یہ سمجھی جاتی ہو کہ لوگ لکھنے پڑھنے کا پیشہ کرنے لگیں تو یہ راستہ ملک کو تباہی کی طرف لئے جارہا ہوا ور لیجائیگا۔ جیسے جیسے ملک میں تعلیم کی مردم شماری بڑھتی جائیگی بے روزگاری کو ترقی ہوتی جائیگی اور دیہات ویران ہوکر شہروں کی آبادی روز بروز بڑھے گی، تعلیم کی غلط غرض وغایت کا نتیجہ ہندوستان میں نمایاں ہو، اوران ریاستوں میں بھی نظر آرہا ہے جہاں اسی پیرایہ تعلیم دیجارہی ہے۔

حضرات! تعلیم کی اصلی غرض یہ ہو کہ انسان میں اخلاقی اور تہذیبی پاکی پیدا ہو، اور اُسمیں یہ استعداد ہو جائے کہ وہ جس کام اور پیشہ کو کرنا چاہے اُسکو پہلے سے زیادہ خوبی اور صفائی کے ساتھ کرسکے۔ اگر کوئی کاشتکار کا لڑکا ہو تو وہ اپنی کاشت کو اور بہتر طرح سے کرسکے، اگر کسی ہنر و پیشہ سے اُسکا تعلق ہو تو وہ اپنے اُس ہنر و پیشہ کو موجودہ زمانہ کے لحاظ سے اور بہتر طریقہ سے انجام دیسکے تعلیم کی یہ غرض ہرگز نہیں ہو کہ ملک کا ہر باشندہ ہر روزگار، پیشہ ہنر اور ذریعۂ رزق کو خیرباد کہکر میز و کرسی پر بیٹھکر محرری یا افسری کے فرض کو انجام دینے لگے! اور اسطرح ایک اسٹیٹ ہی کی سرکاری ملازمت پر اس ملک کے سارے باشندوں کی شکم سیری کا بوجھ پوری طرح پڑجائے جبکہ کوئی حکومت بھی کبھی

برداشت نہیں کرسکتی، بلکہ اس سے ملک کی غربت اور افلاس میں تعلیم کی ترقی کے ساتھ ترقی لازمی ہے۔

نئی تعلیم کا نقص نئی تعلیم کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ وہ بے مقصد ہے، نہ وہ کامل مسلمان بناتی ہے نہ کامل انسان، نہ کامل عالم، اور نہ کامل ہندوستانی، نہ وہ دین کا شیدا بناتی ہے، اور نہ ملک کی خدمت کا، اور نہ وہ پیٹ کی مشکل ہی کو حل کرنا سکھاتی ہے وہ زیادہ سے زیادہ میز پر بیٹھکر کاغذات کو مرتب کرنا اور ان پر دستخط کرنیکے فن کی تعلیم دیتی ہے مگر میدانوں میں آکر جنگلوں میں جاکر اور کارخانوں میں بیٹھکر کام کرنا نہیں سکھاتی۔

ایجوکیشن کے معنی انگریزی لفظ ایجوکیشن کا ترجمہ عام طور سے تعلیم سمجھا جاتا ہے مگر ہمارے علماء میں سے امام غزالیؒ نے اور جدید علماء میں سے ہربرٹ اسپنسر نے اپنی کتاب ایجوکیشن میں یہ بات اچھی طرح ثابت کردی ہے کہ ایجوکیشن کا مفہوم انسان کو بتانا جتنا ہے اس سے زیادہ انسان کو بنانا ہے مگر ہماری درسگاہوں کا سارا زور انسان کو بتانے کی طرف ہے انسان کو بنانے کی طرف نہیں۔

تعلیم سے پہلی غرض میرے نزدیک تعلیم کی راہ میں سب سے پہلی اصلاح یہ ہے کہ اسکی بنیاد کسی غرض وغایت پر ہو۔ ہماری تعلیم کی سب سے پہلی غرض یہ ہونی چاہئے کہ اس سے ہمارے ملک وملت کی استواری ہو، ہم اچھے مسلمان، اچھے ہندو، اچھے ہندوستانی اور اچھے ملکی ہوں۔ ہماری عقیدت کا مرکز سب سے پہلے خداوند برتر کا آستانہ ہو، ہمارے دل اس نور سے روشن اور ہمارے دماغ اسکی خوشبو سے معطّر ہوں، اور ہماری زندگی کے تمام مرحلوں میں ہمارا یہ ایمان وہ چٹان ہو جس پر ہماری زندگی کے ہر کام کی بنیاد قائم ہو۔

تعلیم کی دوسری غرض اسکے بعد تعلیم کا دوسرا مقصد ہمارے اخلاق کی تعمیر، اخلاق کی مضبوطی، اخلاق کا استحکام، اور اخلاق کی پاکیزگی۔

انگریز ہندوستان پر حکومت کرتے ہیں اور یہ سچ ہو کہ اُن کی حکومت تلوار کے سایہ میں قائم ہی لیکن غور سے دیکھئے کہ ان تلواروں کی صفوں کے پیچھے اس قوم کے مضبوط کیرکٹر، مستحکم اخلاق، اپنے ملک و قوم سے سچی محبت اور اپنی قومی بقا کیلئے ہر جانی ومالی قربانی کا ولولہ ہی اُن کے وہ قلعے ہیں جنکی حفاظت میں اُنکی یہ عالمگیر حکومت قائم ہے پچھلی جنگ اور موجودہ جنگ نے اُن کے کیرکٹر کے اس پہلو کو پوری طرح روشن کر دیا ہے۔ اُن کا یہ کیرکٹر کہاں پیدا ہوتا ہے ؟ اُن کی درسگاہوں میں اور ان کے ورزشی کھیلوں میں، پھر ہماری درسگاہوں اور ورزشی کھیلوں میں یہ نتیجے کیوں نہیں ظاہر ہوتے اسلئے کہ ہم نے ایجوکیشن کا مقصد انسان کو بنانا سمجھا ہے انسان کو بنانا نہیں۔

انگریزوں کی نقالی ہمارے تعلیم یافتہ طبقوں میں انگریزوں کی نقالی فیشن کے طور پر جاری ہو میں بھی کہتا ہوں کہ اُنکی نقالی کرو، مگر یہ نقالی صرف لباس و طعام و مسکن کی نہیں ہونی چاہئے، بلکہ ان کے اندرونی بلند اخلاق، بلند عزائم، اور اعلیٰ کیرکٹر کی، ملک و ملت کی خاطر قربانی اور ایثار کی، استقلال کی، خودمختاری کی ہمت کی، اپنے ہاتھوں سے اپنے کاموں کو انجام دینے کی۔

اسراف ہمارے نوجوانوں کی اس غلط نقالی کا نتیجہ یہ ہو کہ اُنکی زندگی بیحد مسرفانہ ہو رہی ہو۔ اُن کی آمدنی اُن کے اخراجات کو پورا نہیں کرتی، اور یہی وجہ ہے کہ ملک و ملت کی راہ میں اُن سے قربانی نہیں ہو سکتی، حق و صداقت کی تائید

کے لئے اُن کے دلوں میں تڑپ نہیں پیدا ہو سکتی، کسی بڑے کام کے حصول کے لئے زحمت کشی اور تکلیف اُٹھانے کا مادہ نہیں پیدا ہوتا۔ سادگی، صفائی اور جفاکشی یہ تین باتیں اخلاق کے وہ ضروری عناصر ہیں جو طلبہ کو درسگاہوں کی چہار دیواریوں میں اور درسگاہوں سے نکل کر دنیا کے غیر محدود صحراؤں میں اُنکی کامیابی کی شرط اول ہیں۔

بجائے زیب و زینت سادگی کی خوبصورتی کے بجائے ہمارے طالبعلم زیب و زینت کے مصنوعی حسن و آرائش میں گرفتار ہیں جسکی بنا پر مردانہ اوصاف اُن سے رخصت ہو رہے ہیں اور جفاکشی کی عادت اُن میں پیدا ہونے نہیں پاتی۔

دنیا کی تعلیم عزیز نوجوانو! آپکو دنیا کے ہر علم کی تعلیم دیگئی ہے مگر خود دنیا کی تعلیم نہیں دیگئی ہے اسلئے اب آپ کو صرف اپنی ہی بھرپور دنیا کی تعلیم حاصل کرنی ہوگی میں نے کیمبرج اور اوکسفورڈ کی یونیورسٹیاں دیکھی ہیں اور ان کے حالات پڑھے بھی ہیں، انگلستان کی یہی درسگاہیں ہیں جہاں سے انگلستان کے بڑے بڑے وزیر، حکمراں، انگلستان کے سپہ سالار، انگلستان کے وزرا، اور انگلستان کے پالیٹیشن پیدا ہوتے ہیں، انگلستان کے بڑے بڑے وزیر اور سیاسی پارٹیوں کے لیڈر سب سے پہلے یہ کوشش کرتے ہیں کہ اپنے نظریوں سے ان درسگاہوں کے دل و دماغ کو آشنا کریں اور ان کی اخلاقی امداد حاصل کریں

زندگی کا نصب العین سمجھئے عزیز نوجوانو! اس زمانہ میں جب دنیا جنگ و جدل میں گرفتار ہے اور وطن پرستی کے غلط جذبہ نے اُن کو ظالم و ستمگر بنا دیا ہے اور دنیا خون کر رہی ہے۔ وقت ہے کہ آپ زندگی کے صحیح نصب العین کو سمجھیں اور اپنے کو اُس انقلاب کے خوش آمدید کے لئے تیار کریں جو ہمارے دروازہ پر کھڑا ہے۔ تغافل، تجاہل، اور انجان

بننے سے جس طرح ہمارے جسم کے اندر کی بیماری دور نہیں ہو سکتی اسی طرح ہمارے جسم کے باہر کی بیماری بھی دور نہیں ہو سکتی۔

ریاستی تعلیم میں دو نظریے ریاستی تعلیم کے متعلق میرے دو نظریے ہیں، ایک یہ کہ ہر ریاست میں اُس ریاست کی محدود طاقت کے مطابق اُسکی ہر قسم کی ضرورتوں کا انتظام وہاں کی تعلیمی درسگاہوں میں ہونا چاہئیے آپنے نہروں کا جو وسیع سلسلہ قائم کیا ہے جس نے آپکی ریاست کو پہلے سے دوچند کر دیا ہے، اُسکے لئے انجینیرنگ کی تعلیم کا انتظام یا اُس تعلیم میں سہولت کے ذرائع اس ریاست کی تعلیم کا خاص مطمح نظر ہونا چاہئیے۔ اسطرح کوئی آبادی طبی تعلیم کے بغیر صحیح و تندرست نہیں ہو سکتی اس بنا پر اگر کسی میڈیکل اسکول و کالج کا انتظام نہ بھی ہو تو ہمارے موجودہ کالج میں ایسے سائنٹفک شعبہ کی تعلیم ہونی چاہئے۔ جو ہمارے لڑکوں کو میڈیکل اسکول و کالج میں داخلہ کے قابل بنا سکے۔

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ اکثر ریاستوں میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ رعایا اپنی ہر ضرورت کیلئے اپنا سارا بوجھ ریاست کے کندھے پر ڈال کر خود الگ ہو جاتی ہے اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُس ریاست کے رہنے والوں میں اپنی مدد آپ کرنے، اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے، اپنی اجتماعی طاقت کے پیدا کرنے کا خیال بالکل مفقود ہوتا ہے، اب وقت ہے کہ اس خیال کو بدلا جائے اور لوگوں میں اپنی مدد آپ اور اپنے پاؤں پر آپ کھڑے ہونے اور اپنی اجتماعی طاقت بڑھانے کا جذبہ پیدا ہو، اور باہمی تعاون سے زندگی بسر کرنیکا خیال عملاً اشاعت پائے ریاست کی مشکلات سے عوام کو اور عوام کی ضرورتوں سے ریاست کو واقف ہونا چاہئے مجھے خوشی ہے کہ میں ایک ایسی ریاست کی درسگاہ کے ایوان میں گفتگو کر رہا ہوں جو دانشمند

اور مدبر ہاتھوں میں ہو اور جن سے ہر بھلائی کی توقع اور ہر نیک صلاح پر عمل کی پوری اُمید ہو۔

ادبی انقلاب ہندوستان کی درسگاہوں میں ایک ادبی انقلاب بھی پیدا ہوا ہے یعنی نئے ہندوستان میں یہ قوت جڑ پکڑتی جاتی ہو کہ ہماری ہر قسم کی تعلیم ہماری مادری زبان میں ہو۔ بنگال، پٹنہ، ہندو یونیورسٹی، الٰہ آباد، لکھنؤ اور خود مسلم یونیورسٹی میں بھی یہ خیال بڑھ رہا ہو، اور اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کی کوششیں کیجارہی ہیں۔ آسان اردو یا ہندوستانی ہو کیونکہ وہ ہمارے ملک کی عام زبان بن رہی ہو ضرورت ہو کہ اس زبان کی عالمگیری میں ہندوستان کی ہر آبادی برابر کی شریک ہو۔

کامیابی صرف جدوجہد سے حاصل ہوتی ہو مجھے آخر میں اپنے کامیاب طالبعلموں کو مبارکباد دینی ہو، جو سالہا سال کی محنتوں کے بعد کامیابی کے اس دروازہ پر پہونچے ہیں، جہاں ہم آج کھڑے ہو کر اُن کا استقبال کر رہے ہیں، اُنکی اس پچھلی زندگی نے اُن کو یہ اچھی طرح بتا دیا ہو کہ کامیابی صرف اُن کی جدوجہد اور ذاتی محنت سے اُن کو حاصل ملی ہو۔ اسی طرح اُن کی آیندہ زندگی میں بھی اُن کو کامیابی کا منہ دیکھنا اسی وقت نصیب ہوگا جب وہ پوری جدوجہد اور محنت سے ہر مشکل کا مقابلہ کریں گے اور اپنے ہاتھ سے اپنا دروازہ آپ کھولیں گے۔

بہاولپور کا نام اونچا کرو عزیزو! جاؤ دنیا تمہارے کارناموں کے انتظار میں ہے، جاؤ اور اپنے فرمانروا اعلیحضرت شہریار بہاولپور کے علم کے زیر سایہ بہاولپور کا نام اونچا کرو، اور اپنی کامیابی سے اُسکو کامیاب بناؤ، موقع ہے اور اس موقع کو ضائع نہ کرو۔

کھیتوں میں دے لو پانی اب بہ رہی ہے گنگا

کچھ کر لو نوجوانو! اُٹھتی جوانیاں ہیں

بھاولپور یونیورسٹی آخر میں ہز ہائنس شہریار بھاولپور کے لئے نیک دعائیں کے بعد صدر اعظم بہادر کی مدبرانہ اور وزیر صاحب تعلیم کی دانشمندانہ اور دیگر حکام تعلیم اور پرنسپل صاحب کالج کی ہمدردانہ جد وجہد اور سعی و عمل پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں اور اس دن کی امید رکھتا ہوں، جب اس ریاست کو تعلیمی خود مختاری حاصل ہوگی یعنی یہ کالج بڑھکر کسی دن "بھاولپور یونیورسٹی" بنکر کھڑی ہو جائے گی۔

اُردو زبان اور تفسیر قرآن

کے نام سے ایک کتاب کی تدوین ہو رہی ہے جسمیں ان تمام مؤلفین و مصنفین کا تذکرہ ہوگا، جنھوں نے اُردو میں قرآن عزیز کی کوئی مستقل تفسیر لکھی ہو یا کم سے کم کسی تفسیری مسئلہ پر کوئی کتاب لکھی ہو۔ لہٰذا اس امر کا اعلان کیا جاتا ہے کہ جن حضرات نے اردو زبان میں قرآن سے متعلق کوئی خدمت انجام دی ہو وہ اپنا مختصر سا تذکرہ اپنی کتب کے ساتھ روانہ فرما دیں تاکہ ہم کو اپنی کتاب میں درج کرنے کا موقع ملے۔ حضرات اہل علم و فضل سے توی اُمید کی جاتی ہو کہ وہ ضرور قرآن اور اردو زبان کی اس خدمت میں ہمارا ہاتھ بٹائیں گے۔

سید صبغۃ اللہ بختیاری (فاضل دیوبند)

معتمد دائرۂ قرآنیہ و استاذ جامعۂ دار الاسلام عمر آباد، شمالی آرکاٹ، مدراس

ندوہ کا مشرقی مطلع

از مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلماء

گذشتہ نمبر میں اس عنوان سے نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کا مضمون شائع ہوا ہے جسمیں ممدوح نے اکثر بانیان وخادمان ندوۃ العلماء کے شیخ و مرشد اور ندوۃ العلماء کے روحانی سرپرست حضرت مولانا فضل رحمان گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں آج سے پچاس برس پہلے کی حاضری کے حالات بیان کئے ہیں۔ خوش قسمتی سے اسی موضوع پر مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب مرحوم کی ایک قدیم تحریر دستیاب ہوئی، جسمیں موصوف نے اپنی حاضری کے حالات اور حضرت مولانا کے بعض ارشادات و ملفوظات قلمبند کئے ہیں۔ اہل ذوق کی ضیافت روحانی کے لئے یہ تحریر شائع کیجاتی ہے۔ "مدیر"

مجھکو حضرت مولانا علیہ الرحمہ کی خدمت میں حاضر ہونیکا بچپن ہی سے اشتیاق تھا۔ مگر یہ خیال تھا کہ بعد فراغت تحصیل علم کے حاضر ہوکر استفادہ کروں گا۔ دفعتاً لکھنؤ میں جناب ممدوح کی خبر وفات مشہور ہوئی اُسوقت اپنی محرومی پر جسقدر تاسف ہوا بیان نہیں ہوسکتا اسکے بعد معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط ہے، اسکو سنتے ہی میں نے مرادآباد کا عزم کر دیا وہاں پہونچکر معلوم ہوا کہ اشتداد علالت کی وجہ سے آپ صاحب فراش ہیں، شب کو حاضری کا موقع نہیں ملا دوسرے دن صبح کو میں حاضر ہوا، آپ پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے اور مریدین و مسترشدین کا مجمع تھا انمیں مولوی سید ظہور الاسلام صاحب بھی تھے میرے پہونچتے ہی اُنھوں نے تقریب کی اور کہا کہ یہ مولانا سید عبدالسلام صاحب کے بھانجے ہیں۔ حضرت نے میری طرف دونوں ہاتھ بڑھائے

میں نے دست مبارک پر اپنا ہاتھ دیدیا اُسوقت آپ پر کیفیت طاری تھی، آپنے اُس حالت میں جو فرمایا وہ اچھی طرح سمجھ میں نہیں آیا، مگر یہ معلوم ہوا کہ آپ فرماتے ہیں کہ دُعا درود نماز سے سب کچھ مل جاتا ہے اسی حالت میں چند اشعار پڑھے انہیں سے ایک شعر یہ تھا ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

[illegible] آپ نے [illegible] چھوڑ دیا اور میں [illegible] وہاں [illegible] گھر آیا۔

دوسری بار جب آستانہ بوسی کا اتفاق ہوا تو میرے ایک عزیز بھی میرے ہمراہ تھے ہم دونوں لکھنؤ میں طالب العلمی کرتے تھے ایک دن بیٹھے بیٹھے شوق پیدا ہوا اور انھوں نے مُرید ہونے کی تمنا ظاہر کی اس ارادے سے ہم دونوں شب کو روانہ ہوئے لکھنؤ کے اسٹیشن پر پہونچکر معلوم ہوا کہ گاڑی کی روانگی میں دیر ہے ہم دونوں سو رہے اور ایسے سوئے کہ گاڑی آئی اور روانہ ہوگئی مگر ایک دوسری ٹرین روانہ ہونے والی ہے جو کچھوچھے کے اسٹیشن پر نہیں ٹھہرتی ہنگولے میں ٹھہرتی ہے کچھ پس و پیش ہوا پھر شوق اور جذب نے اجازت نہیں دی کہ ایک دن اور ٹھہر جائیں، ہنگولے کا ٹکٹ لیکر روانہ ہوگئے، وہاں پہونچکر صبح کی نماز پڑھی اور دریافت کیا کہ کوئی سواری مل سکتی ہو یا نہیں، معلوم ہوا کہ نہ سواری ملتی ہے نہ مراد آباد کا پتا ہے نہ راستہ ہے بہت پرس و جو کے بعد معلوم ہوا کہ مراد آباد یہاں سے ۱۷۔۱۸ کوس ہے یہاں سے گنج اور گنج سے ملانواں ہوکر مراد آباد جا سکتے ہیں، اتنا معلوم ہوتے ہی ہم دونوں کمر ہمت باندھکر روانہ ہوگئے، اس سے پہلے مجھکو دو میل بھی پیادہ پا چلنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا مگر خدا جانے کیا شوق اور کس قسم کا جذب تھا کہ جب ہم ملانواں پہونچے اور تھانے کے سامنے سے گذرے تو اُسوقت دو بج رہے تھے

اثنائے راہ میں ایک مقام پر ظہر کی نماز ادا کی میں نے قبل نماز کے پانی سے استنجا کیا کلوخ لینے کی نوبت نہیں آئی اس پر میرے ساتھی نے مجکو ملامت کی اور کہا کہ میں مولانا سے تمہاری شکایت کرونگا اثنائے راہ میں مجکو خیال پیدا ہوا کہ میں حضرت سے حدیث کی سند لونگا، پھر شوق ہوا کہ حصن حصین کی اجازت حضرت کو اعلیحضرت شاہ محمد آفاق رحمۃ اللہ علیہ سے ملی ہی، مگر اس خیال سے کہ حضرت کا مزاج مبارک نہایت نازک تھا میرے دل میں پس وپیش ہو رہا تھا کہ کیونکر اسکا موقع حاصل کیا جائے عصر کا اول وقت تھا جب ہم دونوں مراد آباد پہونچے شہر کے باہر ایک پختہ کنواں تھا اُسکی جگت پر عصر کی نماز ادا کی اُسکے بعد شہر میں داخل ہوئے۔

مسجد میں پہونچتے ہی خادم نے آکر کہا کہ حضرت بلاتے ہیں میرے رفیق طریق آگے اور میں اُن کے پیچھے چلا حضرت حجرے کے سائبان میں چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے عادت کے موافق آپنے فرمایا کہ کون ہی یہ کون ہی اُنھوں نے اسکا جواب دیا مگر آپ مکرر سکرر یہی سوال فرماتے رہے، پھر پوچھا کہ یہ کون ہیں کہاں سے آتے ہیں۔ میرے رفیق نے کہا کہ لکھنؤ سے، فرمایا کہاں کے رہنے والے ہیں، انھوں نے کہا کہ رائے بریلی کے، آپنے ڈانٹا اور فرمایا کہ کبھی لکھنؤ کہتے ہو اور کبھی رائے بریلی، میں نے عرض کیا کہ میں رائے بریلی کا رہنے والا ہوں، لکھنؤ میں تحصیل علم کے لئے ٹھہرا ہوں اور وہیں سے آرہا ہوں، فرمایا کہ رائے بریلی میں کہاں رہتے ہو، میں نے عرض کیا کہ تکیہ شاہ علم اللہ رح میں۔ یہ سنکر آپنے عجیب انداز سے کروٹ بدل کر فرمایا کہ وہ تو بڑے بزرگ تھے، فرمایا کہ بیٹھو ہم دونوں بیٹھ گئے، پھر مجھسے پوچھا کہ کیا پڑھتے ہو اور کس سے پڑھتے ہو، میں نے عرض کیا کہ میں ہدایہ پڑھتا ہوں اور جناب مولوی محمد نعیم صاحب سے پڑھتا ہوں فرمایا کہ اب فرنگی محل میں وہی اکیلے رہگئے ہیں، فرمایا کہ جب ہم لکھنؤ میں تھے تو اُسوقت فرنگی محل میں

اچھے اچھے لوگ تھے اور وہ سب ہماری بہت خاطر کیا کرتے تھے۔ اسکے بعد آپنے مفتی ظہور اللہ صاحب، مفتی نعمت اللہ صاحب، مولوی نور الحسن صاحب، مولوی ولی اللہ صاحب وغیرہ کا ذکر فرمایا اور کہا کہ اللہ ان کی قبروں کو ٹھنڈا کرے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت بیعت کرنا چاہتے ہیں آپ نے دست مبارک پھیلا کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور معمولی الفاظ بیعت کے ادا فرمائے اور ارشاد کیا کہ ہر روز سو بار اسم ذات کا ذکر کر لیا کرو، آنکھ اور زبان بند کرکے دل کی زبان سے ذکر کرو اور ایک سو بار قل ہو اللہ پڑھ لیا کرو اور سورہ یٰسین بعد نماز صبح اور سورہ واقعہ بعد مغرب پڑھ لیا کرو۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت بیعت کرنا چاہتے ہیں اس پر آپکے چہرہ مبارک پر کسی قدر آثار تکدر ظاہر ہوئے پھر آپنے ہاتھ بڑھایا اور ان کو سلسلے میں داخل فرمایا۔

میں نے عرض کیا کہ مجھکو اس بات کی تمنا ہے کہ حدیث کی سند آپ سے حاصل ہو، آپنے از راہ کرم میری التماس قبول فرمائی اور مجھکو اجازت دی اور فرمایا کہ میں تمکو حصن حصین کی بھی اجازت دیتا ہوں اسکے پڑھنے سے سات سو (یا اسکے قریب قریب کوئی تعداد آپنے فرمایا) آدمی اولیاء اللہ ہو گئے ہیں۔

اسکے بعد فرمایا کہاں رہو گے مسجد میں یا مقبرے میں، میں نے عرض کیا جہاں حکم ہو، مگر میرے ساتھی نے کہا کہ مسجد میں پڑ رہیں گے، یہ سنکر مکدر ہوئے اور فرمایا کہ ہم نے مقبرے میں جگہ صاف کرا دی ہے اور کلوخ استنجا رکھوا دیے ہیں وہاں آرام ہوگا، پھر میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ علم کی غرض عمل ہے اگر عمل نہوا تو علم حاصل کرنا بیکار ہے، اولیاء اللہ جتنا پڑھتے تھے اُسپر عمل کرتے تھے فرمایا کہ شاہ مینا شرح وقایہ پڑھتے تھے جب کتاب الزکوٰۃ تک پہونچے چھوڑ دیا، اُستاد نے سمجھایا تو کہا کہ علم کی غرض عمل ہے صوم وصلوٰۃ مجھپر فرض ہے اُس کا علم

حاصل کرنا ضروری تھا زکوٰۃ مجھپر فرض نہیں جب کبھی فرض ہوگی تو اُسکے مسائل بھی سیکھ لوں گا.
اسوقت اسکا پڑھنا وقت کو ضائع کرنا ہے، یہانتک ہوا کہ آپ پر کیفیت طاری ہوگئی اور آنکھوں سے
آنسو جاری ہوگئے اور آپنے اشعار پڑھنا شروع کئے، ان میں ایک شعر یہ بھی تھا ؎

سرمہ در چشم سنائی چوں سنان تیر باد　　گر زبانی زندگی خواہد سلئے بے سنن

یہ شعر بھی آپنے پڑھا تھا ؎

کجرا دیوں تو کر کرا سر دیوں نہ جائے　　جن نینن ماں پی بسیں دوجے کون سمائے

وہاں سے اُٹھکر ہم لوگ مسجد میں آئے، حیرت یہ ہے کہ تکان سفر سے کچھ بھی ماندگی نہ تھی اُس شب کو جسقدر نوافل میں نے پڑھیں اور جس ذوق و شوق سے پڑھیں کبھی نہ پڑھی تھیں صبح کو جب رخصت ہونیکو گئے تو میرے ساتھی کو رخصت فرما دیا، میں جب آداب بجالایا تو فرمایا کہ ٹھہرو، میں مسجد جاکر ٹھہر گیا، چاشت کے بعد آپ مسجد تشریف لائے اور بیچ کے در میں بیٹھ گئے حضرت احمد میاں صاحب و مولوی عبدالکریم صاحب و حکیم عظمت حسین صاحب وغیرہ بخاری شریف لیکر حاضر ہوئے، میں بھی حلقۂ درس میں شامل ہوگیا، آپنے چھبیسویں[۲۶] پارے کے دو یا تین ورق پڑھے، باوجود کبر سنی کے چشمے کی مدد کی آپکو حاجت نہیں ہوئی، شنجرف کی روشنائی اور کلک کا قلم رکھا ہوا تھا اُس سے تصحیح فرماتے جاتے تھے جو لطف آپکے پڑھنے میں تھا وہ قابل دید تھا نہ شنید، دوسروں پر آپکے انوار باطنی کا اُسوقت انعکاس ہو رہا تھا، اور سب پر ایک کیفیت طاری تھی، بعد ظہر کے آپ پھر برآمد ہوئے اور دو ورق سے زیادہ آپنے پڑھے اور بعد عصر کے پھر آپ برآمد ہوئے اور کئی ورق آپنے پڑھے۔ اس روز آپنے بہئیت مجموعی ڈیڑھ پارہ پڑھا، لوگوں سے معلوم ہوا کہ آج آپنے غیر معمولی طور پر تین بار درس دیا ہے ورنہ

معمول ایک یا دو بار کا تھا میں اسکو اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں تیسری بار جب میں حاضر ہوا تو عصر کا وقت تھا آپ صحن مسجد سے باہر حجرے کے محاذی تشریف رکھتے تھے نہایت لطف و محبت سے آپنے شرف پذیرائی عطا فرمایا اور دیر تک اپنے حالات بیان فرماتے رہے اسی گفتگو میں آپنے شعر پڑھا ہے

دل ڈھونڈھا سینے میں کسے بوا بجھی ہو　　اک ڈھیر ہو یاں راکھ کا اور آگ دبی ہو

سلسلۂ کلام کے ختم ہونیکے بعد میں نے عرض کیا کہ مجھکو حدیث مسلسل سنائیے، آپ بہت محظوظ ہوئے اور فرمایا کہ میں نے اپنے کانوں سے شاہ عبد العزیز صاحبؒ کی زبان سے سنا ہے پھر آپنے تبسم فرمایا، ایک بار دست مبارک کو مٹی پر مارکر منہ پر پھیرا، اور پہونچوں تک ہاتھ میں مل لیا، اُسکے بعد آپنے یہ حدیث پڑھی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الراحمون یرحمہم الرحمن تبارک وتعالیٰ ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء

پھر آپنے فرمایا کہ میں تمکو حدیث مسلسل المحبۃ کی بھی اجازت دیتا ہوں اس حدیث کو بھی میں نے شاہ عبد العزیز رحمہ اللہ کی زبان سے سنا ہے

یا معاذ انی احبک نقل اللہم اعنی علی ذکرک وشکرک وحسن عبادتک

بچّہ اور تعلیم

از جناب محمد سمیع صاحب صدیقی ایم اے، بی ٹی، صدر شعبۂ انگریزی، دار العلوم ندوۃ العلماء

بچّہ کی ہستی بادی النظر میں ایک مختصر جثہ ہی اپنے اعضاء و جوارح کے لحاظ سے محض کھلونا، لیکن یہی بچہ اپنے اندر خالق مطلق کی قدرت تخلیقی کا وہ مظہر پوشیدہ رکھتا ہی جو سالکین اور مصلحین کے راستۂ سلوک پر چلکر رشد و ہدایت کی شمع روشن کرتا ہی، جو اختراعات و ایجادات کے دائرہ کو وسیع کرکے اپنی متنوع باتوں سے نوع بشر کو متحیر بناتا اور دنیا سے خراج تحسین حاصل کرتا ہے۔ کہیں مصنف ہی تو کہیں جرنلسٹ کہیں مورخ ہی تو کہیں داستان گو، کہیں ادیب ہی تو کہیں سائنٹسٹ کہیں انجینیر ہی تو کہیں ماہر ارض، کہیں اسٹیم انجن چلاکر قطعات ارض طے کرتا ہی تو کبھی ہوا میں پرواز کرکے لمحوں میں آنکھ سے اوجھل ہو جاتا ہی۔

غرض بچہ ایسی گوناگوں حیثیت رکھتا ہی اور اسکے اوپر ملک و قوم کی ترقی کچھ اسطرح منحصر ہی کہ اسکی نشوونما میں، پروان چڑھانے میں، اور تعلیم و تربیت میں ہر طبقہ فکر مند نظر آتا ہی، ماں باپ خاندان و قبیلہ، ملک و سلطنت سبھی کے لئے مرکز تفکر بنا ہوا ہی آج سے نہیں بلکہ جب سے کہ تمدن اور تہذیب کی روشنی نے جھلک دکھلائی اور بنی نوع انسان نے اپنے اشرف ہونیکا احساس کیا۔

مختلف اقوام نے اسکی تعلیم و تربیت پر کس طرح توجہ کی، آیندہ صفحات پر انکی کوششوں کا تذکرہ ہوگا، ازمنہ ماضی کے تاریخی اوراق پیش نظر رکھکر دیکھا جائےگا کہ قدیم نظریات کیا تھے اور اب ماہرین علم النفس[1] نے جو جدید نظریات پیش کئے ہیں وہ کیا ہیں اور کن اصول کے ماتحت ہیں۔

---

[1] Sychology

بچہ کی تعلیم و تربیت کے مؤثرات ذیل کے نقشہ سے ظاہر ہوتے ہیں۔

نقشہ تعلیم و تربیت
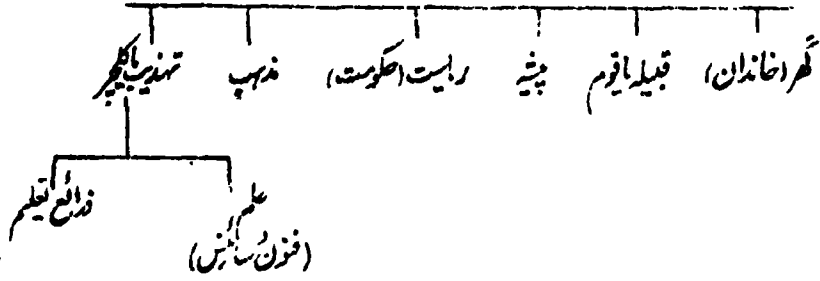
یونان علوم و فلسفہ کا سرچشمہ رہا ہے معلمین بھی اس سرزمین سے پیدا ہوئے، یہی مرکز توجہ بننے کا مستحق ہے

اسپارٹا یہ چھوٹی سی ریاست تھی، حکومت موجودہ سوشلزم کے مشابہ تھی، بچہ کی زندگی مہد سے لحد تک وقف ریاست ہوتی۔ ساری تعلیم اسی نظریہ سے دیجاتی تھی، نسلی حیثیت سے بچہ قوی و تندرست، جسمانی قوی مضبوط ہوں تاکہ سپاہیانہ زندگی میں کامیاب رہے، دشمنوں کے مقابلہ میں پیٹھ نہ دکھائے، بچہ ننگے پاؤں تاریکی میں چھوڑ دیا جاتا تاکہ خوف و دہشت قریب نہ پھٹکیں، انکو کلبوں میں شرکت کرنی پڑتی، وہاں عام غذا بہم پہونچائی جاتی تھی، یہ کلب خاص اہمیت رکھتے تھے جو بچہ کی زندگی پر بہت اثر ڈالتے تھے اور ان کی اجتماعی زندگی ایک خاص قالب میں ڈھلتی تھی، بچوں کو کم سخنی کی تعلیم دیجاتی تھی، دیوتاؤں سے خوف کرنا بتلایا جاتا تھا، دشواریوں میں ڈالا جاتا تھا، کوئی تعریف نہ کیجاتی تھی، سات سال کی عمر میں اپنی غذا کی تلاش میں خود گھومتا

SPARTHA یہ ایک آزاد ریاست تھی اسکا مشہور مقنن لائی کرگس (۹ویں صدی ق م گذرا ہے ۶۰۰ ق م تک یہ ریاست بعید عروج پر رہی موجودہ تھسلی اور قرب و جوار کا علاقہ شامل تھا۔

پھرتا تھا، چوری بذاتِ خود معیوب نہ تھی، صرف شرط یہ تھی کہ خفیہ رہے اور پکڑی نہ جاسکے۔

کسی بچہ کا قصہ ہو کہ اُسنے ایک جانور کا بچہ چُرالیا، موقع نہ مل سکا کہ لیجا سکے، فوراً لباس کے اندر چھپالیا اور موقع کا منتظر رہا، نوبت بایں جا رسید کہ جانور نے اسکے جسم کو کاٹ کر زخمی کردیا، درد سے بچہ بے چین تھا مگر زبان پر اُف تک نہ لایا، آخرش چوری میں کامیاب ہوا، اسکے اس فعل کی بیحد داد ملی۔

اس حکایت سے مقصود ان کی معاشرت اور تربیت کا اندازہ کرانا ہو کہ بچہ کے حق میں کن کن باتوں کو جائز سمجھتے تھے۔

بچے قربانگاہ کے سامنے لائے جاتے اور ضربوں سے جسمانی قوت کا امتحان کیا جاتا تھا، جو بچے برداشت کرکے نکلتے اُنھیں عطیہ دیوتا تصور کیا جاتا تھا، سن شعور کو پہونچتے تھے تو گھوڑے کی سواری سکھلائی جاتی تھی جنگی محاذ قائم کیا جاتا تھا، بچوں کی جماعتیں جنگ آزما ہوتی تھیں، اٹھارہ سال کی عمر میں "سپاہی" کا لقب ملتا تھا اور بیس سال کی عمر میں سارے شہری حقوق حاصل ہوجاتے تھے اور وہ ریاست کا ایک ذمہ دار فرد سمجھا جاتا تھا۔

بچوں کی تعلیم صرف جسمانی ہوتی تھی، شاذ حالات میں پڑھنا لکھنا سکھلایا جاتا تھا۔ اسپارٹا کے باشندوں کا خیال تھا کہ تعلیم دماغ کو کمزور بنادیتی ہو، محض خاندانی نسب نامہ، بہادری کے نغمے، دیوتاؤں سے خوف کرنا سکھلایا جاتا تھا۔ لڑکیاں ہر امور میں برابر کی شریک دار ہوتی تھیں، جنگ میں سامان جنگ بہم پہونچاتی تھیں۔ مائیں ایسے تندرست بچوں کی ماں بنتیں جو لائق سپاہی کہلانے کا مستحق ہوتا تھا۔

اس قوم کی زندگی سخت اور دشوار تھی، ساری قوم سخت گیر تھی، بحیثیت حکمراں کے

ناکام رہی، سیاست سے نابلد تھی اور عمرانیات سے جاہل، صنعت کی کوئی ترقی نہ تھی، صرف کاشت کرتی تھی۔ زمین کی تقسیم سپاہیانہ مراتب اور جنگی صفات پر کیجاتی تھی۔ اس قوم میں کوئی تعلیمی طریقہ رائج نہ تھا بلکہ انفرادیت کی نشو ونما کو پامال کرتی تھی، شخصی وقار کی قدر نہ تھی، اور نہ پیدا کیجاتی تھی جسکا نتیجہ یہ نکلا کہ اسپارٹا میں ماہرین فنون وصنعت پیدا نہیں ہوئے۔ اسکا واحد سبب انفرادیت کو فنا کردینا تھا۔ اسکے برعکس اتھنز کی حالت تھی۔

اتھنز[1] کے باشندے تجارت کو پسند کرتے تھے اور مختلف اقوام سے تجارتی معاملات رکھتے تھے اور اس اختلاط سے اُن کے خیالات، عادات رسم سے متأثر ہوئے، ہر باشندہ کو انفرادی آزادی حاصل تھی۔ کاروبار آزادی سے کرسکتا تھا مگر ریاست کے عام ذمہ داری سے جدا نہ ہوسکتا تھا طریقہ تعلیم بھی رکھتے تھے جو ابتدائی حالات میں محض پرائیوٹ تھا۔ والدین بچوں کی تعلیم وتربیت خود کرتے تھے مگر ریاست کے مفاد کو پیش نظر رکھتے تھے، قانونی گرفت سخت نہ تھی۔

ان کا تعلیمی نظریہ جسمانی اور دماغی دونوں تھا۔ جسمانی تعلیم سخت تھی، لیکن تناسب اعضاء اور حسن جوارح کا لحاظ خاص رکھتے تھے دماغی اور ذہنی تربیت محض لکھنے پڑھنے تک محدود نہ تھی جیسا کہ اسپارٹا کے تذکرے میں آچکا ہو بلکہ ادبی ذوق رکھتے تھے۔ ادبی ذوق اس پایہ کا بلند تھا کہ ان کا مشہور شاعر ہومر[2] آسمان ادب کا وہ آفتاب ہو جو آج بھی آب وتاب سے روشن ہو جسکی شعاعوں نے بعد میں آنیوالے ادبا اور شعرا کو وہ روشنی بخشی جو خود آفتاب وماہتاب بنکر چمکے، یونان اور رُوما کے مصنفین اسکے خوشہ چیں نظر آتے ہیں۔ مثلاً

---

[1] اتھنز یونان کا دارالسلطنت ہو، یہ بحر ایجین پر واقع ہے، قدیم زمانے میں مرکز علوم وفنون تھا۔

[2] HOMER درمیان دسویں وگیارھویں صدی ق م گذرا ہے۔

ارسٹافینس[1]، پلاٹس[2]، یوری پائڈس[3]، سافوکلس[4]، ورجل[5]، ٹرنس[6]، سینیکا[7] وغیرہ۔ ان سب نے اسکے نقش قدم پر چل کر ادیبانہ رنگ اختیار کیا۔ حقیقت میں ہومر میدان رزم کا خدائے سخن ہے۔ اسکی نظمیں اوڈیسی اور ایلیڈ یورپ کی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ یہ نظمیں انسان کی دو خصوصیت کی علحدہ علحدہ مظہر ہیں۔ اچیلیز[8] ایلیڈ[9] کا ہیرو عملی پیکر ہے، اولیسیس[10] اوڈیسی[11] کا ہیرو، دانائی کا نمونہ ہے۔ ٹریجیڈی کا تخیل و اصول، ایتھنز والوں نے سب سے پہلے بنائے اور بڑے نامی شعراء گذرے ہیں اسکی مفصل بحث اور تنقید ارسطو نے اپنی شاعریات (پوئیٹکس[12]) میں کی ہے۔

اسپارٹا کے طرز تعلیم کا خاکہ اوپر کھینچا جا چکا ہے ایتھنز میں جنگی یا حربیہ نظریہ بالکل بدلا ہوا تھا، امن پسندی زیادہ تھی، تجارتی زندگی نے اسمیں اور اضافہ کیا، علوم و فنون صنعت و سائنس کی طرف راغب ہوئے وہاں باشندوں کی انفرادیت قائم رکھی گئی، گھریلو زندگی بالکل آزاد تھی البتہ ریاست کی طرف سے ہدایات ہوتے رہتے تھے۔

بچہ پیدائش سے لیکر سات سال کی عمر تک آغوش مادر میں تعلیم پاتا تھا جو اسکی صحت تندرستی کی طرف توجہ رکھتی تھی نرسیں اور غلام بھی اس کام کو انجام دیتے تھے جو اسپارٹا میں معیوب تھا جہاں صرف ماں ہی اس خدمت کی ذمہ دار ہوتی تھی۔ بچوں کو ہیروؤں

۱؎ ARISTOPHENE ۴۴۴ - ۳۸۰ ق.م ۲؎ PLAUTUS ۱۸۴ ق م فوت ہوا۔
۳؎ EURIPIDES ۴۸۰ - ۴۰۶ ق م ٹریجیڈی نویس تھا۔ ۴؎ SOPHOCLES یونان کا ٹریجیڈی نویس ۴۹۶ - ۴۰۵ ق م ۵؎ VIRGIL رومی شاعر کمیڈی نویس ۱۵۹ ق م فوت ۶؎ TRENEE رومی شاعر
۷؎ SENECA ۴ ق م سے ۶۵ بعد مسیح مشہور رومی ادیب تھا۔ ۸؎ ACHILLES ۹؎ ILIAD رزمیہ نظم
۱۰؎ OLYSSEUS ۱۱؎ ODESSY (رزمیہ نظم) ۱۲؎ POETICS

اور دیوتاؤں کے قصے سنائے جاتے تھے، ایسے کھیل میں شرکت کی اجازت دیجاتی تھی جو انکی زندگی کو بہترین اخلاقی رنگت دینے میں مدد دیتا تھا، عموماً مدرسہ جانے کی عمر ۷ سے ۱۶ سال تک ہوتی تھی جو ایک معلم کے زیر نگرانی ہوتا تھا جس سے والدین کے مرتبہ کا بھی اظہار ہوتا تھا، یہ معلم اخلاقی نگرانی بھی رکھتا تھا۔

اسباق عموماً حسب ذیل ہوتے۔

(۱) قواعد (صرف و نحو)

(۲) موسیقی

(۳) جمناسٹک

انھیں کے لحاظ سے مدرسے بھی قائم تھے جسمیں بچے شریک ہوتے قواعد (صرف و نحو) میں پڑھنا، لکھنا، اور ادب شامل تھا۔ موسیقی میں گانا اور رقص سے بھی کام لیا جاتا تاکہ بچوں میں ایک قسم کا حسن مذاق پیدا ہو، جمناسٹک میں جسمانی ورزشیں شامل تھیں یہ اسپارٹا والوں سے ملتی جلتی تھیں مدرسے عموماً علم کو پھیلاتے اور اصلاح مذاق کرتے تھے، تجارت کو زیادہ مستحسن نظر سے نہیں دیکھتے تھے، فلاحت اور زمینداری بھی تھی، لیکن مشقت اور مزدوری کرنیوالوں کو حقوق شہریت حاصل نہ تھے۔

سولہ سال سے ۱۸ سال کی عمر تک باپ ہر بات کا نگراں ہوتا، بعد اٹھارہ سال کے طالب علم ریاست کی خدمت بحیثیت سپاہی کے انجام دیتا۔

ابتدائی دور میں جمناسٹک، ۷ سال کی عمر سے ۱۶ سال تک سکھلائی جاتی ۱۶ سال سے ۲۰ سال تک یعنی چار سال کی مدت دو سال عام جمناشیم میں اور دو سال فوجی تعلیم

میں صرف ہوتے۔ اس ساری تعلیم کا مطمع نظر جذبات اور احساسات پر قابو رکھنا، چال ڈھال میں وقار، اور ظاہری اور باطنی زندگی میں یکسانیت پیدا کرنا تھا۔ موسیقی یونانی نصاب کا دوسرا جز تھا۔ جمناسٹک[1] یعنی ورزش جسم کے لئے اور موسیقی روح کے لئے بہتر سمجھتے تھے شاعری تمثیل (ڈراما) تاریخ۔ فن تقریر، علوم موسیقی سب اس نصاب میں شامل ہوتا۔ اور ہر ایک کسی دیوی کی طرف منسوب کرتے جنھیں "نائن میوزز"[2] کہتے۔ شعرا کے کلام زبانی یاد کرائے جاتے جو کسی مضمار پر گاتے اور بڑی مہارت حاصل کرتے تھے۔ یہ اس غرض سے کرتے کہ دور بینی فکر، سمجھ اور شخصیت کی اچھی نشو و نما ہو، گویائی پر قدرت تامہ آجائے۔

لکھنا پڑھنا قریب ۶۰۰ ق م داخل نصاب کیا گیا۔ لکھنا محض حروف تہجی اور آواز پر مبنی تھا پڑھنے پر خاص زور دیا جاتا جو آگے چلکر فن تقریر کو کافی رونق دیتا۔

ریاضی کو ابتدائی دور میں کوئی توجہ نہیں دیگئی بلکہ رقص کو معاشرت میں اہمیت تھی۔ ان کا خیال تھا کہ جسطرح شعر کے لئے موزوں ہونا ضروری ہو جسم کے لئے رقص۔

پانچویں صدی قبل مسیح وہ زمانہ ہو کہ خطۂ یونان اپنے پورے اوج کمال کو پہونچا۔ اس زمانہ کو ایج آف پریکلز[3] کہتے ہیں۔ اس دور میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہوئیں، اقتصادی ترقی دولت کی فراوانی سے ہوئی، تجارت کو فروغ ہوا، کاروبار میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ غیر اقوام کے معلمین رکھے گئے جو پہلے بالکل ممنوع تھا، نئے خیالات قوم میں داخل ہوئے۔ قریب ۵۰۹ ق م کی نوابی طرز حکومت

---

[1] GYMNASTIC [2] یونانی عقیدہ میں یہ نو دیویاں تھیں جو شاعر اور فنون لطیفہ وغیرہ کو عطا کرتیں۔

[3] Age of PERICLES پریکلز۔ ۴۹۷۔ ۴۲۹ ق م۔ یہ جید اسٹیٹس مین ایتھنز میں گزرا ہو۔ جمہوریت کا لیڈر تھا، اور ادب صناعی کا بڑا ماہر تھا۔

گے بجائے جمہوریت قائم ہوئی، ادب میں رزمیہ نظم کے علاوہ ٹریجیڈی[1] اور کمیڈی[2] کا اضافہ ہوا فلسفہ صرف ظاہری کائنات تک محدود نہ رہا بلکہ حقیقت اور حیات باطنی پر روشنی ڈالی گئی، مذہب واخلاق کو نیا جامہ پہنایا گیا۔ قدیم عقائد کی جگہ قومی جذبات نمایاں ہوئے۔ عقلی دلائل اور قدیم عقیدے میں تصادم ہوا اور افراد خیالات و اعمال میں آزاد ہوگئے۔

۵۰۰ ق م تک تعلیم جسمانی اور ذہنی رہی ساتھ ہی فلسفیانہ مذاق بھی پیدا ہو چکا تھا۔ ایک فرقہ سوفسطائی کا پیدا ہوگیا تھا جو فن تعلیم میں مہارت رکھتے تھے یہ پہلے انسان ہیں جنھوں نے تعلیم اجرت لیکر دینی شروع کی، ان کی سوفسطائیت کا دور دورہ تھا کہ یونان کے خطہ میں سقراط[3] پیدا ہوا، فطرت نے اُسے معلم بنا کر پیدا کیا تھا، سوفسطائیت سے بیزار ہو اور صحیح تخئیل اور ذہنی مذاق جو بگڑ چکا تھا اسکی اصلاح کے لئے گلیوں اور سڑکوں پر درس دیتا تھا۔ اپنے مکالموں کے ذریعہ نوجوانوں کو محسوس کراتا تھا کہ ان کو علم غلط طریقہ پر حاصل ہوتا ہے صرف الفاظی پیچیدگیوں میں پڑنا علم نہیں، وہ کہتا تھا "اپنے کو پہچانو" صرف انسان ہی تمام چیزوں کے پرکھنے کا معیار ہے وہ یہ بھی کہتا تھا
(علم خود نیکی یا بھلائی ہے) ہر نیک عمل علم پر مبنی ہے اور ہر شخص اس علم سے اپنے تجربہ کو بڑھائے اور متلاشی ہو تاکہ علم حقیقی حاصل ہوجائے۔

یہ حکیم اپنے مکالمہ میں مخاطب کے نظریوں کو قبول کرلیتا جو رائج الوقت ہوتے اور پھر سوالوں کے ذریعہ اپنے مخاطب کو یقین کرادیتا کہ اس کا علم غلط ہے یا خام ہے اور اپنی رائے اور خیالات کو آہستہ آہستہ پیش کرتا وہ کہتا تھا کہ علم کسی خاص شخص کی میراث نہیں تعلیم کا مقصد قوت ذہنی اور تفکر کو بڑھانا ہے نہ کہ الفاظ کی بحث میں پڑنا اور علم کا رٹانا۔ اسکے قبل

---

[1] TRAGEDY تمثیلی قصہ جو ہولناک انجام پر ختم ہو [2] COMEDY تمثیلی قصہ جو مسرت و کامیابی پر ختم ہو
[3] سقراط ۴۶۹ ق م سے ۳۹۹ ق م (تک)

انفرادیت اس حد کو پہونچ گئی تھی کہ ساری اچھائی یا بُرائی اسی کی خاطر ہوتی اس حکیم نے اس حد کو توڑ کر وسیع تر بنایا تھا اور نوع بشر کو مطمح نظر قرار دیا، اسکے زمانہ میں فلسفہ اور فن تقریر کے مدرسے قائم ہوگئے تھے، پبلک میں تقریروں کے ذریعہ عوام الناس پر اثر ڈالا جاتا تھا، اس طرز نے زبان کو بیحد ترقی دی، مگر سقراط نے اپنے خاص طرز سے مقننین اور مقررین کے دل میں کھٹک پیدا کر دی جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ مجلس عامہ میں تقریروں کے بعد اس معلّم کے لئے سزائے موت تجویز ہوئی، اور اس پر نوجوانوں کے علمی اور اخلاقی بگاڑ کا الزام لگایا گیا، جو سزا تجویزات بخوشی قبول کر لی اور زہر کا پیالہ نوش جان کیا، دوسری ریاستیں دوست احباب پناہ دینے کو تیار، شاگرد بھی مصر، مگر وطن کے قوانین کی عظمت باقی رکھنے کے لئے سب کی خواہشوں پر لات ماری، روپوشی کی زندگی پر موت کو ترجیح دی۔

یہ فلسفی ۲۰ سال کی عمر میں سقراط کا شاگرد ہوا اسکے مکالمہ اور مباحث سے بیحد متاثر ہو کر تلمذ اختیار کیا۔ اس معلّم کا بھی خیال اپنے اُستاد سے ملتا جلتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ حقائق عامہ اور ذہنی ارتقاء پر بنی نوع انسان میں اتفاق ہوسکتا ہے، سقراط کے مکالمہ کی وضاحت کرتے ہوئے اضافہ کرتا ہے (اپنے نفس سے مکالمہ کرنا ہی حقیقت کی طرف لیجاتا ہے) یہ خالص جمہوریت کا قائل نہیں نظر آتا، اپنی مشہور تصنیف The Republic of Plato (جمہوریہ) میں سرآوردوں کی حکومت کی طرف مائل ہے جسمیں کچھ رنگت سوشلزم کی پائی جاتی ہے۔ ایک تخیلی سوسائٹی کا نقشہ کھینچتا ہے حسب مراتب ذیل کے طبقوں کا ذکر کرتا ہے۔

(۱) فلسفی جو سیاست داں ہوں انھیں کے ہاتھ میں زمام حکومت سپرد کرتا ہے۔

(۲) ماہرین فن جنگ کو دوسری جگہ دیتا ہے

(۳) صناع اور کاشتکاران کی بھی ضرورت دکھلاتا ہے جو معاشرت میں اہمیت رکھتے ہیں اور متذکرہ بالا طبقوں کے لئے سامان اشیا بہم پہونچاتا ہے۔

گو ایسی تقسیم دکھلاتا ہے مگر ترقی کے راستہ میں کوئی رکاوٹ مانع نہیں ہے، ہر فرد ترقی کرکے اعلیٰ طبقہ میں داخل ہوسکتا ہے وہ کہتا ہے ہر انسان میں تین صفات پائے جاتے ہیں۔

(۱) خواہش نفس۔

(۲) جذبات۔

(۳) ذہن۔

خواہشات کی اصلاح سے انسان اپنے اوپر قابو رکھ سکتا ہے جذبات کو ہمت میں تبدیل کرسکتے ہیں، مگر یہ ہمت حد سے تجاوز کرنے کے عالم میں ظلم کی طرف بڑھ جاتی ہے۔

ذہن، عقل، فراست، دانائی پیدا کرسکتا ہے، ذہن کی ترقی کو روشنی سے تعبیر کرتا ہے، جو قیاس یقین، سلوک اور معرفت کے مدارج طے کرسکتا ہے اور روح کا علم سب سے اعلیٰ درجہ کا علم ہے یہ بھی ۲۰ سال کی عمر تک وہی نصاب پسند کرتا ہے جسکا تذکرہ اوپر آچکا ہے۔ ۲۰ سال سے ۳۰ سال تک کاروباری، دنیاوی، سیاسی، جنگی خدمات کی تائید کرتا ہے۔ بعدہ ۳۵ انسان فلسفی بننے کا مستحق ہے اور ان خدمات کو پندرہ سال سے زیادہ یعنی ۵۰ سال کی عمر سے زیادہ تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔ (باقی)

حالات ندوہ

۴ر اپریل کو نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی نے اپنے خیر مقدم کا شرف بخشا کئی گھنٹے دار العلوم میں قیام رہا، اس سلسلہ میں دار العلوم اور الاصلاح کے معائنہ کے علاوہ علم و حاملین علم پر ایک مؤثر و دلنشیں تقریر فرمائی، اُمید ہو کہ آپکی یہ تقریر طلبا کے لئے آیندہ زندگی میں دلیل راہ کا کام دیگی۔

اس مہینہ الاصلاح میں کافی چہا ہمی رہی، موجودہ کا نے قانون میں اصلاح و ترمیم کی غرض سے ایک کمیٹی مقرر کی تھی، کمیٹی نے غور و بحث کے بعد ایک سودہ پیش کیا، انجمن کی مجلس خاص نے کئی نشستوں میں اس پر نظر ثانی کی، اسکے بعد مسودہ نے قانون کا درجہ حاصل کیا، ان مباحث میں طلبا کے ساتھ ارکان دوامی (لائف ممبرس) نے بھی کافی حصہ لیا۔

الاصلاح کے ان دستوری مباحث کے ساتھ (پارلیمنٹ) سوق عکاظ اور انگلش اسپیکنگ سوسائٹی کے جلسوں میں خاصی دلچسپی رہی، سوسائٹی نے OUR VOICE کے نام سے ایک رسالہ بھی نکالا ہے، بزم علم رحمانی کے جلسے روز بروز طلبا کی توجہ کا مرکز بنتے جاتے ہیں اس مہینہ قرآن مجید، تاریخ اسلام اور اردو ادب سے متعلق کئی پر مغز مقالے پڑھے گئے۔

ذہنی اصلاح، دینی تربیت اور فکر اسلامی کی نشر و اشاعت کی غرض سے پچھلے مہینہ

الدعوۃ والارشاد کے نام سے ایک نیا حلقہ قائم ہوا ہے، ابتک اس سلسلہ میں تین جلسے ہوچکے ہیں پہلے جلسہ میں راقم الحروف نے ہندوستان کے اصلی فاتح کے عنوان سے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے حالات بیان کئے، دوسرے اجتماع میں مولوی ابوالحسن علی نے مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کے مصلحانہ کارناموں کا ذکر کیا، تیسری نشست میں مولوی محمد ناظم نے حضرت شاہ ولی اللہؒ کے علمی و عملی فیوض و برکات کا ذکر کیا۔ اُمید ہے کہ یہ مجلس آیندہ بہت مفید ثابت ہوگی۔

ان علمی جدوجہد کے ساتھ جسمانی ریاضت کی جانب بھی خاصی توجہ ہے، اس مہینہ میں ہاکی، فٹ بال اور والی بال کے کئی میچ ہوئے، صبح کے وقت استاذ عربی کی رہنمائی میں ڈرل ہوتی ہے، پچھلے مہینہ سے تیراکی اور کشتی رانی بھی شروع ہوئی ہے، اس سلسلہ میں ابھی حال میں ایک مقابلہ بھی ہوا، صحت کے تدریجی اندازہ کے لئے ہر مہینہ وزن کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔

معین الندوہ کی توسیع و ترقی کے لئے جدوجہد ہو رہی ہے، چند دن ہوئے مولوی حامد علی صاحب ندوی ناظم معین الندوہ بریلی کے دورہ سے واپس آئے ہیں۔ ہم قاضی صبیح الدین صاحب، چودھری احمد یار صاحب، پروفیسر محمد نسیم صاحب، ڈاکٹر مبارک شاہ صاحب، منشی جمیل احمد صاحب، مولوی خلیل الرحمن محمد اشرف صاحب، قاضی ذاکر حسین صاحب کنٹرکٹر، ارشد حسین صاحب وکیل، قاضی فصیح الدین صاحب اور جناب اسرار علی خاں صاحب ایڈوکیٹ کے شکرگزار ہیں کہ انھوں نے ندوہ کی آواز کو سنا، اسکے پیغام کی اشاعت کی اور اسکے لئے امداد و اعانت کی راہیں نکالیں۔

گذارش احوال

دار العلوم ندوۃ العلماء ایک دینی درسگاہ ہے جہاں بچوں کو اسلامی تربیت کے
تہ موجودہ ضرورت کے ماتحت عربی و انگریزی قدیم و جدید علوم کی مناسب تعلیم
تی ہے، تاکہ بچے دین کی منزل تک پہنچنے میں دنیا کی رہگذر کو بھی عزت کے
تھ طے کریں اور دوسروں کے لئے مشعل ہدایت اور نمونہ تقلید بنیں
آپ ایسے تعلیمی ادارے اور اس قسم کی تربیت گاہ کو مسلمانوں کے لئے
ید و ضروری سمجھتے ہوں اور دار العلوم کی ان خدمات سے جو ندوی حضرات
صورت میں جلوہ گر ہیں مطمئن ہوں تو ہمیں حق پہنچتا ہے کہ ہم آپ سے
البہ کریں کہ آپ حسب حیثیت اپنی گاڑھی کمائی کا تھوڑا سا حصہ
ں ادارے کے بھی نذر کر دیں۔ اور اپنے بجٹ میں ترقی تعلیم و بہتری
بیت کی ایک مد قائم کر دیں۔

اس تجویز کو عمل میں لانے کی بہترین صورت یہ ہوگی کہ آپ ہر ماہ اس رقم کو بذریعہ
ں آرڈر یا بصورت ٹکٹ ڈاک ناظم معین الندوہ بادشاہ باغ لکھنؤ کے پتہ
ھیجدیجئے۔ ان تمام حضرات کی خدمت میں جو صہ سالانہ یا ۸ ماہوار دینگے
الہ الندوہ بلا معاوضہ حاضر ہوگا تاکہ اُن کو معلوم ہوتا رہے کہ اُن کی رقم
ں کام پر صرف کی جا رہی ہے اور اس کے نتائج کیا ہیں۔

ناظم معین الندوہ

Regd. No. A-596.

خوشخبری

ہم کارخانہ کے سرپرستوں کو خوشخبری دیتے ہیں

کہ ہمارے یہاں اور مڈل امتحانات الہ آباد اور لکھنؤ یونیورسٹی نیز

اعلیٰ قابلیت کی تمام کتابیں مستند اور معتبر شرحیں، خلاصے اور

متعلقہ تمام امدادی کتابیں جو مقابلتہً سب جگہ سے عمدہ ہیں،

موجود ہیں اور نسبتاً مناسب نرخ پر مہیا کرتے ہیں۔ آپ

لائبریری کی کتابوں کے ساتھ یہ بھی طلب فرما سکتے ہیں،

اگر ضرورت ہو تو ان امتحانات کی کتابوں کی فہرست

طلب فرمالیں

منیجر صدیق بکڈپو امین آباد پارک لکھنؤ

پبلشر حامد علی ندوی، پرنٹر بانکے لال سکینہ، مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ

مجلس ندوۃ العلماء کا ماہوار رسالہ

الندوہ

(6)

جس کا مقصد

مسلمانوں کی تعلیمی اور تعمیری خدمت ہے

مرتبہ

سید ابو الحسن علی ندوی

استاذ تفسیر و ادب

عبد السلام قدوائی ندوی

استاذ تاریخ و اقتصادیات
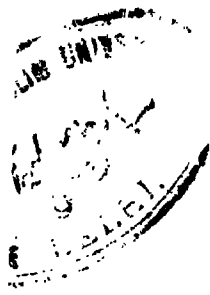
زیر نگرانی

علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ

جلد ۱ جمادی الاول ۱۳۵۹ھ مطابق جون ۱۹۴۰ء نمبر ۶

قیمت فی پرچہ تین آنے　　　سالانہ دو روپے

تمام خط و کتابت اور ترسیل زر حامد علی ندوی منیجر رسالہ الندوہ بادشاہ باغ لکھنؤ کے پتہ پر ہونی چاہیے

شذرات

الندوہ کے اجراء سے مخلصین ندوہ کی توجہ ایک بار پھر دارالعلوم اور رسالہ کی فلاح و ترقی کی جانب مبذول ہوگئی ہے، ہمارے دیرینہ کرم فرما مولانا محمد عمر نعمانی لکھتے ہیں کہ:-

"الندوہ کی توسیع اشاعت کے سلسلہ میں میرے خیال ناقص میں یہ مناسب ہو تا کہ طلباء قدیم ندوہ کی فہرست مرتب کرکے ندوین کو انکی خریداری پر آمادہ کیا جائے نیز انھیں یہ لکھا جائے کہ وہ جا بجا معین الندوہ کی شاخیں قائم کرکے ارباب علم کو ندوہ کی امکانی امداد اور الندوہ کی خریداری کیلئے آمادہ کریں۔ اگر اسقدر تکلیف طلباء قدیم ندوۃ العلماء گوارا کریں جو انھیں ضرور گوارا کرنا چاہئے کیونکہ یہ انکی درسگاہ سے وفاداری اور کشت علوم و فنون کی آبیاری ہوگی۔ تو الندوہ کی توسیع اشاعت کی بہت بڑی توقع ہے۔ تین سو سے زائد خریدار تو طلباء قدیم ندوہ ہی سے ہو سکتے ہیں انشاءاللہ العزیز کیا ہمارے ندوی دوست اس تجویز پر غور فرمائیں گے؟"

عربی مدارس کی ضرورت و اہمیت اور ان کی از سر نو تنظیم سے متعلق پچھلے مہینے ان صفحات میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا تھا بعض دوستوں نے اسے بیحد پسند کیا، لیکن ضرورت ہے کہ اس بارے میں جلد عملی جد و جہد کا آغاز ہو تاکہ منتشر اجزاء ایک سلسلہ میں منسلک ہوں اور زمانہ کے اس انقلاب انگیز دور میں کشتی ملت کی ناخدائی کا سامان ہو سکے۔ ہمیں اُمید ہو کہ عربی مدارس کے منتظمین اس جانب خصوصیت سے توجہ فرمائیں گے۔

مسلمانوں کی نگوں بختی کے باوجود عربی زبان اب بھی زندہ ہو اور دنیا کے ایک وسیع

رقبہ میں بولی اور سمجھی جاتی ہو اسلئے ضرورت ہو کہ اس کی تعلیم ایک زندہ زبان کی طرح دیجائے لیکن افسوس کہ قدیم نصاب تعلیم کی ترتیب میں یہ نکتہ ملحوظ نہیں رکھا گیا، روزمرہ کی زندگی میں نظم سے کہیں زیادہ نثر کی ضرورت پیش آتی ہو لیکن نصاب قدیم کے مرتبین نے اس ضرورت کا بالکل خیال نہیں کیا، نظم کی چند کتابیں تو کسی نہ کسی طرح پڑھا دی جاتی تھیں لیکن نثر میں بچوں کے لئے نفحۃ الیمن کی مخرب اخلاق حکایتوں اور حریری کی فنی عبارتوں کے سوا کسی اور معقول ادبی کتاب کی ضرورت محسوس نہیں کیگئی بچہ لطف یہ کہ مذکورۂ بالا خرابیوں کے ساتھ ان دونوں کتابوں کے درمیان تدریج کا بھی کوئی لحاظ نہیں کیا گیا۔

ندوہ نے نصاب تعلیم کی اصلاح کا ارادہ کیا تو اس بنیادی خرابی کی طرف بھی توجہ ہوئی نفحۃ الیمن کے بجائے مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہٗ نے دروس الادب کا سلسلہ مرتب کیا، جس میں معلومات میں اضافہ اور عربی زباں دانی کی ترقی کے ساتھ اخلاقی و دینی تربیت کا بھی خیال رکھا گیا ہو، لیکن اونچی جماعتوں کے لئے اسکے بعد ایک اور مجموعہ کی ضرورت تھی کچھ عرصہ تک مصر کے بعض منتخب مجموعے درس میں داخل رہے، لیکن ان میں ہندوستان کی مخصوص ضروریات یہاں کے خاص ماحول اور ہندوستانی طالب علموں کے ادبی معیار کا کوئی لحاظ نہ کیا گیا تھا اور نہ ایسا ممکن تھا اسلئے تجویز ہوئی کہ فوراً ندوہ کی طرف سے ایک مجموعہ تیار کیا جائے۔ یہ خدمت ہمارے دوست مولوی ابو الحسن علی صاحب کے سپرد ہوئی۔ دو برس کی محنت کے بعد متوسط جماعتوں کے لئے مختارات کے نام سے ایک مجموعہ تیار ہو گیا ہو اور آجکل ابنا شرف الدین بمبئی کے زیر اہتمام خوبصورت ٹائپ میں طبع ہو رہا ہے۔

جامعہ ازہر

از مولانا محمد عمران خان صاحب ندوی ازہری نائب مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء

۳

ازہر کی اصلاح و ترقی ذیل میں ہم ان عمائدین واکابر کا ذکر کرینگے جنھوں نے ازہر کی اصلاح و ترقی میں کسی حیثیت سے بھی حصہ لیا ہے۔

سنہ [illegible] میں حاکم بامر اللہ نے بڑی منافع کی جائداد وقف کی جسکا سالانہ منافع ۱۶۷ دینار تھا، اور ازہر کی مرمت و تجدید کی گرانقدر اوقاف ہبہ کئے۔ اور ازہر سے متصل طلبہ کے رہنے کے لئے ہوسٹل بنایا جسکو مصر کی اصطلاح میں رواق کہتے ہیں طلبہ اور علماء کیلئے مرتب طور پر مصارف قیام و طعام جاری کئے جس سے وہ یکسو اور مطمئن ہوکر علم کے حصول میں مصروف رہیں خلفاء فاطمیین میں المستنصر باللہ اور الحافظ لدین اللہ کے زمانہ میں بھی ازہر کی کلیۃً اصلاح و ترمیم ہوئی۔

سنہ ۶۶۵ھ میں ملک ظاہر بیبرس کے زمانہ میں امیر عز الدین نے ازہر کی کافی اصلاح کی قریباً ایک صدی کی بے پروائی سے ازہر کا ایک حصہ گر گیا تھا۔ گرے ہوئے حصہ کو دوبارہ تعمیر کیا۔ دیواریں بلند کیں، اسکی چھتوں کی اصلاح کی، نئے اوقاف کے ساتھ ساتھ قدیم اوقاف جو ضبط کرلئے گئے تھے وہ بھی واگذار کئے۔

سنہ ۷۰۲ھ میں سلطان محمد بن قلاوون کے عہد میں مصر میں شدید زلزلہ آیا تھا اسکی باعث ازہر کی عمارت کا جو حصہ گر گیا تھا اسکی مرمت کے ساتھ ساتھ ایک حصہ کا مزید اضافہ کیا۔

سنہ ۷۰۹ھ میں امیر علاء الدین طیبرس نے ازہر کی غربی جانب ایک حصہ کا مزید اضافہ کیا جو مدرسہ طیبرسیہ کے نام سے مشہور ہوا اسکے جوار میں وضو خانہ اور سقایہ بنایا فقہ شافعی کا درس جاری کیا، سنگ مرمر جو عمارت میں لگا تھا اسپر خوبصورت نقش و نگار بنائے، اسکی چھت پر سونے کا کام بنوایا، الغرض مسجد غیر معمولی

طور پر خوبصورت ہوگئی۔

جب تعمیر کے کام سے فراغت ہوئی تو مصارف کا حساب پیش کیا گیا، حساب پیش ہونے پر ایک طشت میں پانی منگوایا اور تمام حساب کے کاغذات کو پانی سے دھو ڈالا اور کہا شئی خرجنا عنه لله لا نحاسب علیه

٧٢٥ھ میں قاہرہ کے محتسب (کوتوال) قاضی نجم الدین اسعردی نے ازہر کی عمارت میں تجدید کی۔

٧٤٠ھ میں امیر علاء الدین اقبغا نے الملک الناصر محمد بن قلاوون کے عہد میں ازہر کے شمالی دروازہ کی جانب ایک عمارت کا مزید اضافہ کیا جو مدرسہ اقبغاویہ کے نام سے مشہور ہوا اور اسکے بازو میں ایک قبہ اور ایک منارہ گڑھے ہوئے پتھر کا بنایا اور یہ پہلا منارہ تھا جو مصر میں پتھر کا بنایا گیا اور اس عمارت میں ایک درس فقہ شافعیہ کا اور ایک درس فقہ حنفی کا جاری کیا۔ اس مدرسہ میں چند صوفیہ مقرر کئے اور ایک انکا شیخ مقرر کیا، ایک جماعت قاریوں کی مقرر کی اور ازہر کے لئے دوکانوں اور گاؤں کی صورت میں بہت سے اوقاف وقف کئے۔

٧٦١ھ میں سلطان الملک الناصر حسن بن محمد بن قلاوون کے عہد میں امیر سعد الدین بشیر نے ازہر کی دیواروں اور چھتوں کی درستگی کرائی اور ازہر کے قبلی دروازہ پر ایک مکتب یتامیٰ اور مساکین کو قرآن کی تعلیم دینے کے لئے بنایا اور غریب طلبہ کے لئے کھانا جاری کیا جو روزانہ صبح و شام پکایا جاتا تھا اسی عمارت میں ایک درس فقہ حنفی کا بھی جاری کیا اور ان کاموں کے لئے غیر معمولی اوقاف وقف کئے۔ ٨٠٠ھ میں ازہر کا منارہ گر گیا، سلطان برقوق نے اسکو دوبارہ تعمیر کرایا اور اسکی بلندی میں اضافہ کرایا۔

٨١٧ھ میں یہ منارہ عمارت میں سقم رہ جانیکی وجہ سے گر گیا، امیر تاج الدین الشوبکی گورنر قاہرہ نے ملک مؤید کے زمانہ میں اسکو دوبارہ تعمیر کیا۔

٨٤٤ھ میں ملک ظاہر جقمق کے عہد میں جوہر قنقبائی نے ازہر کے شرقی جانب ایک عمارت کا اضافہ کیا، جو مدرسۃ الجوہریہ کے نام سے مشہور ہوا، علوم کے لئے مدرس اور قرآن کے پڑھانے کے لئے

زمانہ میں موجود ہیں مقرر کئے۔

سنہ [illegible]ھ میں عبد الرحمن کتخدا نے نصف کے قریب ازہر کی عمارت میں اضافہ کیا اور یہ وہ حصہ ہے جو قدیم ازہر کے شرقی جانب واقع ہے اور اسمیں منبر اور محراب بنائی اور جو اب قبلہ جدیدہ کے نام سے موسوم ہے نیز ایک بڑا دروازہ بنایا جو اب باب الصعائدہ کے نام سے مشہور ہے اندر اسکے بہت غیر معمولی وسعت رکھی اور اسکے رواق بنائی جو رواق الصعائدہ کہلاتی ہے بعض دوسری رواقیں بھی تعمیر کیں جو رفتہ رفتہ اب ہوگئے ازہر میں

سنہ [illegible]ھ میں موجودہ خاندان شاہی کے مورث اعلیٰ محمد علی پاشا اکبر جب مصر کے والی ہوئے تو ان کی توجہ بھی ازہر کی طرف مبذول رہی علماء کے مشورہ سے ازہر کو مزید ترقی دی اور محمد علی پاشا نے سب سے پہلا وفد جو مدارس طبیہ کے لئے فرانس تعلیم کی غرض سے بھیجا اسمیں ایک ازہری شیخ رفاعہ بک کو دیا جنہوں نے واپسی کے بعد امت مصریہ کو اپنی تالیفات تراجم اور اپنی تعلیم سے غیر معمولی فائدہ پہنچایا، اور صحیح معنی میں وہ اپنے وقت کے شیخ المترجمین اور امام المؤلفین تھے خاندان علویہ کے دوسرے سلطانوں اور والیوں نے بھی ازہر کو اپنی عنایتوں سے محروم ہونے نہ دیا، ملک فواد مرحوم سابق شاہ مصر کی کوششوں اور عنایتوں کو ازہر کی ترقی میں بڑا دخل ہے اور حق یہ ہے کہ ازہر جس ترقی اور عروج کے دور سے گذر رہا ہے اسکی اصلی بنیاد بادشاہ مرحوم ہی کے عہد میں ازہر کے موجودہ شیخ الازہر فضیلۃ الاستاذ الاکبر مصطفیٰ المراغی کی کوششوں سے پڑی ہے۔

مصر کے موجودہ بادشاہ جلالۃ الملک فاروق الاول کی بھی شاہانہ عنایتیں ازہر پر ہمیشہ رہتی ہیں ابھی سال گذشتہ سے پیوستہ شاہ موصوف نے ساٹھ ہزار مصری پونڈ کی رقم اس غرض سے اپنی جیب خاص سے منظور فرمائی ہے کہ ازہر میں سارا فرش سنگ مرمر کا بچھا دیا جائے اور اسکے بعد ازہر کے موجودہ فرش کو اٹھا کر چٹائیوں کا جو مصر کے بنے ہوئے اعلیٰ درجہ کے قالین اسپر بچھا دیے جائیں۔ قالین کے مصارف قریباً ستر ہزار پونڈ اس ساٹھ ہزار رقم کے علاوہ ہیں جو سنگ مرمر بچھانے میں صرف ہوں گے۔ یہ ذہن میں رہے کہ مصری پونڈ کی قیمت [illegible] کے قریب ہے۔

(باقی)

منطق استقرائی اور مسلمان

از
محمد اویس ندوی نگرامی رفیق دار المصنفین

اسمیں کوئی شک نہیں کہ منطق کی ایجاد و تدوین کا سہرا یونانیوں ہی کے سر ہے لیکن اہل یورپ کا خیال ہے کہ منطق کی ایک قسم یعنی منطق استقرائی کی ایجاد و تدوین کا شرف انہیں کو حاصل ہے وہ راجر بیکن فرانسس بیکن اور مل کو اس منطق کا امام مانتے ہیں۔

الفرڈ ویبر تاریخ فلسفہ ص۲۲۵ پر لکھتا ہے! (دار الترجمہ جامعہ عثمانیہ)

"عیسائی مدرسوں کی تعلیم صرف منطق صوری کی بحثوں تک محدود تھی، ذہن بحث میں خوب مشاق ہو جاتا تھا مگر فطرت کے حقیقی علم کی طرف سے بالکل بیخبر رہتا تھا تیرھویں صدی میں ایک فرانسسکن راہب روجر بیکن جو آکسفورڈ میں معلم تھا اس نظام تعلیم کے خطرناک نتائج سے آگاہ ہو گیا، اور تجربہ و مشاہدہ کے علوم کو تعلیم میں داخل کر کے اسکی اصلاح کا خیال اس کے دل میں پیدا ہوا۔"

یہی مصنف ص۲۸۵ پر لکھتا ہے۔

"انگریزی عقل سلیم جس نتیجہ پر پہونچی وہ یہ تھا کہ استخراجی تخیل اور لغو قیاسی استدلال کو ترک کر دینا چاہئے، اور مشاہدہ و استقرا سے کام لینا چاہئے! روجر بیکن نے تیرھویں صدی میں اس یقین کا اظہار کیا، جس کے بعد اسکے ہمنام فرانسس بیکن کی تصانیف نے اس کا اعلان کیا!

ہم کو بوجوہ اہل یورپ کے اس دعوی سے اختلاف ہے۔

اول تو یہ کہ یونانی منطق، استقرا کے ذکر سے خالی نہیں ہے! جرمنی فاضل ڈاکٹر ولیم نیسل اپنی کتاب مختصر تاریخ فلسفہ یونان ص۱۵۳، پر لکھتا ہے! (دار الترجمہ جامعہ عثمانیہ)

"اسلئے ارسطو کے نزدیک محدود معنوں میں حکمت اسپر مشتمل ہو کر جزئی کو کلی سے اور معلول کو اسکے علل سے ماخوذ کیا جائے لیکن انسان کی زندگی میں علم کا حصول معکوس سمت سے شروع ہوتا ہی روح اپنی فطرت حافظہ میں تمام علم کا امکان رکھتی ہے، اور اس حد تک بالقوی تمام علم اسکے اندر ہو لیکن حقیقت میں اسکو علم تدریج حاصل ہوتا ہے یقینی علم ہمیں آغاز میں نہیں ملسکتا ہمیں انفرادی شاہدات سے کلی تجرآت کی تحدید کرنی پڑتی ہے، اور قدم بقدم حافظے کی مدد سے ادراک سے تجربہ اور تجربے سے علم کیجانب بڑھنا پڑتا ہے آگے چل کر لکتا ہے!

"ارسطو کی منطق ثبوت کے ساتھ ساتھ استقرا سے بحث کرتی ہے لیکن ان دونوں سے پیشتر وہ قیاس استخراجی سے بحث کرتا ہے!"

غیروں کی شہادت سے قطع نظر ارسطو سے لیکر اسوقت تک یونانی منطق پر جو کچھ لکھا گیا ہو وہ خود ہمارے سامنے ہے اسمیں عام طور سے قیاس کے ساتھ استقرا اور تمثیل کو بھی طریقہ استدلال مانا گیا ہو. یونانی منطق کے طرق استدلال ملاحظہ ہوں . !

(۱) اگر کلی سے جزئی پر استدلال کیا گیا ہو، تو اس کو قیاس کہیں گے، مثلاً کہا جائے کہ ہر انسان حیوان ہو، زید بھی انسان ہو! اسلئے زید بھی حیوان ہو! دیکھو چونکہ زید ایک کلی (حیوان ناطق) کے ماتحت ہو اسلئے جو حکم اسپر لگا وہی اسکی جزئی کیلئے بھی ثابت ہوا. اسی کو قیاسی یا استخراجی منطق کہتے ہیں.

(۲) استدلال اگر جزئی سے کلی پر ہو، مثلاً زید، خالد، عباس اور دوسرے انسانی افراد میں مادہ نطق دیکھکر، ایک حکم لگایا گیا کہ ہر انسان ناطق ہے. یہ استقرا ہے اور اسی کو استقرائی منطق کہتے ہیں

(۳) اگر استدلال جزئی سے جزئی پر ہے تو اسکو اہل منطق کی اصطلاح میں تمثیل اور فقہاء اسلام کی اصطلاح میں قیاس کہیں گے! مثلاً شراب حرام ہے، اور حرام ہونیکی علت نشہ ہو. نیند میں بھی نشہ ہے پس نیند بھی حرام ہے!

(یہ واضح رہے کہ مسلمانوں کے یہاں، قیاس ان کے ابتدائی دور ہی میں دلیل کی ایک قسم تسلیم کیا جا چکا ہو، یونانی منطق کی تمثیل سے یہ ماخوذ نہیں ہے)

ان تصریحات سے معلوم ہو گیا کہ یونانی منطق میں استقرا کا ذکر موجود ہو، ہاں اسکے اصول و آئین یہاں مرتب نہیں ہیں، ہمارے نزدیک اسکی وجہ یہ ہو کہ یونانی اہل منطق استقرا تام کو (وہ استقرا جو اپنے تمام جزئیات کو شامل ہو) جسکو وہ قیاس مقسم کہتے ہیں، قیاس میں شامل کرتے ہیں! قیاس کے قوانین مرتب موجود ہی تھے اسلئے استقرا تام کے آئین ترتیب دینا تحصیل حاصل تھا۔

باقی رہا استقرا ناقص (وہ استقرا جو اپنے تمام جزئیات پر حاوی نہیں ہو) وہ ان کے نزدیک مفید نہیں تھا، غالباً اسی لئے اسطرف توجہ نہ کی گئی!

بہر حال وجہ کچھ بھی ہو ہم کو اسکا اعتراف کرنا پڑیگا کہ نفس استقرا کے وجود کے بعد استقرا کے مباحث پر جس تفصیل کے ساتھ آج ہمارے سامنے ذخیرہ موجود ہی یونانی منطق اس سے خالی ہو! لیکن سوال یہ ہے کہ جو کچھ آج اس سلسلہ میں موجود ہی، وہ یورپ کے دماغ کا نتیجہ ہو یا اسمیں کوئی دوسرا ذہن کام کر رہا ہو!

دلائل کے ساتھ ہمارا دعویٰ ہو کہ استدلال میں استقرا سے باقاعدہ کام لینے والے سب سے پہلے مسلمان ہی تھے! ان کا مذہب اپنی تعلیمات کو محض مسلم دعویٰ کی حیثیت سے نہیں پیش کرتا تھا! یہ ہر حکم کو دلائل سے مدلل کرتے تھے، ہر تعلیم کو صداقت و حقانیت کے معیار میں اتارنے کیلئے اہل فکر و بصیرت کو جانچنے اور پرکھنے کا موقع دیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں کو استقرا کی بحث کو فنی حیثیت دینے میں کوئی مشکل نہ پیش آئی۔

مسلمانوں کے برخلاف دوسری قوموں کے اصول وہ مذہبی ہوں یا غیر مذہبی! مسلمہ دعویٰ کی حیثیت رکھتے تھے، وہ ان کو دلائل و براہین کی روشنی میں دیکھنا ہی نہ چاہتے تھے، یہی چیز آخر میں انکے خلاف ایک ذہنی انقلاب کا باعث ہوئی!

ڈاکٹر ہیرلڈ ہوفڈنگ تاریخ فلسفہ جدید اول ۱۸۹۴ء میں لکھتا ہے:۔ (دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ)

"پندرھویں اور سولھویں صدی کے دوران میں ایک نئی منطق کی ضرورت کا احساس ترقی کرتا رہا، اس ضرورت سے منطق کی اصلاح کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا، پیش نامے اور تجاویز شائع کیجاتی تھیں کہ اب قدیم منطق کی جگہ کیا رکھنا چاہئے، جبکہ معلوم ہوگیا ہے کہ یہ اور کسی کام کی نہیں سوائے اسکے کہ مسلم اور مستند مقدمات سے صوری نتائج اخذ کرے! ازمنہ متوسطہ میں منطق سے یہ کام لیا جاتا تھا کہ دینیات اور نظریہ حقوق کی حمایت کرے اور ان دونوں میں مقدمات مسلم اور مستند شمار ہوتے تھے؛

اسوقت جبکہ یورپ اپنے لئے ایک خاص نظام استدلال کی تلاش میں ہر طرف تشنہ لب دوڑ رہا تھا ٹھیک اسی وقت مسلمانوں کے یہاں علم و فضل کے دریا لہریں لے رہے تھے، ہر چیز عقل و فہم کی روشنی میں دیکھی جارہی تھی، ہر بات دلیل کی ترازو میں تولی جاتی تھی اور اصول و قانون میں قیاس کے ماتحت استقرا کا مکمل نظام تیار ہوچکا تھا۔ خود محققین اہل یورپ کو اس کا اعتراف ہے۔

ڈاکٹر گستاؤلی بان، تمدن عرب ۱۸۸۴ء میں لکھتا ہے:۔

"تجربہ اور مشاہدہ کو اقوال اساتذہ کی روشنی کے مقابلہ میں تحقیقات علمی کے اصول قرار دینا، عموماً بیکن کی طرف منسوب کیا جاتا ہے لیکن اسوقت تسلیم کرلینا چاہئے کہ اسکے موجد عرب تھے!

یہی مصنف پھر لکھتا ہے:۔

"موسیو سیدیو لکھتے ہیں، دارالعلوم بغداد کی تعلیم میں بڑی بات یہ ہے کہ اسکی طرز استدلال بالکل علمی اصول پر مبنی تھی، یعنی معلوم کے ذریعہ سے غیر معلوم کو دریافت کرنا، حوادث کا درست مشاہدہ کرکے ان معلولات کے ذریعہ سے علل کو نکالنا ان ہی قضایا کو ماننا جو تجربہ سے ثابت ہوچکے ہیں، یہ ان اساتذہ کے اصول تحقیق تھے! نویں صدی کے عربوں کو یہ پرنتائج طریقہ تحقیق معلوم تھا جو سالہائے دراز کے بعد ہمارے حال کے محققین کے ہاتھوں بڑی بڑی اکتشافات اور ایجادوں کا آلہ بن گیا۔

ابتک ہم نے یہ ثابت کیا ہو کہ نفس استقرا یونانی منطق میں موجود ہو، نیز یہ کہ یورپ سے پیشتر مسلمان اسکا نظام و آئین اپنے پاس رکھتے تھے! اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یورپ اپنی موجودہ استقرائی منطق میں مسلمانوں کا شاگرد بھی ہے! ہم سب سے پہلے اس سلسلہ میں خود محققین یورپ کی شہادت پیش کریں گے!

الفرڈ ویبر کی زبانی آپ شروع ہی میں سُن چکے ہیں کہ یورپ میں استقرائی نظام کے بانی روجر بیکن اور فرانسس بیکن ہیں اب یہ بھی سنئے کہ یورپ کی استقرائی منطق کے یہ امام کہاں کے خوشہ چیں ہیں۔

ایس، پی، اسکاٹ (Scott) اخبار الاندلس جلد سوم ص۴۲۲ میں رقمطراز ہے:۔

"مسلمانان اندلس کے سائنس سے سب سے زیادہ مستفید ہونیوالے اور سب سے بڑے ناشر یہ تین عیسائی تھے! البیر ٹس مگنس اسقف راسٹون، رابرٹ گراسٹیٹ اسقف لنکن، روجر بیکن پروفیسر اکسفورڈ یونیورسٹی، یہ تینوں تیرھویں صدی میں گذرے ہیں۔

ڈاکٹر گستاؤلی بان تمدن عرب ص۵۱۰ میں لکھتا ہے:۔

"راجر بیکن، پیا کالیوناڈ، ویل نوکا آرنو، ریمانڈلل، سینٹ ٹامس، البرٹ قسطلہ کا انفاس دہم، یہ سب یا تو عربوں کے شاگرد تھے، یا ان کی تصنیفات کے نقل کرنیوالے۔

ایک عیسائی مؤرخ. نوفل طرابلسی اپنی کتاب صناجۃ الطرب فی تقدمات العرب میں اس مسلمان عالم کا نام بھی بتاتا ہے جسکی کتابوں سے روجر بیکن نے استفادہ کیا ہو! لکھتا ہے۔

وروجر بیکن الشھیر فان ماحصلہ من المعارف فی الکیمیاء والفلسفۃ

اور روجر بیکن مشہور کو جو کچھ کیمیا و فلسفہ اور ریاضیات میں حاصل ہوا، وہ انھیں (عرب) کی کتابوں سے حاصل ہوا

والسر [illegible] انما تحصل من کتبھم اور انہوں نے حسن کے اقوال سے اقتباس کیا ہے۔

وذلك فيه من اقوال الحسن ولعل الخازن الاندلسی (شاید حسن الخازن اندلسی ہیں)

ان شہادتوں کے بعد ہم موجودہ نظام منطق کے بعض مباحث کو سامنے رکھکر مسلمانوں کے [illegible] سے مقابلہ کریں گے اور بتائیں گے کہ یہ جو کچھ بھی ہے مسلمانوں کے علوم کا فیض ہے۔

اہل یورپ کے یہاں منطق استخراجی پر سب سے زیادہ مدلل اور پاکیزہ بحث مل نے کی ہے وہ کہتا ہے "جتنے قضایا کلیہ ہوتے ہیں ان کی حیثیت صرف یہ ہوتی ہے کہ وہ رجسٹر ہوتے ہیں جن میں ہم نے اپنے جزئی تجربات کا خلاصہ درج کر لیا ہے اور جن سے ہمیں آیندہ اخذ نتائج میں سہولت ہوگی پس جو قیاس کے مقدمہ اول کی یہی حیثیت ہوتی ہے اور جو نتیجہ نکالا جاتا ہے وہ اس سے نہیں بلکہ اسکے مطابق سے نکالا جاتا ہے منطقی حیثیت سے اسکا اصل ماخذ صرف وہ جزئی واقعات ہوتے ہیں جن کے استقرا سے قضیہ کلیہ قائم کیا جاتا ہے، یہ متفرق نظائر یہ جزئیات، ممکن ہے ذہن سے محو ہو جائیں، لیکن ان کا عکس جو درج رجسٹر ہوتا ہے باقی رہ جاتا ہے جس سے ان کی تفصیلات کا تو پتہ نہیں لگتا، مگر اسمیں ان کے وہ عام خصوصیات تمامتر محفوظ رہتے ہیں جنکی بنا پر ہم ان کے مماثل واقعات کے متعلق صحیح طور پر استنباط نتائج کر سکتے ہیں، اب ہم قیاس کے ذریعہ سے جو نتیجہ نکالتے ہیں وہ گو براہ راست اسی خلاصہ مندرجہ رجسٹر سے ماخوذ ہوتا ہے لیکن درحقیقت وہ نتیجہ نکلتا ہے ان گمشدہ فراموش شدہ جزئیات سے جن کا خلاصہ اسوقت ایک کلیہ کی صورت میں ہمارے پیش نظر ہے۔" (مبادی فلسفہ از مولانا عبدالماجد)

مل کی یہ تقریر اپنے ذہن میں رکھئے، اور اب شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی وہ تنقید جو انھوں نے تمثیل کی حمایت کرتے ہوئے منطق قیاسی پر کی ہے پڑھئے اور فیصلہ کیجئے کہ منطق استخراجی پر ابن تیمیہ نے جو کچھ کہا ہے کیا مل اس سے الگ کوئی نئی بات کہتا ہے! مل کا زمانہ ۱۸۰۶ء تا ۱۸۷۳ء ہے اور ابن تیمیہ صدیوں پیشتر ۱۲۶۳ء تا ۱۳۲۸ء کے حقانی عالم ہیں۔

شیخ الاسلام اپنی بنظیر کتاب الرد علی المنطقین (نسخہ قلمی دار المصنفین) میں فرماتے ہیں

Arabic	Urdu
قیاس الشمول یؤول فی الحقیقۃ الی قیاس التمثیل	قیاس شمول درحقیقت تمثیل ہی کی طرف لوٹتا ہے
کما ان الآخر فی الحقیقۃ یؤول الی الاول ولھذا	جسطرح کہ دوسرا پہلے کی طرف لوٹتا ہے! اسی لئے
تنازع الناس فی مسمی القیاس فقیل ھو قیاس	قیاس کے نام میں لوگوں کا اختلاف ہے، اکثر اہل
التمثیل فقط وھو قول اکثر الاصولیین وقیل	اصول صرف قیاس تمثیل کو مانتے ہیں اور اکثر منطقی صرف
قیاس الشمول فقط وھو قول اکثر المنطقیین وقیل	قیاس شمول کو مانتے ہیں، اکثر فقہا و متکلمین دونوں تسلیم کرتے ہیں اسلئے
یعم القیاسات جمیعا وھو قول اکثر الفقھاء و	کہ قیاس شمول کی بنا اسپر ہے کہ تمام افراد، ایک حکم
المتکلمین وذلک ان قیاس الشمول مبناہ علی	عام میں شامل ہیں اور تمثیل کی بنا اسپر ہے کہ دو کا
اشتراک الافراد فی الحکم العام وشمولہ لھا وقیاس التمثیل	ایسے حکم میں مشترک ہونا جو دونوں کو عام ہے۔
مبناہ علی اشتراک الاثنین فی الحکم الذی یعمھما ومآل الامرین واحد	نتیجہ دونوں کا ایک ہے۔

آگے چل کر کہتے ہیں:-

Arabic	Urdu
والکلیات فی النفس یقع بعد معرفۃ الجزئیات	جزئیات معینہ کی معرفت کے بعد کلیات کا علم ہوتا
المعینۃ فمعرفۃ الجزئیات المعینۃ من اعظم الاسباب	ہے۔ پس کلیات کی معرفت کیلئے جزئیات کی معرفت
فی معرفۃ الکلیات فکیف یکون ذکرھا مضعفا	سبب عظیم ہے ایسی حالت میں اسکا ذکر قیاس کیلئے
للقیاس ویکون عدم ذکرھا موجبا للقوۃ و	کمزوری، اور اسکا عدم ذکر قیاس کیلئے قوت کا باعث
ھذہ خاصۃ العقل فان خاصۃ العقل معرفۃ	کیسے ہونے لگا؟ یہ عقل کا خاصہ ہے کہ کلیات کو جزئیات کے
الکلیات بتوسط معرفتہ بالجزئیات فمن انکرھا	توسط سے پہچانے، پس جو اسکا انکار کرے گا! وہ
انکر خاصۃ العقل	خاصہ عقل کا انکار کرے گا!

استقرائی منطق پر تنقید کے بعد مِل کا سب سے بڑا کارنامہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے

شناخت علل کے ایسے اصول بتلائے ہیں جن کے ذریعہ سے ہم غیر متعلق واقعات کو حقیقی علل سے ممتاز کر سکتے ہیں!

ڈاکٹر میر ولی الدین نے تاریخ فلسفہ جدید دوم صفحہ ۴۱ میں لکھا ہے! (دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ)

تجربی سائنس کی تاریخ کی بنا پر سبکے اختیار کرنے میں مل کونت وھیول اور ہرشل کو اپنا پیشرو تسلیم کرتا ہے، مل چار ایسے طریقے پیش کرتا ہے جن کے ذریعہ سے ہم جائز اور ناجائز لازم تصورات میں تمیز کر سکتے ہیں.

ہم کو یہاں پھر کہنا پڑتا ہے کہ مل کے یہ اصول اربعہ وہی ہیں جو صدیوں سال پیشتر اسلامی اصول قانون میں قیاس کی بحث میں بیان کئے جا چکے ہیں! مزید توضیح کے لئے یہ اصول اربعہ مبادی فلسفہ (مولانا عبدالماجد) سے لیکر یہاں لکھے جاتے ہیں.

(۱) جب واقعہ زیر تحقیقات کی دو یا زائد مثالوں میں ایک ہی شے مشترک ہوتی ہے تو وہی مشترک شے اس واقعہ کی علت (یا معلول) ہو گی.

فقہائے اسلام کی اصطلاح میں اسکو طریق طرد کہتے ہیں، اور مل کی اصطلاح میں یہ Do- Agreement قانون اشتراک ہے.

(۲) جب دو مثالیں ہوں جنمیں سے ایک میں ایک واقعہ موجود ہو اور دوسری میں نہو اور ان دونوں مثالوں میں تمام حالات مشترک ہوں، بجز ایک خاص شے کے جو پہلی مثال میں موجود اور دوسری میں غائب ہو تو وہی ایک شے اس واقعہ کی علت ہو گی.

اصول فقہ میں اسکو طریق عکس کہتے ہیں اور مل کی اصطلاح میں قانون افتراق Do- difference ہے! متاخرین طریق طرد و عکس کو دوران کہتے ہیں.

(۳) جب دو واقعات اسطرح کے پیش نظر ہوں کہ جس حیثیت سے اور جتنا ایک واقعہ میں

تغیر ہوتا ہو اسی حیثیت سے اور اتنا ہی دوسرے میں بھی ہوتا ہو تو وہ اسکا سبب یا جزو سبب ہوگا۔ فقہا اسکو طریق الوصف بالوصف کہتے ہیں اور مل کی منطق قانون تغیر متلازمات Do Concomitant Variation نام رکھتی ہے۔

(۴) جب کسی ایسے واقعہ کی علت دریافت کرنا مقصود ہو جس کے پیشرو متعدد واقعات ہیں تو اس واقعہ کے اتنے جزو کو نظر انداز کردو جس کے متعلق گذشتہ استقراآت سے معلوم ہوچکا ہو کہ وہ فلاں متقدم واقعات کا معلول ہے۔ اب اگر کچھ جزو باقی رہجائے تو سمجھ لو کہ اسکی علت ان پیشرو واقعات کا بقیہ حصہ ہے۔ فقہا کی اصطلاح میں یہ طریق طرح اور مل کی اصطلاح میں طریق حذف Do Residues ہے۔

اس ساری تفصیل سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہو کہ منطق استقرائی کے سلسلہ میں یورپ کا نعرۂ تفرد بے بنیاد ہے! یورپ نے جو کچھ پایا ہے وہ مسلمانوں کے علوم و فنون کے بحر ذخار کا ایک قطرہ ہے۔

ندوہ کے مشرقی اور مغربی مطلع

از پروفیسر محمد بدرالدین علوی استاد عربی مسلم یونیورسٹی

الندوہ کے پہلے پرچہ میں ندوہ کے مغربی اور مشرقی مطلعوں کا ذکر کچھ ایسا عجیب تھا کہ اسکے پڑھنے سے بڑی خوشی ہوئی تھی کہ اس کے پرچے میں نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا شروانی کی جو ایک عقیدت سے لبریز تحریر مشرقی مطلع کے عنوان سے شائع ہوئی وہ سطور ذیل کا باعث ہوئی۔

دستے ست کہ افسانہ منیہ کردہ شد　　　من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را

مولانا شروانی نے بھی فرمایا ہے کہ مغربی مطلع کا ذکر مولانا سید سلیمان صاحب کے مضمون میں بہت کچھ آ چکا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ جیسا میں نے عرض کیا اسکی دلکشی تو سیر ہی نہیں ہونے دیتی ناظرین یہ نہ سمجھیں کہ میں اسکو دہرانا چاہتا ہوں نہیں بلکہ ایک نیا اور عجیب لطیفہ بیان کرنیوالا ہوں جب دو چیزوں میں شدید اختلاف ہوتا ہے تو کہتے ہیں کہ اسمیں مشرق و مغرب کا بعد ہے، مگر عجیب بات یہ ہے کہ ندوہ کے مطلعوں میں باوجود مشرقی اور مغربی ہونیکے حد سے زیادہ قرب ہے، اسی قرب کی تفصیل کے لئے یہ سطریں لکھی جا رہی ہیں۔

اس جگہ یہ پیشہ دہرانا نامناسب نہ ہوگا کہ مغربی مطلع سے استاذ العلما حضرت مفتی لطف اللہ صاحب علیگڈھی مراد ہیں اور مشرقی سے حضرت مولانا فضل رحمان صاحب گنج مرادآبادی رحمہا اللہ تعالیٰ۔

اب دونوں مطلعوں کے قرب و اتصال کے وجوہ ملاحظہ ہوں۔

۱. دونوں بزرگوار حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے سلسلہ میں منسلک۔

۲. ایک بزرگ کے جو لوگ شاگرد وہی دوسرے بزرگ کے مرید

۳. دونوں بزرگوں میں وہ محبت وارتباط کہ جس کا اصلی حال کوئی نہیں جان سکتا۔ البتہ

باریک بیں لوگوں کے لئے قرائن موجود، چنانچہ ایک جانب سے دو چیزیں پیش کرتا ہوں۔

۱۔ مولانا گنج مراد آبادی کی مدح استاذ العلماء کے قلم سے۔[1]

عالم آنست کہ از معرفت حضرت حق　　باشد اندر دل او پرطبق فوق طبق

عالم آنست کہ از سر کتاب و سنت　　گر بگوید سخنے خلق فتد در حیرت

آنکہ از علم حقائق دلش آگاہ بود　　بیگماں در صف اعلام درا راہ بود

در بہ پرسی کہ دریں عہد کہ بود ست چنیں　　گویمت فخر زمن حضرت فضل رحمانؒ

آنکہ گر لب بکشاید بہ بیان توحید　　گم شود ہر چہ بدہر ست بجز ذات وحید

آنکہ گردم زند از سر وجود اول　　صد معما شود از یک سخن او منحل

آنکہ سر الست ار زبانش آید　　ہر یک از ہر طرفے لب بہ بلی بکشاید

ایں کمن پایہ فرومایہ نگوں سر یارب　　بدرش ہمچو سگاں باد نشستہ بادب

۲۔ استاذ العلماء کا گنج مراد آباد تشریف لیجانا، جہاں کا ایک واقعہ خود حضرت کا سُنایا ہوا ہمیشہ یاد رہے گا۔ اس واقعہ کے بیان کے وقت جو سرور حضرت کو ہوتا تھا اُسکا تحریر کرنا بہت مشکل ہے۔ فرماتے تھے۔ مولانا صحیح مسلم ہاتھ میں لئے ہوئے تھے اور حلبۃ یضربون مشارق الارض ومغاربہا" سامنے تھا مجھے خطاب کرکے فرمایا، دیکھئے ہم اسکا ترجمہ یوں کرتے ہیں۔" پورب پچھم مارے مارے پھرتے تھے"

دوسری جانب سے جو ارتباط تھا اُسکے اندازہ کے لئے بھی دو ہی چیزیں ملاحظہ ہوں۔

۱۔ گنج مراد آباد سے جو شخص بھی علی گڑھ آتا خواہ اُسکا تعلق اُستاذ العلماء سے ہوتا یا نہ ہوتا مولانا اُس کے ذریعہ سے اُستاذ العلماء کی خدمت میں سلام کا ہدیہ ضرور بھیجتے۔

۲۔ مولانا شروانی کی شہادت، جن سے اُستاذ العلماء کو جاننے اور خدمت کرنے کا استفسار ہوا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ وہ بڑے شخص ہیں اُن کو کما ینبغی پہچانو اور خدمت کرو، نتیجۂ استفسار ظاہر

---

[1] کلام لطف ص ۹ و ۱۰

مولانا جلیل القدر استاد کے ساتھ شغف اضعافاً مضاعفاً ہو گیا اور خدمت کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔

خاتمہ پر حضرت مولانا فضل رحمان صاحبؒ کا تذکرہ چند لفظوں میں کر دینا باعث برکت سمجھتا ہوں۔

مولانا نسباً صدیقی تھے۔ شاہ اسحاق صاحبؒ کے شاگرد اور شاہ آفاق صاحبؒ کے خلیفہ طریق نقشبندی علوم شرعیہ خصوصاً حدیث و فقہ میں بڑا کمال تھا۔ علم کا پلہ درویشی پر اس قدر غالب تھا کہ بجائے پیر اور شیخ کے ہمیشہ مولانا کے لقب سے یاد ہوئے۔ علم کے غلبہ کا ہی نتیجہ تھا کہ اتباع سنت حد سے زیادہ ملحوظ تھا ۲۲ ربیع الاول ۱۳۱۳ھ کو رحلت فرمائی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

اطلاع

جب سے رسالہ الندوہ کا دوبارہ اجرا کیا گیا ہے ہمارے پاس برابر رسالہ کی پرانی جلدوں کی فرمائشیں آ رہی تھیں، چنانچہ بڑی جستجو کے بعد ہم کچھ جلدوں کے فراہم کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں، آئندہ اشاعت میں ہم ان کی تعداد اور نمبر درج کر سکیں گے، جو اصحاب پرانی جلدیں خریدنا چاہتے ہوں ان کو چاہئے کہ جلد از جلد ہم کو مطلع کر دیں کہ وہ کونسی جلدیں خریدنا چاہتے ہیں تاکہ ان کو مطلوبہ جلدیں روانہ کر دی جائیں۔

منیجر

بچّہ اور تعلیم

از :- جناب محمد سمیع صاحب ایم اے۔ بی ٹی۔ صدر شعبۂ انگریزی دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

اس دور کا اُستاد سسرو[1] جس نے اپنی مشہور تصنیف دی اوریٹری The Oratory ۵۵ ق م شائع کی۔ افلاطون کا بڑا ہمنوا تھا۔ اسنے اپنی مشہور کتاب میں تعلیم کے متعلق ابتدا سے اس عمر تک کی تعلیم کی بحث کی ہو جبکہ ایک شخص سارے تعلیمی مدارج طے کرکے پبلک مقرر ہو جاتا تھا۔ افلاطون کے نظریہ کے مطابق ایک عملی انسان بننے کی تائید کرتا ہو محض فلسفی ہونا درست نہیں، کیونکہ مقرر خود بخود فلسفی سمجھا جاتا تھا اور منطق، تاریخ، قوانین کا ماہر ہوتا تھا، تفکر و عمل کا پیکر ہوتا اور ریاست کے فرائض سے وابستہ رہتا اگر عدالت میں وضاحت قانون کرتا تھا تو مجلس عامہ میں تقریر۔ اس غرض سے زبان پر قدرت رکھنا ضروری تھا۔ اس مقرر کے نزدیک عالم کا علم مثل انسائیکلوپیڈیا کے ہونا چاہئے، یہ کہتا ہو کہ بچہ کی تعلیم چار سال کی عمر سے شروع ہونی چاہئے، مادری زبان (لاطینی) سب سے پہلے سکھلائی جائے۔ بچہ جبتک اسمیں کما حقہ مہارت حاصل نہ کرلے غیر زبان نہ سکھلائی جائے۔ ڈسپلن کا بڑا حامی تھا

دوسرا معلم کیونٹیلین[2] ہے۔ اس نے پہلے وکالت کا پیشہ اختیار کیا بعد میں مدرسی کے عہدہ پر منجانب ریاست ممتاز ہوا اور باقاعدہ مشاہرہ لیتا تھا اسنے تعلیم کی تقسیم دو نصاب پر کی ہے۔

(۱) خصوصی نصاب مثلاً انجینیرنگ، ڈاکٹری، زراعت وغیرہ

(۲) عام تعلیم جسمیں ذہنی تعلیم پر زور دیا ہو اور کہتا ہو کہ جن بچوں کے ذہن و حافظہ قوی ہوں انھیں لبرل (LIBERAL) تعلیم دیجائے، کم سمجھ کو مخصوص یعنی پیشہ کی تعلیم کافی ہے، اسکا خیال تھا کہ ایک حد تک عام تعلیم لازمی ہونی چاہئے۔ اسکے بعد ہر طالب علم اپنے رجحان کے

---

[1] (۱۰۶ سے ۴۳ ق م) [2] یہ پہلی صدی عیسوی میں گذرا ہے۔

مطابق جس مضمون کو چاہے اختیار کرے۔

مدارس کے اندر تعلیم دینے پر زور دیتا ہے اور ایک اعتراض کا جواب دیتا ہے جو کسی معترض نے کیا تھا کہ اخلاق پر برا اثر پڑتا ہے، لڑکے خراب ہو جاتے ہیں، پس اسکا جواب دیتا ہے کہ مدرسہ کا نقص نہیں بلکہ ان گھروں کا قصور ہے جہاں سے بچے بداخلاقی کو ساتھ لاتے ہیں، اخلاقی کمزوری مدرسہ میں نہیں پیدا ہوتی ہے بلکہ خارج سے داخل ہوتی ہے جس کا سدباب ہو سکتا ہے مدرسہ ایسی جگہ ہے جہاں بچہ اپنے ہم عمروں اور ساتھیوں سے ملتا ہے، علمی کشاکش، کوشش اور مقابلہ جاری رہتا ہے بچے اپنے ذہنی اور جسمانی قوی کا صحیح اندازہ کرتے ہیں اور گوئے سبقت لیجانے کے لئے کوشاں ہوتے ہیں درس حیات کا پہلا سبق یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ سزا کے لئے دو رائیں ہیں، آیا جسمانی سزا دینی چاہئے یا نہیں۔ ایک گروہ معلمین کا کہتا ہے کہ سزا ضروری ہے

دوسرا گروہ سزا دینے سے منع کرتا ہے۔ کیولا اپنی رائے پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ حقیقت میں سزا کا مقصد بچہ سے دوبارہ غلطی نہ سرزد ہونیکا احساس کرانا ہے۔ سزا سے ردعمل شروع ہو جانے کا بھی امکان ہے وہ سزا بہتر ہے جو اصلاحی ہو نہ کہ تعزیری۔ وہ کہتا ہے کہ بچہ کے کام یا سبق کی مقدار اسقدر زیادہ نہ ہو جو اسکے عمر کے لحاظ سے بار ہو جائے۔ حافظہ اور نقالی کی قوت کو بڑھانا چاہئیے۔ یہ بھی ادب، فلسفہ، منطق، گرامر صنائع و بدائع ریاضی، اقلیدس، موسیقی، ہیئیت، غیر زبان، فن تقریر، نصاب تعلیم میں شامل کرتا ہے اسکی تقسیم بچہ کی عمر کے لحاظ سے ابتدائی، ثانیہ اور اعلیٰ تعلیم کے مدارس میں کرتا ہے۔

روما کی سلطنت، جاہ و جلال عشرت و مال سے پرتھی، اور رومی سلاطین و عاملین نخوت اور عیش میں مست تھے کہ مذہب عیسوی نے جنم لیا، آہستہ روی سے غریب اور ادنیٰ طبقہ میں پھیلتا رہا، اسکی اشاعت کو رومی حقیر سمجھتے۔ قریب چار سو سال تک سلطنت روما اور مذہب عیسوی کی تبلیغ بلا تصادم جاری رہی، رومی قوم اپنے کو بلند سمجھتی، بادشاہ و شہری سب تعیش کے نشہ میں سرشار تھے، اسکے

فسق و فجور میں ایسے گم گشتہ راہ ہو چکے تھے کہ نیک و بد کی تمیز باقی نہ رہی تھی۔ اعلیٰ طبقہ سے اُتر کر عوام کا مذاق زندگی بھی بگڑ چکا تھا، اُنکی سخت گیری و ظلم نے مذہب عیسوی کی ترقی و پھیلنے میں مدد پہونچائی، نوبت یہاں تک پہونچ گئی کہ گورنروں نے عام طور پر ظلم کو روا رکھا، دو قسم کے قوانین نافذ ہوئے۔ ایک رُومی دوسرا غیر رومی کے لئے، غیر رُومی کی زندگی دوبھر ہوگئی، معمولی قصور پر سخت سزائیں دیجاتی تھیں، غیر رُومی یعنی نصاریٰ تنگ آ۔ بجنگ آمد پر اُتر آئے، عیسائیوں کو اول اول یونانی و رُومی نصاب تعلیم سے سخت نفرت ہوگئی تھی، جب عقلی دلائل اور علمی ترقی کی کمی محسوس ہوئی تو نصاب کو اختیار کرنے لگے صرف اس غرض سے کہ مذہب کا تحفظ کیا جائے اور مناظروں میں مخالفین سے دلائل کے ذریعہ مقابلہ کیا جاسکے۔ چونکہ عیسائیت کو دیوتاؤں کے پجاریوں سے نفرت تھی نصاب تعلیم سے بھی نفرت تھی۔ اپنا خاص نصاب بنانیکی فکر ہوتی، ایک مشہور حکمراں نے جسکا نام شارلیمین[1] تھا توجہ کی اور ۸۰۰ء سے ۱۶۰۰ء تک ایک تعلیمی طریقہ جاری رہا جسنے رہبانیت اور خانقاہی زندگی کو اہمیت دی جو ترک دُنیا سکھلاتا تھا یہ طریقہ بالکل غیر فطری تھا، تعلیم حیات کے سرچشموں سے دور حقیقی زندگی سے بے بہرہ تھی۔ کلیسائی یا خانقاہی مدرسے نفس کشی پر زور دیتے تھے، گوشہ نشینی انسب سمجھتے تھے۔ تقویٰ و پرہیزگاری صرف آخرت کی زندگی کے لئے جائز رکھتے تھے۔ اس نظریہ کے ماتحت ایک پروگرام بھی تیار کر لیا گیا تھا جو بہت محدود تھا۔ عوام کی تعلیم کے لئے کوئی گنجائش نہ تھی صرف راہب کو تعلیم دیجاتی تھی۔ اس تعلیم کے دو مقصود تھے۔

(۱) جسمانی تکلیف، محنت، مشقت، برداشت کرنا۔

(۲) کسی قدر نوشت و خواند سے واقفیت رکھنا جو خصوصیت سے مذہبی کتب تک مبنی ہو اور

---

[1] CHARLEMAGNE ۷۴۲ء سے ۸۱۴ء تک زندہ رہا، روم کا شہنشاہ تھا، فتوحات کے اندرونی نظم۔ ترقی تعلیم کی طرف توجہ کی۔ اس کا دربار معلمین اور علم دوست کے لئے کھلا ہوا تھا۔ خلیفہ ہارون الرشید کا معاصر تھا۔ ۷۶۵ء سے ۸۰۹ء تک زندہ رہا۔

اشاعت مذہب میں کام آئے دینی تعلیم کے اصول پھیلانے میں معین ہو۔ یہ تعلیم اسقدر کم ہوتی تھی کہ راہب تمام وقت میں جاہل رہتا تھا۔ اُسے صرف حسب ذیل باتوں کے لئے حلف اُٹھانی پڑتی تھی وہ عموماً یہ تھا کہ:-

(۱) میں غریب کی زندگی بسر کروں گا۔

(۲) میں پاک اور غیر ازدواجی زندگی گزاروں گا۔

(۳) میں اطاعت اور اعلیٰ رہبان کی فرمانبرداری کروں گا، یا پاپائے اعظم کے ہر حکم کی عزت کروں گا۔

یہ وہ اصول تھے جو عمرانی اور معاشرتی زندگی کے بالکل برعکس تھے۔ دوسرا اصول تو اسقدر غیر فطری تھا کہ اس نے آئندہ چل کر اخلاق کی پامالی جس حد تک کی اُس سے تاریخ کے اوراق سیاہ نظر آتے ہیں۔

مانک اور نن کی زندگی کی تاریخ کا ایک دلچسپ باب ہو جس سے فسانہ نگاری عہد بر آ ہو سکتا ہے۔

ان اصولوں کے نزدیک دنیاوی حیات بے کیف ہونی چاہئے۔ خاندانی تعلقات، نسلی بقا سب بے سود ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اول دو اصول پر عمل نہ ہو سکا۔ البتہ تیسرے اُصول نے بڑے بڑے اہم واقعات پیدا کئے، پاپائے اعظم مذہبی پیشوا کے علاوہ سیاسی شہنشاہ بھی تھا۔ سلاطین اسکے ہاتھوں تاج شاہی سے سرفراز ہوتے تھے اور کسی کو سرتابی کی مجال نہ تھی۔ اسکی INQUISITION[1] اور JESUITS[2] کی جماعتوں نے اپنی خفیہ داد و دہش سے سیکڑوں جانوں کو تہ تیغ کیا

---

[1] یہ وہ جماعت رومن کیتھولک کی تھی جو بارھویں صدی عیسوی میں قائم ہوئی تھی اور غیر عیسائی کی جانچ کرتی اور سخت سزائیں تجویز کرتی تھی۔

[2] یہ وہ مذہبی جماعت تھی جو ۱۵۳۴ء میں قائم ہوئی۔ یہ لفظ "سازشی" کے مترادف بن گئی۔

اور اسپین میں مسلمانوں کے خلاف ایسی کارروائیاں کیں جو تاریخ میں دردناک واقعے ہیں۔

رومن کیتھولک مذہب کے طریقۂ کار نے ایسے افراد پیدا کر دیئے جو REFORMATION (اصلاح) کے بانی ہوئے۔ انہیں درخشندہ ستارہ مارٹن لیوتھر ہے جو خود ایک راہب تھا۔ اور رہبانیت کی زندگی سے عاجز ہو کر پاپائے اعظم کے خلاف بغاوت شروع کر دی۔

بہرحال خانقاہی مدرسے قرون وسطیٰ میں ممالک کے مختلف حصوں میں قائم تھے، جہاں پہلے صرف رہبان تعلیم حاصل کرتے تھے۔ کچھ مدت کے بعد غیر رہبان عیسائی بچے بھی داخل کئے جانے لگے مقصود یہ تھا کہ ان بچوں کو مخصوص تعلیم دیکر رہبان بنایا جائے، تعلیمی حیثیت سے نتائج اچھے نہ نکلے اور ساری کوشش ناکام ثابت ہوئی، قرون وسطیٰ میں تعلیم مفت نہ تھی، کسی قسم کا غیر مذہبی نصاب داخل نہ تھا۔ صرف عیسائیت کے خیالات وتعلیم مدنظر تھی، اسکا سلسلہ گیارھویں وبارھویں صدی عیسوی تک قائم رہا، کلیسائی مدرسے قائم ہوئے۔ CATHEDRAL اور EPISCOPAL جو بعد میں یونیورسٹی بنی۔

یونیورسٹیوں کی ابتدا۔ گیارھویں اور بارھویں صدی کا وہ زمانہ ہے جبکہ یورپ جنگ صلیبی میں مبتلا ہوا۔ سوسائٹی حد درجہ محدود تھی اور نوابی طرز حکومت نے سارے یورپ کو ٹکڑوں میں تقسیم کر رکھا تھا، عربی ممالک علوم وفنون کے لحاظ سے دنیا کو روشنی دے رہے تھے اور مشرق کو یورپ پر وہی فوقیت تھی جو آج برعکس نظر آ رہا ہے۔ عربی علیم گاہوں نے تہذیب اور سائنس نے معاشرت اور تحقیقاتی اسپرٹ نے یورپ کی آنکھیں کھولدیں اور بھولے ہوئے یونانی سبق کو یاد کرایا۔ ارسطو افق یورپ پر پھر نمودار ہوا۔ یونانی لٹریچر وفلسفہ کے بحر میں پھر غوطہ زن ہوئے۔ یہ سب عربوں کی برکت تھی جسکا تذکرہ عرب ویورپ میں کروں گا۔

جنوبی اطالیہ میں جہاں عرب اثرات اور یونانی ادب نے وسعت نظری پیدا کر دی

سالرنو Salerno کے مقام پر خانقاہی مدرسہ میں طب کے مطالعہ سے دلچسپی پیدا ہوئی یہی مدرسہ پہلی یونیورسٹی بنی اور ۱۲۲۴ء میں اس کا الحاق شہر نیپلز Naples کے مدرسے سے ہو گیا۔ فریڈرک دوم نے نیپلز یونیورسٹی کو چارٹر (اجازت نامہ) بھی عطا کیا۔ شمالی اطالیہ میں آبادی شہر اپنے شہری حقوق حاصل کرنے کے لئے جرمن بادشاہ کے خلاف کوشاں تھے۔ استبدادیت کے خلاف اجازت نامے، فرامین اور قانونی حد بندیاں پیش کرتے تھے جسے شہنشاہیت کے شخصی دور نے غصب کر لیا تھا۔ بالآخر یہ کوششیں بار آور ہوئیں اور شہروں میں ایسے مدرسے قائم ہو گئے جہاں قانون کا مطالعہ ہونے لگا۔

بولونا (BOLOGNA) ارنیرس (IRNERIUS ۱۰۶۷-۱۱۳۰ء) کے سبب زیادہ مشہور ہوا۔ طلباء کی کثیر جماعت اکٹھا ہو گئی۔ اساتذہ اور طلباء کی ان جماعتوں کو بادشاہ یا پوپ کی جانب سے تحریری حق بھی مل گیا۔ بولونا کو فریڈرک اول (FREDERICK) نے ۱۱۵۸ء میں اور پیرس (PARIS) کو انوسن ہفتم نے ۱۲۱۱ء میں درسگاہ مانا اور فرمان عطا کیا۔ آکسفورڈ اور کیمبرج کو بھی اسی طرح فرمان اور اجازت نامے ملے مگر تاریخ کا تعین کرنا دشوار ہے۔

ایسی درسگاہوں کی تعداد بڑھنے لگی، تیرھویں صدی میں انیس چودھویں میں پچیس اور پندرھویں میں تیس کا اضافہ ہوا۔ یہ مدرسے اپنے نظم و نسخ میں آزاد اور آبادی کے مرکز میں قائم ہوئے کلیسائی اور خانقاہی مدرسے اس سے قبل آبادی سے دور زیادہ تر جنگلی علاقوں میں قائم تھے اساتذہ اور طلباء کو خصوصی حقوق ملے، مثلاً ملازمت سے آزاد، جنگی خدمات اور ٹیکسوں اور چندوں سے معاف تھے، عدالتی کارروائی کا حق مختارانہ حاصل تھا۔ اسناد (ڈگریاں) دینے کا بھی حق مل گیا تھا۔ قبل ازیں صرف کلیسا کو یہ بات حاصل تھی۔ آرچ بشاپ یا بشاپ ہی سند دے سکتا تھا۔

(باقی)

اسلامی ممالک کے تعلیمی حالات

(۳)

ٹیونس[1]

بحر روم کے کنارے شمالی افریقہ کے ساحل پر ۴۸۳۰۰ ہزار مربع میل کے رقبہ میں پھیلا ہوا ہے۔ ۱۲ مارچ سنہ ۱۹۳۶ء کی مردم شماری کے مطابق کل آبادی ۲۶۰۸۳۱۳ لاکھ ہے، جسمیں ۲۲۳۵۶۲۲ لاکھ عرب مسلمان، ۵۹۴۸۵ ہزار یہودی، ۱۰۸۰۶۸ فرانسیسی، ۹۴۲۸۹ اطالوی ۲۷۹ ۔ مالٹی، ۳۲۲ اسپینی ۴۵۴ یونانی ۲۷۹۲ دوسرے ممالک کے باشندے ہیں۔ سنہ ۱۷۰۵ء تک یہ ملک باضابطہ سلطنت عثمانیہ سے تعلق رکھتا تھا، اور یہ مملکت ترکیہ کا ایک صوبہ سمجھا جاتا تھا لیکن سنہ ۱۷۰۵ء میں امیر حسین ابن علی نے آزادی اور استقلال کا دعوی کیا اور اندرونی طور پر ملک خود مختار ہوگیا۔ تاہم سنہ ۱۸۸۱ء تک دولت عثمانیہ کا رسمی تعلق رہا۔ ۱۸۸۱ء میں فرانس نے ٹیونس پر قبضہ کرلیا، اس فرانسیسی اقتدار نے ترکوں کو اس ملک سے بالکل بے تعلق کردیا۔ اب شاہان ٹیونس کی حیثیت محض ایک ماتحت کی سی ہو۔ ملک کی اصلی طاقت فرانسیسی عمال کے ہاتھ میں ہو اور انھیں کی مرضی کے مطابق تمام انتظامات ہوتے ہیں۔

ان حالات میں اسلامی نظام تعلیم کی توقع فضول ہو، جا بجا قرآن خوانی کے مدرسے ہیں، کہیں کہیں مسجدوں میں ابتدائی دینی تعلیم ہوتی ہو، ٹیونس کی جامع اعظم میں عربی کی ایک بہت بڑی درسگاہ ہو جو عالم اسلامی میں جامعۂ زیتون کے نام سے مشہور ہو۔ یہ درسگاہ تیسری صدی ہجری میں قائم ہوئی تھی، اسوقت سے ابتک خاص شہرت و اہمیت کی مالک ہو۔ دینی تعلیم کے مصارف موقوفہ آراضی سے پورے ہوتے ہیں۔ دینی نظام کی نگرانی کے لئے شیخ الاسلام کا عہدہ قائم ہے۔ فرینچ

---

[1] سلسلہ کے لئے جنوری سنہ ۴۰ء کا الندوہ ملاحظہ ہو۔

اقتدار کے باعث جدید مغربی تعلیم رائج ہوئی. اسوقت ایجنسی کے حدود میں ۴۹۰ پبلک اسکول ہیں ۸ کالج اور ۳۳ پرائیوٹ اسکول ہیں جنمیں ۹۲۰۲۵ طالب علم ہیں انمیں سے ۵۹۵۴۶ بچے ہیں، مذہبی طور پر انکی تقسیم یوں ہے۔

۳۲۲۰۰ مسلمان طلباء ہیں ۱۲۵۵۲ یہودی اور ۲۲۸۳۹ فرانسیسی ۹۹۰۶ اطالوی، ۱۰۱۳ مالٹی اور ۲۲۴۲ مختلف ملکوں کے باشندے ہیں. خاص شہر میں مسلمانوں کی تعلیم کیلئے ۸ پرائمری اسکول ہیں. ایجنسی کے حدود کے باہر اندرون ملک میں ۱۲۵۴ مسلم ابتدائی مدرسے ہیں جنمیں سے بعض کی سرکاری امداد ہوتی ہے. پچھلے چند برسوں سے ۱۶ مسلم اپرنٹس شپ اسکول قائم ہوئے ہیں جنمیں ۹۰۰ طلبا ہیں. ادھر چند دنوں سے بہت سے مزید پرائیوٹ اسکول قائم ہوئے ہیں. ان مدارس کے علاوہ اطالوی حکومت اور اطالوی سوسائٹیوں کی جانب سے ٹیونس اور دوسرے بڑے شہروں میں اسکول قائم ہیں.

(۴)

طرابلس

ٹیونس کے مشرق جانب افریقہ کے شمالی ساحل پر طرابلس کا ملک واقع ہے. ۴۴۰۶۶۰ مربع میل رقبہ ہے. پہلے یہ ملک دولت عثمانیہ کے ماتحت تھا ستمبر ۱۹۱۱ء میں یکایک اٹلی نے لڑائی چھیڑ دی جس کا سلسلہ ایک سال سے زائد جاری رہا. یوروپین سیاست نے ترکوں کو پوری طرح مدافعت کا موقع نہ دیا. مجاہد اعظم انور بے اور چند ترک جنرل بمشکل میدان جنگ تک پہونچ سکے. طرابلس کے پُرجوش مجاہدوں نے جانبازی اور سرفروشی کی انتہا کردی لیکن شیشہ و سنگ کے تصادم کا انجام ظاہر تھا. عربوں کو شکست ہوئی. ۲۳ فروری ۱۹۱۲ء کو اطالوی کونسل نے قبضہ کا اعلان کردیا جسکی تصدیق ۱۸ اکتوبر ۱۹۱۲ء کے معاہدہ آؤچی Guchy نے کردی اور طرابلس باضابطہ

اطالوی شہنشاہی میں داخل کرلیا گیا۔ گو غیور عرب دل سے اس اجنبی تسلط کو تسلیم نہیں کرتے ہیں اور آزادی اور استقلال کے لئے کوشاں ہیں، لیکن اطالوی قوت کے سامنے بے بس ہیں۔

ان مسلسل لڑائیوں اور ہنگاموں نے ملک کی اسلامی زندگی کو درہم برہم کر ڈالا، آبادی میں خاصی کمی ہوگئی ہو، اطالوی قبضہ سے پہلے دولت عثمانیہ کے زمانے میں آبادی کا تخمینہ ۲۱ لاکھ کے قریب کیا جاتا تھا، لیکن اب ۱۹۳۶ء کی مردم شماری کے مطابق کل آبادی صرف ۸۳۹۵۲۴ ہے۔ جسمیں ۶۶۵۲۵ یوروپین اور ۷۷۲۹۹ دیسی باشندے ہیں۔

ان پریشان کن حالات میں مسلمانوں کی مخصوص تعلیم و تربیت کا ذکر ہی فضول ہو۔ جا بجا بے ضابطہ اور منتشر طور پر دینی تعلیم کے چند چھوٹے موٹے مدرسے ہیں۔ کہیں کہیں قرآن خوانی کے مکتب اور اسلامی تربیت کے لئے خانقاہیں ہیں۔ حکومت کی جانب سے کچھ نئے طرز کے اسکول ہیں۔ دیسی باشندوں کے لئے پرائمری اور حرفتی اسکول ہیں۔ ٹریپولی میں لڑکیوں کے لئے ایک عربی مدرسہ ہے نیز ٹریپولی میں مسلمانوں کے قرآنی مدرسوں کے ساتھ یہودیوں کے مخصوص مدرسے بھی ہیں۔ اطالوی باشندوں کی تعلیم کا انتظام نسبتاً بہتر ہے۔ ان کے لئے حکومت کی جانب سے پرائمری (ابتدائی) کے علاوہ سکنڈری (ثانوی) تعلیم کے لئے بھی اسکول قائم ہیں۔

ہمارے عزائم

(۲)

اس مختصر تمہید کے بعد اب میں اصل موضوع پر آتا ہوں۔ آپکو معلوم ہو کہ ہم اسوقت اسلئے جمع ہوئے ہیں کہ باہم ایک دوسرے سے مشورہ کرنے کے بعد جو چیز طے ہو جائے اسکو جامۂ عمل پہنائیں، آپکی آسانی کے لئے اپنے گذشتہ تجربہ کی بنا پر میں ایک خاکہ پیش کرتا ہوں، میرا اپنا خیال یہ ہے کہ یہ صورت کار مناسب ہوگی۔ باقی آپکو اختیار ہے۔

میرے خیال میں اسوقت ہم کو اپنا کام دو حصوں میں تقسیم کر دینا چاہئے، ایک کا تعلق انجمن کے اندرونی نظم و نسق سے ہو اور دوسرے کا دار العلوم ندوۃ العلماء کی ترقی و فلاح سے۔ تاکہ جاری انجمن کی شیرازہ بندی بھی ہوتی رہے اور ہم اپنی اصل منزل کی طرف بھی بڑھتے رہیں ورنہ اندیشہ ہے کہ یا تو ہم اپنی کمزوری اور بے نظمی کی وجہ سے مایوس اور بددل ہو کر حصول مقصد سے کنارہ کش ہو جائیں گے یا پھر ذریعۂ حصول مقصد ہی کو "اصل مقصد" قرار دیکر اسی بھول بھلیوں میں گم ہو جائینگے۔

میری رائے میں ہم ان دونوں کو اسطرح چلا سکتے ہیں کہ (۱) انجمن کے لئے حسب ذیل یا اس سے ملتا جلتا یکسالہ پروگرام طے کریں اور اسکی تکمیل شاخہائے انجمن طلبائے قدیم کے ذمہ کر دیں (۲) معتمد صاحب تعلیم دار العلوم ندوۃ العلماء سے معلوم کریں کہ وہ دار العلوم ندوۃ العلماء کی اصلاح و ترقی کے لئے کیا کرنا چاہتے ہیں، جو صاحب موصوف کرنا چاہتے ہوں اسکے متعلق تفصیلی اور واضح اطلاع حاصل کریں اور اس اطلاع کے مطابق جو کام کرنا ہوں انکی تکمیل و انصرام میں اور جو چیزیں دور کرنا ہوں ان کے ازالہ میں معتمد صاحب تعلیم کی انفراداً و اجتماعاً مدد و اعانت کریں۔

میرا مجوزہ یکسالہ پروگرام حسب ذیل ہے :-

پہلی سہ ماہی (۱) جو ندوی ابتک باضابطہ انجمن کے ممبر نہ بنے ہوں ان کو ممبر بنانا اور ان سے زر رکنیت وصول کرنا۔

(۲) ندوہ کے لئے ندویوں اور ندویوں کے توسط سے عام مسلمانوں سے ۵۰۰ روپیہ اعانت دارالعلوم کی مد میں لینا یہ کام آخر سال تک جاری رہیگا تاوقتیکہ مقررہ رقم نہ جمع ہوجائے۔

(۳) الندوہ کی اشاعت کو اس حد تک ترقی دینا کہ وہ اپنے قدموں پر کھڑا ہوسکے۔

دوسری سہ ماہی (۱) آرگنائزروں اور شاخوں کے ذریعہ انجمن کے صوبہ دار حلقوں کو مضبوط بنانا اور ان کے کاموں کو باضابطہ مرکز سے متعلق کرکے ان کی ترقی کے اسباب مہیا کرنا۔

(۲) سابق کاموں کو استقلال و ترقی دینا۔

تیسری سہ ماہی (۱) ہر ہر صوبہ کی شاخوں میں مقامی طور پر جلسے کرنا اور جہاں جہاں آرگنائزر ہوں وہاں باضابطہ شاخیں قائم کرنے کے لئے کوشش کرنا اور شاخ کے قائم ہوجانے پر جلسوں کا انعقاد اور مرکز کی زیر ہدایت کاموں کا انصرام و انتظام کرنا۔

چوتھی سہ ماہی (۱) پچھلے کاموں پر نظر ثانی، جو کام رہ گئے ہیں ان کی تکمیل کی جدوجہد جن کاموں میں خامیاں محسوس ہوں ان کا ازالہ۔

(۲) اس تمام عرصہ میں دارالعلوم کے لئے مرکزی طور پر جو کام ہو رہا ہو اسمیں امداد اور بوقت ضرورت و مطالبہ مرکز کی تائید و اعانت۔

(ب) میرا مجوزہ اصلاح دارالعلوم اور اعانت معتمد تعلیم کا خاکہ حسب ذیل ہو۔

(۱) انجمن کی نظر میں دارالعلوم کے نظم اسکی تعلیم اور اسکے طریق عمل کے سلسلہ میں جو باتیں مفید ضروری اور مناسب معلوم ہوں، ان کو تفصیل کے ساتھ معتمد صاحب تعلیم اور مجلس انتظامیہ کے علم میں لانا اور اسکی طرف توجہ دلانا

(۲) معتمد صاحب تعلیم سے یہ معلوم کرنا کہ دارالعلوم کے مختلف شعبہ جات کی ترقی و بہتری کے لئے وہ کیا اور کس طرح کرنا چاہتے ہیں۔ طرز تعلیم، نصاب تعلیم، اسٹاف، اقامت گاہوں کے طریق تربیت و نگہداشت وغیرہ کے متعلق معتمد صاحب تعلیم کی رائے اور ان کے ارادوں کی تفصیلات حاصل کرنا، ان کو سمجھنا، اور تمام ندویوں کو اس سے باخبر کرنا، اور پھر باہم ایک فیصلہ کرکے اسکے مطابق معتمد صاحب تعلیم کو مدد دینا تاکہ وہ متعینہ اور معروف طریق پر ندوہ کے مقصد و مفاد کے حصول کے لئے مؤثر قدم اٹھاسکیں اور انہیں جماعت کی تائید حاصل ہو۔

حالات ندوہ

آجکل گرمیوں کا زمانہ ہو، دار العلوم اور اس سے متعلق شعبے بند ہیں، البتہ الندوہ، معین الندوہ کتب خانہ اور بعض دفتری شعبے بدستور کھلے ہوئے ہیں، بلکہ تعطیل کی یکسوئی کی وجہ سے ان شعبوں میں کام کی رفتار کچھ معمول سے زیادہ تیز ہے۔ رائے بریلی میں معین الندوہ کا ایک نیا حلقہ قائم کیا گیا ہے شیخ سرفراز احمد صاحب اس حلقہ کے کارکن مقرر ہوئے ہیں، آجکل وہ ضلع کے قصبات اور دیہات کا دورہ کر رہے ہیں۔ ہمیں اُمید ہو کہ ندوہ کے ہمدرد اُن کی مدد کریں گے۔ خاص لکھنؤ میں خاصی جد و جہد ہو رہی ہو اور ندوہ کے ہمدردوں اور معاونوں کا دائرہ روز بروز وسیع ہوتا جا رہا ہو، اس سلسلہ میں ہم جناب خواجہ قمر الدین صاحب آنریری مجسٹریٹ و جناب حکیم خواجہ شمس الدین صاحب چیرمین ہیلتھ کمیٹی میونسپل بورڈ، شیخ مستنصر اللہ صاحب میونسپل کمشنر اور جناب شیخ محمد نسیم صاحب میونسپل کمشنر کے شکر گزار ہیں کہ انکی عنایت اور توجہ سے اس کام میں کافی مدد مل رہی ہو۔ اُمید ہے کہ انکی کرم فرمائیوں کا سلسلہ بدستور جاری رہے گا۔

تعطیل کی وجہ سے اکثر طلبا اپنے مکان چلے گئے ہیں لیکن بیرون ہند اور ہندوستان کے دور دراز صوبوں کے لڑکے دار الاقامہ میں مقیم ہیں۔ بورڈنگ کے انتظامات مولوی نور الحسن صاحب کے سپرد ہیں مہتمم صاحب بھی وقت کا کافی حصہ یہیں گذار رہے ہیں۔ الاصلاح بند ہے لیکن دار الاخبار کا شعبہ کھلا ہوا ہے تاکہ طلبا رفتار عالم اور واقعات حاضرہ سے پوری طور پر باخبر رہ سکیں

مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ آجکل اپنے وطن دسنہ ضلع پٹنہ میں تشریف رکھتے ہیں

... جون تک غالباً وہیں قیام رہے، جولائی میں دارالعلوم میں تشریف آوری کی توقع ہے۔ اس
درمیان میں مولانا محمد عمران خاں انچارج مہتمم دارالعلوم مولانا موصوف کی ملاقات وزیارت
کی غرض سے دسنہ تشریف لےگئے تھے۔ ایک ہفتہ سے زائد دسنہ اور نواح پٹنہ میں قیام رہا۔ ہر جگہ
ندوہ کے ہمدردوں اور دوستوں نے توقع سے زیادہ بڑھکر پذیرائی کی اور متعدد صحبتوں میں طعام و
کلام سے نوازا۔ پٹنہ میں مولوی مسعود عالم ندوی اور پھلواری میں شاہ غلام الحسنین ندوی اور
شاہ عزالدین ندوی کے یہاں ندوہ کے آئین وفا کے مظاہر نظر آئے۔ میزبانوں کے برادرانہ خلوص
اور عزیزانہ محبت کے نقوش غیر فانی ہیں۔ سید صاحب قبلہ کی بزرگانہ شفقتیں اور کریمانہ نوازشیں
اس سفر کا حاصل اور مسافر کے لئے سرمایۂ سعادت ہیں۔

ربیع الاول کا موسم شروع ہوا تو طلباء دارالعلوم میں بھی جلسۂ سیرت کی تحریک ہوئی لیکن بعض
مجبوریوں کی بناپر چند دن کی تاخیر ہوگئی اور ربیع الآخر (مئی) میں یہ مبارک اجتماع ہو سکا۔ موسم
کی خرابی اور شہر سے ندوہ کی دوری کے باوجود مہمانوں کی اچھی خاصی تعداد نے اپنی شرکت سے
داعیان بزم کو مشرف فرمایا۔ انتظامات تمامتر طلباء ہی کے ہاتھوں انجام پائے۔ اسرار الحق صدر
برلمان اور محمد اقبال ناظم الاصلاح اور ان کے رفیقوں نے بڑے انہماک و توجہ سے کام انجام دئیے۔
صبح ساڑھے سات بجے مولانا عمران خاں صاحب کی صدارت میں جلسہ شروع ہوا قرآن مجید کی
تلاوت اور ایک مؤثر و وجد انگیز عربی نعت کے بعد ایک چھوٹے بچے مزمل یسین نے "آنحضرتؐ کا تعلق
بچوں سے اور بچوں کی اسلامی خدمات" پر مختصر سی تقریر کی۔ اس کے بعد دوسرے طالب علم علی احمد نے "نبیؐ کامل"
کے عنوان سے حضورؐ کی جامعیت کو نمایاں کیا۔ پھر مولوی ابوالحسن علی صاحب اور راقم الحروف نے آنحضرتؐ کے
پیغمبرانہ عظمت و جلال اور معجزانہ نفوذ و اثر کا ذکر کیا۔ بعد ازاں استاد عربی کی قیادت میں طلباء نے عربی کا ایک مؤثر
عسکری ترانہ سنایا۔ اور بالآخر ایک چھوٹے طالب علم نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ اور جلسہ ختم ہو گیا

Regd. No. A-596

صفدر مرزاپوری مرحوم کے تبرکات

بزم خیال جسمیں شعرائے اردو و فارسی کی مجالس کے لطائف و ظرائف کو ترتیب دیا گیا ہے۔ برجستہ گوئی اور حاضر جوابی کے بہترین نمونے دکھلائے گئے ہیں۔ فارسی اور اردو کے ان منتخب اشعار کو لیکر جن کا کسی لطیفہ یا دلچسپ قصہ سے تعلق ہو اسکی مفصل کیفیت بیان کی ہے، خوش مذاق حضرات کیلئے تفریح طبع کا بہترین سامان ہو۔ اسکے ساتھ ادبی اور تاریخی ضیافت ہم خرما و ہم ثواب کی مصداق ہے قیمت عہ/

مشاطۂ سخن اپنی نوعیت کے لحاظ سے دنیائے ادب میں پہلی کتاب ہے جسمیں مسلم الثبوت استاد اور ماہرین فن اساتذہ کی وہ اصلاحیں جمع کیگئی ہیں جو انھوں نے اپنے شاگردان رشید کو دیں۔ اور جنکی بدولت وہ شاعروں کی دنیا میں آفتاب اور ماہتاب بنکر چمکے۔ انتخاب میں صرف انھیں باکمالوں کو لیا ہے جن کا حرف حرف قابل تسلیم ہے اور جن کو اردو دنیا سند مانتی ہے۔ جناب ناسخ، آتش، اسیر، ذوق، غالب، مومن، منیر، نسیم دہلوی، انیس، دبیر، امیر، داغ، تسلیم، جلال ایسی ہستیاں نہیں ہیں کہ جنکی اصلاحیں قابل توجہ نہوں، شاعرانہ مذاق رکھنے والے حضرات کے لئے نایاب تحفہ ہے۔ قیمت۔ ایک روپیہ عہ/

مرقع ادب حصۂ اول ہندوستان کے مشہور انشا پرداز منیر، داغ، جلیل، اکبر، حالی، ریاض، آزاد، برہم، نیر، مدنی وغیرہ جیسے نامور اہل علم کے پُر از معلومات خطوط کا مجموعہ ایک ایک فقرہ موتیوں کی لڑی ہے۔ قیمت۔ ایک روپیہ آٹھ آنے (۱۸)

مرقع ادب حصۂ دوم اس کتاب میں وہ خطوط جمع کئے گئے ہیں جنھیں ملک کے نامور ادیب اور سربرآوردہ حضرات نے ایک دوسرے کے نام لکھا ہے، اسمیں کا حرف حرف سند ہے۔ ہر ہر فقرہ موتیوں کی لڑی ہے۔ زبان سیکھنے کے لئے موجودہ زبان اردو کا بہترین مرقع ہے۔ ادبی خوبیوں کے علاوہ بہت سے نامور اور باکمال شعرا اور مشاہیر کے سوانح زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔ ایک دوربین نظر کے لئے کاتب اور مکتوب الیہ کا خاصہ تذکرہ ہے۔ اکثر خطوط میں شاعرانہ نکات و حقائق پر بحث ہوئی ہے کہیں شاعرانہ نوک جھونک ہے، کہیں معاصرانہ چھیڑ چھاڑ، کہیں لطیف ظرافت آمیز چٹکلے، قیمت دو روپیہ عا/

دونوں حصوں کی مجموعی قیمت صرف تین روپئے ؎

ملنے کا پتہ:- **صدیق بک ڈپو لکھنؤ**

پبلشر سید حامد علی ندوی، پرنٹر بلند کے لال سکسینہ، مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ

مجلس ندوۃ العلماء کا ماہوار رسالہ

الندوہ

جس کا مقصد

مسلمانوں کی تعلیمی اور تعمیری خدمت ہے

مرتبہ

سید ابوالحسن علی ندوی

استاذ تفسیر و ادب

عبدالسلام قدوائی ندوی

استاذ تاریخ و اقتصادیات

الندوہ

زیرِ نگرانی

علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ

جلد ۱ جمادی الثانی سنہ ۱۳۵۹ھ مطابق جولائی سنہ ۱۹۴۰ء نمبر ۷

قیمت فی پرچہ تین آنے سالانہ دو روپے

تمام خط و کتابت اور ترسیل زر حامد علی ندوی منیجر رسالہ الندوہ بادشاہ باغ لکھنؤ کے پتہ پر ہونی چاہئے

شذرات

اب سے چالیس پچاس برس پہلے دین و ملت کے چند خدمت گذاروں نے اصلاح و تجدید کے جو نقشے بنائے تھے ان کی صداقت روز بروز عیاں ہوتی جا رہی ہے اب اس سے کسی کو انکار نہیں کہ دین و دنیا کی "ہم آمیزی" ہی وہ اکسیر بن سکتی ہے جس پر مسلمانوں کے امراض مزمن کی شفایابی منحصر ہے۔ ضرورت ہے کہ اب یہ خیالات عمل کا جامہ پہنیں اور اس اکسیر کی تیاری کے لئے زیادہ سے زیادہ معمل قائم ہوں تاکہ قوم کی دیرینہ شکایتوں کا خاتمہ ہو، اور شہر و صحرا کی نئی بنیادوں پر قصر ملت کی تعمیر ہو۔

الندوہ کے حلقے میں یہ خبر مسرت سے سنی جائے گی کہ ملک کے دور دراز صوبے میں بھی مغربی تعلیم کو رواج دینے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اراکان کے علاقہ میں منگڈو کے قریب نانگچنگ (   ) میں مولوی افلاطون احمد ندوی اور مولوی سکندر احمد ندوی نے ایک عربی درسگاہ قائم کی ہے نصاب و نظام تعلیم میں دینی علوم کے ساتھ زمانہ کی جدید ضرورتوں کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے فی الحال متوسطات تک تعلیم کا انتظام ہے۔ مدرسہ کے کارکنوں کی رائے ہے کہ اسے ندوہ کے اصول پر چلایا جائے نام بھی مدرسۃ الندوہ تجویز ہوا ہے۔ خدا کرے مولوی افلاطون احمد ندوی اور مولوی سکندر احمد ندوی کی کوششیں بارآور ہوں اور برما میں دین و ملت کی خدمت کا ایک مضبوط مرکز قائم ہو جائے۔ ہمیں امید ہے کہ برما اور ہندوستان کے مخیر اور علم دوست مسلمان اس کار خیر میں حصہ لیں گے اور دین و مذہب کی اشاعت میں مدرسہ کے کارکنوں کی مدد کریں گے۔

اس موقعہ پر ندوہ کے ہمدردوں اور دوستوں کی واقفیت کے لئے ایک اطلاع اور بھی ضروری ہے عرصہ سے مجمع الجزائر ملایا کے طالب علموں کی ایک خاصی تعداد ندوہ میں تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ دو برس ہوئے

کہ ان میں سے ایک طالب علم مولوی محمد عدنان نے سند فراغ حاصل کی اور وطن واپس ہوے ابھی حال میں یہ معلوم کرکے خوشی حاصل ہوئی کہ وہاں لوگوں نے ان کی بڑی پذیرائی کی میڈن (   ) میں جمیعۃ العلمیہ کالج میں پرنسپل کا عہدہ تفویض ہوا ہے علمی ذوق ندوہ ہی سے نمایاں تھا آج کل سیرت النبی کا جاوی زبان میں ترجمہ کر رہے ہیں جاوا کے مشہور رسالہ ڈیوان اسلام (   ) میں متعدد ابواب شایع ہو چکے ہیں خدا کرے عزیز موصوف کو دین وملت کی خدمت کا بیش از بیش موقع ملے۔

علمی اور اصلاحی حلقے صاحب الشہاب استاذ عبدالحمید ابن بادیس الجزائری سے بخوبی واقف ہونگے الجزائر کی ایک فسوبی اطلاع سے یہ معلوم کرکے صدمہ ہوا کہ ۸ ربیع الاول کو آپ نے وفات پائی انا للہ وانا الیہ راجعون مرحوم الجزائر کی جمعیۃ العلماء کے صدر اور وہاں کی اسلامی تحریکوں کے روح رواں تھے مرتے دم تک دین وملت کی خدمت سے غافل نہیں رہے انتقال کے وقت دعا رایقوبی رب انی مسنی الضر وانت ارحم الراحمین زبان پر تھی،

عربی مدارس
واجبات و فرائض

از ابوالحسن علی ندوی

پچھلے نمبر میں ایک مضمون میں عربی مدارس کی اہمیت اور ضرورت پر کچھ عرض کیا گیا تھا جس میں ان اداروں کے قیام و بقا کے لئے یہ کافی نہیں کہ اسکے بنیادی مقاصد نہایت اہم اور ضروری ہیں، اسکی سابقہ خدمات نہایت شاندار ہیں، اور مستقبل میں اسکے بڑے اچھے امکانات اور نیک نتیجے ہیں، یہ زمانہ تنازع للبقا کا ہے اور تنازع بھی صرف مادی و جسمانی نہیں بلکہ ذہنی، اجتماعی اور اخلاقی تنازع بھی، خیالات و افکار، نظریات و رجحانات، نقطہائے نظر ... مختلف اخلاقی فلسفے، مختلف اجتماعی سسٹم، مختلف سیاسی نظریے مسلسل آویزش اور مقابلہ میں ہیں، زندگی نے اپنی شاہراہ سے ہٹ کر ... کرنے کے لئے زندہ اشخاص کو بھی اور بامقصد اداروں کو بھی سخت کشمکش اور جد و جہد کی ضرورت ہے اور بقاء اصلح کا قانون ہمیشہ کی طرح اسوقت بھی جاری ہے۔

عربی مدارس کے وہ بلند مقاصد جنکو ہم نے اپنے پہلے مضمون میں اختصار سے بیان کیا ہے اور جنکو اس سے زائد اختصار کیساتھ دو لفظوں میں نیابت انبیاء سے ادا کیا جا سکتا ہے کچھ پیغمبروں ہی کی سی جد و جہد اور قربانی چاہتے ہیں حدیث العلماء ورثة الانبیاء کو حدیث اشد الناس بلاءً الانبیاء فالامثل ثم الامثل کیساتھ ملا کر پڑھیے، اشخاص کے فرائض اداروں میں شریک ہو کر ختم نہیں ہوتے، بلکہ کچھ بڑھ جاتے ہیں۔ ادارہ نام ہے منتشر اشخاص کی وحدت اجتماعیہ کا اس لئے جو فرائض اشخاص کے ہیں وہ انکے مجموعے کے بھی ہیں۔

مدارس کے کچھ فرائض اندرونی ہیں کچھ بیرونی۔ اندرونی سے مراد وہ کام ہیں، جو مدارس عربیہ کے اصحاب اور متعلمین کو مدرسہ کے اندر انجام دینے چاہئیں۔ بیرونی سے مراد وہ خدمات ہیں جنکا تعلق مدارس کی چار دیواری سے باہر کی دنیا سے ہے۔ ہم سب سے پہلے مدارس کے داخلی فرائض سے بحث کرتے ہیں اور اپنی اہمیت کے لحاظ سے انکو ترتیب

سے ذکر کرتے ہیں۔

(۱) **ذہنی تشکیل**: اہلِ علم جانتے ہیں کہ "اسلام" ایک مخصوص "عقلیت" ہے جو خاص تعلیم و تربیت، خاص ماحول اور اہتمام سے پیدا ہوتی ہے یہ ضروری نہیں کہ مسلمان قومیت کا ہر فرد اسلامی ذہن بھی رکھتا ہو، جن لوگوں کی اسلام کی ذہنی تاریخ پر نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ بہت سے اسلامی عہدوں میں مسلمان جسم میں جاہلی دماغ ترکیب پا گیا ہے۔ اور آج تو یہ ذہنی امتزاج اور عقلی پیوند بندی بہت عام ہے، ہم کو یہ خطرہ ہے کہ زندگی کے متعلق غیر اسلامی تصورات، اور سیاسیات و معاشرت کے غیر اسلامی نظریات جن کے اثر سے اس وقت بر و بحر اور علم کلام کے الفاظ میں "شواہق جبال" کے رہنے والے محفوظ نہیں ہیں، حمل و نقل، نشر و اشاعت کے وسائل، پروپیگنڈے کے جدید طریقوں اور اختلاط و اجتماع کے امکانات کی کثرت کی وجہ سے مدارس کی محفوظ دنیا میں بھی پہونچ رہے ہیں، اور یہ دینی نظام اور مذہب کے مستقبل کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے۔

ذہنی تشکیل سے ہماری مراد اس کا وسیع مفہوم ہے، اس سلسلہ میں عقائد بھی آتے ہیں حقائق بھی اور طرز فکر اور نقطۂ نظر بھی۔

یہ ضروری ہے کہ اہلسنت کے متفق علیہ عقائد، طالب علم کے دماغ کی گہرائیوں میں اس طرح اتار دیئے جائیں کہ پھر انکے نکلنے کا خطرہ نہ رہے، اس کا دماغ الحاد کے ادنیٰ شائبہ اور انحراف سے محفوظ کر دیا جائے۔ اسکو اسلامی عقائد پر راسخ اور غیر متزلزل یقین ہو، اسکی قوت و استحکام مدارس کی کامیابی، مستقبل کی تعمیر، اور "امت مسلمہ" کی فلاح، عقائد کی ایسی ہی پختگی یقین کے اسی استحکام پر موقوف ہے، زندگی اور اس سے بڑھکر فتح و تسخیر کے لئے یقین محکم سے زیادہ کوئی چیز اہم اور شک و تذبذب سے زیادہ کوئی مرض مہلک اور خطرناک نہیں ہے، "وہ ایمان" ہے جو اسلامی جسم کا خون زندگی اور روح ہے۔ اور یہی وہ بنیاد ہے جس پر امت کے پورے قصر کی تعمیر ہے۔

اسلامی حقائق میں سے ہم صرف چند حقیقتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں، پہلی حقیقت یہ کہ محمد رسول اللہ کا بتایا ہوا راستہ انسانیت کی منزل مقصود کا تنہا راستہ ہے، انسانوں کا قافلہ دشت میں بھٹکا ہوا ہے اور ناپیدا کنار

[illegible] روشنی کا مینار صرف اسلام ہے، انسانیت نزع کے عالم میں ہے اور آب حیات صرف [illegible] ہے، اخلاق و معاشرت، مذہب و سیاست کا جو نظام آپ نے پیش کیا زندگی کا وہی تنہا نظام ہے، اس نظام کے مقابلے میں نظام ضلالت، وگمراہی اور حماقت و سفاہت ہے غیر اسلامی نظام [illegible] غلطی و خرابی کا یقین بھی اسی قوت کا ہونا چاہئے جس قوت کا یقین اسلامی نظام کی درستی اور برتری کا ہے لاالٰہ کی نفی میں بھی وہی شدت و قوت ہونی چاہئے جو الا اللہ کے اثبات میں ضروری ہے اسلامی نظام حق پر ایمان لانے اور اس کے [illegible] کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ہر متوازی نظام کا انکار کیا جائے وماذا بعد الحق الا الضلال ابراہیم علیہ السلام نے اپنے ایمان کے اعلان کے ساتھ یہ اعلان بھی کیا تھا کفرنا بکم وبدا بیننا وبینکم العداوۃ والبغضاء (اے منکرین حق) ہم تمہارے منکر ہیں اور ہمارے تمہارے درمیان دشمنی اور بغض پیدا ہو گیا ہے کفرنا بکم کے اس جملہ میں بت شکنی کی وہی روح کام کر رہی ہے اور توحید خالص کی وہی سطوت، جلال اور وہی جذب و استغراق ہے جو آپ پر اسوقت طاری ہوگا جب آپ اپنے گرز سے آذر کے بتخانہ میں بتوں کو توڑ رہے تھے بلکہ یہ زبانی جملہ اس ضرب سے بڑھا ہوا ہے، اس ضرب میں آپنے قوم کے باطل معبودوں کو توڑا تھا لیکن اس ایک ضرب میں آپنے انکے تمام باطل دیوتاؤں اور ذہنی و روحانی بتوں کو پاش پاش کر دیا۔ اہل ذوق اس جملہ کی گہرائی اور وسعت تک پہونچ سکتے ہیں۔ آپنے یہ نہیں فرمایا کہ میں نے تمہارے عقائد اور تمہارے بتوں کا انکار کیا بلکہ فرمایا کہ ہم سراسر تمہارے منکر ہیں، اس میں انکا پورا نظام زندگی اور پورا فلسفۂ زندگی آگیا۔

عوام کے مقابلہ میں علماء کو یہ امتیاز ہونا چاہئے کہ وہ اسلامی نظام سے دوسرے نظاموں کا تقابل کرکے اسلامی نظام کی برتری کو علمی حیثیت سے بھی سمجھتے ہوں اور اس علم و تحقیق سے انکے ایمان، اسلامی نظام کی محبت و ترجیح اور غیر اسلامی نظاموں کی نفرت میں اور اضافہ ہونا چاہئے۔

اس علم و نظر سے بڑھکر انکو دنیا میں اس نظام کو قائم کرنے کا جذبہ اور ولولہ ہو اور وہ اسکے پرجوش

داعی اور مبلغ ہوں، اور ان میں اس کے لئے قربانی اور ایثار کا جذبہ ہو بات بڑی ہے لیکن حق ہے کہ انکو اس کا ایسا جذبہ اور اسکی ایسی سچی لگن ہو جیسے اس شخص کو ہوتی ہے جو یہ دیکھ رہا ہو کہ گھر میں آگ لگی ہوئی ہے، سب بے خبر ہیں اور اس کی صرف اسی کے پاس ہے اور صرف اسی صورت میں کسی انقلاب و اصلاح کی امید ہو سکتی ہے، کم سے کم انکو اس نظام کی تبلیغ و قیام کا اتنا جوش اور اس کے لئے قربانی کا اتنا جذبہ تو ضرور ہونا چاہئے جتنا باطل نظاموں کے حامیوں اور مبلغوں کو ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بات بار بار کہنے کی ہے کہ اسلام کے نظام کی محافظ اور صحیح ہمدرد صرف علماء اور اہل دین کی جماعت ہے، اور اسلامی تاریخ میں اس کا تجربہ بار بار ہوا، بادشاہوں شاہی خاندانوں، اور حکومت کے دعویداروں کی جنگوں اور آویزشوں میں لوگ بھول جاتے ہیں کہ ان جنگوں کی تہ میں بعض اوقات اصول اور زندگی کے فلسفوں کی باہم آویزش اور کشمکش کام کر رہی تھی، ایک فلسفہ یہ تھا کہ مذہب کو اقتدار اعلیٰ حاصل ہو زندگی اور معاشرت مذہب کے تابع ہو، مذہبی قوانین و احکام اور خدا کے حدود و تعزیرات نافذ ہوں، مادیت و بہیمیت مغلوب ہو عیش و عشرت اور اسراف کم ہو۔ اخلاقی اصلاح ہو شخصی آزادی کے حدود مقرر رہوں مذہب میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہو۔ اس فلسفہ کے داعی اور حامی امت کا دیندار طبقہ اور علمائے دین تھے، دوسرا فلسفۂ زندگی یہ تھا کہ اقتدار اعلیٰ آزاد ہو، زندگی اور معاشرت مذہب و اخلاق کے پابند نہوں کسریٰ و قیصر کے طرز کی سلطنت ہو، دنیا میں زیادہ سے زیادہ تمتع اور لطف اندوزی کا موقع ملے۔ بادشاہ کی آزادی غیر محدود اور رعیت صرف اخلاقی طور پر آزاد (یعنی محرمات و منکرات کے ارتکاب میں اس سے کوئی تعرض نہو اور کسی قسم کی اخلاقی پابندی نہو) اور ہر طرح سے غلام ہو معاشرت و اجتماع کی ہر قسم کی غیر اسلامی تشکیل اور مذہب میں ہر زمانہ کے مطابق ترمیم اور غیر مقید تجدد ہو سکتا ہے۔ اس فلسفہ کے حامی دنیادار امراء و سلاطین اور مسلمانوں کا غیر تربیت یافتہ طبقہ تھا۔ یہ دونوں فلسفے خلافت راشدہ کے بعد سے اس وقت تک موجود ہیں اور آخرالذکر فلسفہ اور نظام حیات کے حامیوں کی ہر زمانہ میں اکثریت رہی ہے، اس حقیقت پر بھی علماء کی نظر ہر وقت

زندگی پر چھائے ہوئے [illegible] مسلمانوں کی کامل اور صحیح قیادت کے اہل صرف وہ ہوسکتے ہیں، اور مسلمانوں کی متوازن اور متناسب زندگی صرف انھیں کی رہنمائی میں ممکن ہے، خلفائے راشدین اور حضرت عمر بن عبد العزیز کا دور حکومت اس بات کا بہترین ثبوت ہے۔ بدقسمتی سے دین و سیاست کی فصل و تفریق اور اہل دین و اہل سیاست کی تقسیم کا جاہلی نظریہ اور علماء کی [illegible] سیاسی و دنیاوی [illegible] اہمیت کا خیال [illegible] ذہن و دماغ سے [illegible] علاوہ مخالف دین جماعتوں اور اشخاص کے [illegible] کو [illegible] جب [illegible] اپنے فہم و تدبر، اپنے ایثار و قربانی اپنی قوت عمل، اپنے اخلاص و للہیت و اپنی [illegible] کی پختگی اور استقامت سے [illegible] کو پیچھے ہٹا کر مسلمانوں کی زندگی پر غلبہ اور نفوذ حاصل کرلینا چاہئے قوت عمل اور ایثار میں مسلمانوں کی دوسری جماعت انکی حریف نہیں ہوسکتی اس لئے انکو جماعتی اقتدار اور عصبیت یا اہمیت کی بنا پر نہیں بلکہ اسلامی نظام کی اور اسلام کے قدیم اور مستند معیار زندگی کو قائم کرنے کے لئے، اور اس کے [illegible] کو واپس لانے کے لئے اپنی قربانیاں پیش کرنی چاہئیں۔ اور اس مقصد سے میدان میں آنا چاہئے، اس [illegible] جس علمی و ذہنی تیاری اور تربیت کی ضرورت ہے، مدارس کو اس سے ہرگز غفلت نہیں کرنی چاہئے اسکی کوشش کرنی چاہئے کہ زندگی کے کسی اہم اور مؤثر شعبہ میں غیر دیندار اور غیر علماء کی رہنمائی کی ضرورت نہ پیش آئے، اور حتی الامکان علماء نظر انداز اور فراموش نہ ہونے پائیں، اور انکی رہنمائی و امداد سے استغنا نہ پیدا ہونے پائے، غیر دیندار جماعتوں اور ملحدوں نے انھیں نازک راستوں سے امت کے دماغوں پر استیلا اور انکی روزمرہ زندگی پر نفوذ حاصل کیا، اسی بنا پر امام غزالیؒ نے اپنے زمانے کے علماء اور طلبہ کو جو غیر ضروری علوم میں مشغول تھے یہ کہکر فن طب کی طرف متوجہ کیا ہے کہ ہمارے بڑے بڑے اسلامی شہروں میں غیر مسلم یہودی اور نصرانی طبیب ہیں، اور مسلمان انکے محتاج اور ان سے متاثر ہوتے ہیں[1]

اس سلسلہ میں جن جدید علوم و السنہ کی ضرورت ہو علماء کو بلا تامل انکی طرف توجہ کرنی چاہئے لیکن شرط یہ ہے کہ یہ سب تمامتر دین کی خدمت و حفاظت اور مذہب کے فروغ کے لئے ہو، اس وقت یہ جہاد ہوگا،

---

[1] احیاء العلوم

اور یہ تیاری واعدوا لہم ما استطعتم من قوۃ میں داخل ہوگی، ان عقائد وحقائق کے علاوہ طریق فکر، طریق بحث، مباحث ومسائل میں نقطۂ نگاہ، زندگی کا مقصد ومعیار اور روح خالص اسلامی ہونی چاہئے۔ ان کے نزدیک آخرت دنیا پر مقدم ہو، مادیت کا غلبہ اثر نہ ہونے پائے، ہر چیز میں نیت خدا کی رضا اور اس کے نام کی بلندی ہو، یہ متاع کارروان ہے اور اسکی گم شدگی سے جماعت علماء کا امتیاز جاتا رہے گا۔

(۲) سیرت کی تعمیر زندگی کی کشمکش میں ایمان ویقین کے بعد سب سے ضروری چیز پختہ سیرت اور بلند اخلاق ہیں، قومیں اور جماعتیں انھیں دونوں بنیادوں پر دوسری قوموں اور جماعتوں پر فتح پاتی ہیں خود مسلمانوں نے قرن اول میں اپنی معاصر وحریف قوموں پر جو تعداد میں اسلحہ میں، مادی ساز وسامان میں ان سے کہیں بڑھی ہوئی تھیں ایمان واخلاق ہی کی خصوصیتوں کی بنا پر فتح پائی آج بھی اشخاص اور جماعتوں کے پرواز کے لئے یہی دو بازو ہیں بڑے سے بڑا علم حسن سیرت کے بغیر ناکافی بلکہ اپنے اور دوسروں کے لئے فتنہ اور مضر ہے، اہل علم ونظر کے سامنے خصوصًا ایسے زمانہ میں جس میں علم بڑھتا جا رہا ہے اور سیرت واخلاق میں روز افزوں انحطاط ہے، اور جبکہ غیر مذہبی درسگاہوں کے طلبہ وفضلا کے اخلاق اپنی درسگاہوں کے لئے، اداروں کے لئے، سوسائٹی اور خاندانوں کے لئے، وبال جان بنتے جا رہے ہیں اس حقیقت کی زیادہ توضیح وتشریح کی ضرورت نہیں، طلبہ کو مستقبل قریب میں زندگی کے جس معرکہ اور جماعتوں اور اصولوں کی جس رزم آرائی میں شرکت کرنی ہے اس میں اپنے اصولوں کی دعوت وتبلیغ کے لئے اپنے مذہب وجماعت کے وقار کے لئے جس قدر بے داغ سیرت، اعلیٰ کیرکٹر، بلند ہمت استغنا، خودداری اور نزاہت کی ضرورت ہے کسی چیز کی نہیں، ان ہتھیاروں سے وہ زندگی کا بڑا سے بڑا معرکہ فتح کر سکتے ہیں اور ہمارا خیال ہے کہ اس میں ہمارے مدارس کے فضلا غیر مذہبی لوگوں سے زیادہ کامیاب ہو سکتے ہیں اس لئے کہ ہمارا مشاہدہ اور بار بار کا تجربہ ہے کہ مذہبیت اور اچھی صحبت وتربیت کے بغیر اعلیٰ اور مستحکم سیرت نہیں پیدا ہوتی، اور اس کا سامان اس عام مذہبی واخلاقی تنزل کے زمانہ میں بھی جتنا عربی مدارس میں ہے دوسری جگہ ناپید ہے۔

اور کے ساتھ اس حقیقت کے بھی اظہار کی ضرورت ہے کہ علماء کی دینی سطح عوام کی سطح سے بلند ہونی چاہئے تب ہی وہ موثر ہو سکتے ہیں، عوام میں دینداری پیدا کرنے کے لئے، انہیں مذہب کا رنگ اس کا ذوق و شوق پیدا کرنے کے لئے اور ان کے عقائد و اعمال و رسوم کی اصلاح کے لئے گہرے اور شوخ مذہبی رنگ، مذہبی شوق اور تجدیدی و اصلاحی رنگ کی ضرورت ہے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر علماء کا خاص فریضہ اور ان کا مقصد آفرینش ہے۔ اس میں انکو تساہل سے کام نہیں لینا چاہئے کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر اور ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف الخ کے مصداق اگر علماء نہوں تو کون ہو سکتا ہے اس بارے میں انکو حضرت مجدد سرہندیؒ حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ اسمٰعیل شہید کا نمونہ سامنے رکھنا چاہئے، جنکی توجہ اور ہمت سے ہندوستان میں عظیم الشان دینی انقلاب رونما ہوا جو دوسرے ممالک کے لئے قابل رشک ہے۔

(باقی)

جامعہ ازہر

از مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب ندوی متخصص جامعہ ازہر

(۳)

ازہر کا قدیم نظام ابتدا میں جب ازہر نے ایک مدرسہ کی شکل اختیار کی تو اس کا نظام نہایت سادہ اور سہل تھا جسکی بنیاد تقوی طہارت اور علم و اہل علم کے احترام پر قائم تھی۔

شیخ الازہر ہی ازہر کا سب کچھ ہوتا تھا، چھوٹی چھوٹی چیزوں سے لیکر اہم سے اہم امور کا مختار کل وہی تھا۔ اس کا ہر قول قانون اور اس کا ہر حکم قابل نفاذ، کسی کو اس کے حکم کے خلاف چون وچرا کی گنجایش نہیں کسیکی یہ مجال نہیں کہ اس کے حکم سے سرتابی کر سکے، ہبات وعظیات کی تقسیم و تعیین علماء و مدرسین کو شہادت واجازت دینے کے اختیارات غرض ازہر سے متعلق جو کچھ تھا اس کا تنہا مختار کل شیخ الازہر تھا اگر کوئی بہت ہی اہم اور دشوار تر امر پیش آگیا تو بعض اکابر علماء سے مشورہ لے لیا اور بس۔

طالب علم بھی جو ازہر میں داخل ہوتا تھا وہ بغیر کسی شرط وقید کے داخل ہوتا تھا، مختلف علماء جو ازہر کے مختلف گوشوں میں درس دیتے تھے ان میں سے ہر ایک کے پاس وہ بیٹھتا، درس سنتا بحث ومناقشہ کرتا جن اساتذہ کو وہ سمجھتا کہ وہ ان سے استفادہ کر سکتا ہے ان کی صحبت میں رہتا ان کے درس میں شرکت کرتا، اور ان سے حصول علم کی ہر ممکن کوشش سے دریغ نہ کرتا، حصول علم کے لئے آج کل کی طرح عمر یا سالوں کی قید نہ تھی، جبتک وہ اپنے میں خامی پاتا حصول علم میں مشغول رہتا جب وہ یہ محسوس کرتا کہ اب وہ علم حاصل کر چکا اور اس قابل ہو گیا ہے کہ دوسروں کو فائدہ پہونچا سکے تو اپنے اساتذہ سے اجازت طلب کرتا کہ اسکو درس دینے کی اجازت دیجائے اجازت ملنے پر مسجد ہی کے ایک حصہ میں وہ بھی بیٹھ جاتا اور یوں کہنا چاہئے کہ امتحان کے لئے اساتذہ کی بجائے طلبہ کے سامنے اپنے آپ کو پیش کرتا، اگر طلبہ نے اس کی طرف رجوع کیا اسکے حلقہ درس میں شرکت شروع کر دی تو وہ پاس ہے اور اس وقت شیخ الازہر اس کو آخری طور پر عالم ہونے کی اجازت (سند) دیتا تھا۔

چونکہ ازہر کی بنیاد ہی دینی تعلیم کے لئے تھی اس لئے طریقہ درس میں بھی وہی طریقہ رائج تھا جو سلف صالح کا تھا۔ درس کے حلقے قائم ہوتے، طلبہ استاد کے گرد حلقہ بنا کر بیٹھتے تھے اور استاد حلقہ کے صدر مقام پر بیٹھتا کبھی اونچی چوکی پر بیٹھتا تاکہ طلبہ کے اس جم غفیر تک اس کی آواز پہونچ سکے جو اس کے حلقہ درس میں شریک ہیں۔

تعلیم کا طریقہ املائی تھا یعنی استاد طلبہ کو مختلف علمی اور دینی مسائل پر درس بیان کرنے کے بعد لکھوا دیتا تھا اس کے بعد جب کتابیں بکثرت تالیف ہو کر رسائل شرکائی ہو گئے تو کتابوں کی تعلیم شروع ہو گئی۔ اور اسی وقت مولفین کے عبارتوں بحث و مناقشہ کا مرکز ہو گئیں، مولف نے کیا کہا؟ اس کے کیا کیا مطلب ہو سکتے ہیں؟ ایک نے جو تعریف کی اس پر اعتراض سوال و جواب یہی مناقشہ علم کا اصل معیار ہو گیا، یہیں سے کتابوں کی شرحیں شرحوں کی شرحیں اور ان شرحوں کے حواشی لکھے گئے۔

ازہر میں پہلے جو علوم پڑھائے جاتے تھے ۱۸۶۷ء میں پیرس میں ایک نمائش کے سلسلہ میں ازہر سے متعلق بعض معلومات بھیجنے کی بنا پر حکومت مصریہ نے شیخ ازہر سے دریافت کیا کہ ازہر میں کیا کیا علوم پڑھائے جاتے ہیں شیخ کی طرف جو علوم لکھے گئے وہ حسب ذیل تھے۔

الفقہ - الاصول - التفسیر، الحدیث روایۃ و درایۃ، التوحید، المنطق، النحو، الصرف، المعانی والبدیع متن اللغۃ، الوضع، العروض والقافیہ، الحکمۃ الفلسفیہ، التصوف، المنطق، الحساب، الجبر والمقابلہ، الفلک الہیئۃ۔

ان علوم کے نقل کرنے کے بعد لکھا ہے یہ علوم مذکورۂ بالا عام طور سے متداول ہیں اور ان کو طلبہ اپنے درجات کے لحاظ سے حاصل کرتے ہیں اسکے علاوہ، علوم ہندسہ، طبیعہ، موسیقی، اور تاریخ بھی صرف وہ لوگ پڑھتے ہیں جو ان علوم کا ذوق رکھتے ہیں اور ان کے حصول کی استعداد ان میں ہوتی ہے لیکن ان علوم کو پڑھنے والے اور ان سے دلچسپی لینے والے بہت ہی کم ہیں۔

ازہر میں ایسے علما بھی تھے جو علوم دینیہ کے علاوہ علوم عقلیہ بھی اچھی طرح جانتے تھے، مثال کے طور پر شیخ احمد عبد المنعم الدمنہوری متوفی ۱۱۹۲ھ کا خلاصہ ذیل کی سند میں نقل کرتے ہیں۔

انہ تلقی فی الازہر العلوم الآتیہ، ولہ تالیف فی کثیرھا وھی الحساب والمیقات، والجبر والمقابلہ والمنحرفات. اسباب الامراض وعلاماتھا وعلم الاصطرلاب والزیج والھندسۃ والھیئۃ وعلم الارتماطیقی وعلم المزاول وعلم الاعمال الرصدیہ وعلم الموالید الثلاثۃ وھی الحیوان والنبات والمعادن وعلم استنباط المیاہ وعلاج البواسیر وعلم التشریح وعلاج لسع العقرب وتاریخ العرب والعجم۔

ازہر کا پہلا قانون جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ ازہر کا کوئی قانون اور کوئی باضابطہ قاعدہ داخلہ خارجہ اور دوسری ضروریات کے لئے نہ تھا یہاں تک کہ ضروریات نے مجبور کیا کہ ازہر کے نظام کو باضابطہ کرنے کے لئے قانون بنایا جائے۔

چنانچہ سب سے پہلا قانون ازہر کا اسماعیل پاشا مرحوم والی مصر کے عہد ۱۲۸۸ھ (۱۸۷۲ء) میں بنا۔ اس وقت شیخ الازہر محمد العباسی المہدی تھے جس میں ازہر کی سند حاصل کرنے کا طریقہ اور مواد تعلیم کا تعین کیا گیا، شہادت کا نام عالمیہ رکھا گیا۔ پاس ہونے والے طلبہ تین درجوں پر تقسیم کئے گئے اول، دوم، سوم، اور یہ طے پایا کہ شہادت والی مصر کے دستخط سے دی جائے۔

اس کے بعد اس قانون میں مختلف عہد حکومت میں حذف اضافہ ہوتا رہا۔ اور ضروریات کی زیادتی کے ساتھ قوانین کے دفعات میں اضافہ ہوتا رہا۔ یہاں تک ۱۹۱۱ء میں قانون نمبر۱ اصلاح ازہر کے لئے بنایا گیا، اس وقت ازہر کے شیخ الازہر شیخ سلیم البشری تھے، اس قانون کی ترتیب سے جامع ازہر نے ترقی کا ایک اہم قدم اٹھایا۔ مواد تعلیم میں اضافہ کیا گیا شیخ کے اختیارات کی تعین کی گئی

ازہر شیخ الازہر کی صدارت ایک مجلس منتظمہ کا قیام عمل میں آیا جس کا نام مصر کی اصطلاح میں "مجلس الازہر
الاعلیٰ" ہے۔ جدید اصلاحات کے لئے قوانین و نظم بنایا گیا، مذاہب اربعہ میں سے ہر مذہب کے لئے ازہر میں ایک
شیخ مقرر کیا گیا۔ ان تمام اصلاحات اور ترمیمات کے بعد بھی ضرورت تھی کہ اسکو اور زیادہ باقاعدہ اور
معلومات زمانہ کی ترقی یافتہ یونیورسٹیوں کے مقابلہ کی درس گاہ بنائی جائے، اس ترقی کی بنیاد ۱۹۲۸ء
میں پڑی جب ازہر کے موجودہ شیخ محمد مصطفیٰ المراغی شیخ الازہر ہوئے۔ انھوں نے ازہر کی اصلاح و ترقی
کے لئے بہت دور رس قدم اٹھائے۔ ازہر کی تعلیم کو جو ازہر کی وسیع مسجد میں پھیلی ہوئی تھی منظم کرکے معاہد اور
کلیات کی بنیاد ڈالی۔ اور تعلیم کے چار مرحلے ابتدائی، ثانوی، عالی اور تخصص قرار دئے۔ ابتدائی اور ثانوی
تعلیم میں تمام طلبہ کے لئے یکساں تعلیم لازم رہی۔ عالی تعلیم میں تین کلیات (کالج) بنائے گئے جس میں
ہر شخص اپنے ذوق و رجحان کے بموجب داخل ہو اور تعلیم حاصل کرے۔ ہر کلیہ کے ساتھ اس سے متعلقہ تخصصات
کے درجے قائم کئے۔

اس پوری اصلاح کا نقشہ شیخ مراغی کا تیار کیا ہوا تھا لیکن ان کے تقرر کو ایک ہی سال ہوا
تھا کہ شاہ فواد مرحوم کے اور شیخ کے درمیان بعض اختلافات رونما ہوئے اور جسکی بنا پر مراغی صاحب
نے استعفیٰ دیدیا، اور ان کے بعد شیخ محمد احمدی الظواہری شیخ الازہر مقرر ہوئے۔ اصلاح ازہر کا جو نقشہ
شیخ مراغی نے بنایا تھا وہ کچھ حذف و اضافہ کے بعد قابل قبول سمجھا گیا اور ۱۹۳۰ء میں قانون ۴۹ بنا جس میں
ازہر کی اصلاح شدہ شکل کو قابل عمل قرار دیا گیا (تفصیل آگے آتی ہے)، اور ۲۸، ۲۹ مارچ ۱۹۳۳ء کو شاہ
فواد نے ازہر کی تینوں کلیات (کالج) کا سرکاری طور پر افتتاح کیا اگرچہ تعلیم ۱۹۳۱ء کے آخر میں شروع
ہوگئی تھی۔

آخری قانون جس میں نظام تعلیم و نظام اداری کی اصلاح کرکے ازہر کو جدید اعلیٰ ترین یونیورسٹیوں
کے مقابلہ پر لایا گیا ہے وہ قانون ۱۰۳ بابتہ ۱۹۶۱ء ہے اس میں نہ صرف عربی و دینی تعلیم کی اصلاح کی گئی ہے

بلکہ ضروریات زمانہ سے مجبور ہو کر ازہری قدامت پرستوں کے مخالفت کے باوجود شیخ مراغی کی کوششوں سے علوم جدیدہ بھی داخل کئے گئے ہیں، حساب جغرافیہ۔ جامیٹری، تاریخ ابجرا، سائنس، انگریزی، فرینچ، اور کسی ایک شرقی زبان کی تعلیم بھی لازمی قرار دیگئی ہے، اور ہندوستان کے فخر کے لئے یہ کافی ہے اس کے بعض دوربین علماء نے آج سے ۵۰ برس پہلے جس چیز کو محسوس کرلیا تھا کہ اب ایسے علماء کی ضرورت ہے جو دین و دنیا دونوں سے واقف ہوں اس کو ازہر والوں نے بہت بعد میں محسوس کیا، دوربین زمانہ شناس ہندوستان کے علماء نے جس ضرورت کو محسوس کر کے عملی قدم اٹھایا تھا اسکی عملی کامیاب شکل دارالعلوم ندوۃ العلماء کی صورت میں موجود ہے ندوہ نے جس بنیاد پر قدم اٹھایا تھا اسکی واقعیت و صداقت پر اب زمانہ مہر لگا چکا ہے، اور خود ان جماعتوں کی طرف سے اب اسی بنیاد پر قدم اٹھائے جارہے ہیں جنکی بنا پر ندوہ والوں کو کفر تک کے فتوؤں سے دوچار ہونا پڑا۔

ندوہ کے متعلق علماء مصر کی رائے [illegible]ء میں ازہر کے اکابر علماء کا ایک وفد ہندوستان آیا تھا مختلف مقامات کے مدارس و تعلیم گاہوں کے معائنہ کے بعد وفد لکھنؤ ۱ فروری [illegible] کو پہونچا زمانہ قیام لکھنؤ میں ندوہ کے اساتذہ اور طلبہ کو مختلف موقعوں اور صحبتوں میں تبادلہ خیالات کا موقع ملا، انھوں نے دارالعلوم کے عربی ماحول پر بار بار حیرت ظاہر کی اور فرمایا کہ ہندوستان میں یہ بالکل نئی چیز ہے، شیخ[1] ابراہیم جبالی نے ایک گفتگو کے دوران میں فرمایا کہ شاید آپ کو اپنی جگہ پر اپنی خصوصیات کا احساس نہ ہوتا ہو مگر ہم کو اس کا صحیح اندازہ ہے، پروفیسر حبیب احمد صاحب وفد کے سکریٹری نے ناظم صاحب ندوۃ العلماء سے فرمایا کہ آپ لوگ بہت خاموشی سے اور بہت ٹھوس کام کر رہے ہیں۔ آپ نے ایک تقریر میں ندوہ کو ہندوستان میں ازہر کا بڑا بھائی بتایا۔ واپسی کے وقت محترم صدر وفد نے باصرار دارالعلوم کے نصاب تعلیم تحلیل و تعلیم کا

---

[1] لفظ شیخ مصر میں بلکہ عرب میں ہندوستان کے سید اور پٹھان کی طرح ایک خاص قوم کے معنے میں مستعمل نہیں ہے بلکہ علماء کے لئے ہمارے یہاں کے "مولینا" کی طور پر مستعمل ہوتا ہے۔

عربی میں ترجمہ کرکے اپنے ساتھ مصر لیجانے کی خواہش ظاہر فرمائی تاکہ ازہر کی اصلاح نصاب و تعلیم کے سلسلہ میں ندوہ کا اصول پیش نظر رہے۔

ذیل میں ہم ندوہ کے متعلق ان ارکان وفد کی اس رائے و معائنہ کے ترجمہ کا کچھ حصہ نقل کرتے ہیں جو شیخ زیاتی نے اپنے قلم سے ان کے معائنہ پر تحریر فرمایا تھا۔

"اس سلسلہ میں ہم نے مدرسہ کا نصاب تعلیم اور دستور العمل بھی دیکھا جو اپنے اصول میں مستحکم طرز میں معقول اور وضع و ترتیب میں مناسب تھا۔ اس میں مذہبی علوم کے ساتھ عربی زبان پر خاص زور دیا گیا ہے جس کے بغیر کتاب و سنت کی گرہ کشائی دشوار ہے، پھر ان علوم کے پہلو بہ پہلو وہ جدید علوم بھی شامل ہیں جو طالب علم کی زندگی کے لئے روشنی اور درخشانی کا باعث ہوتے ہیں اور ادائے فرض میں امداد و اعانت کا سبب بنتے ہیں اور ان کے سہارے قوم کے مختلف طبقوں میں یکسانی اور عوام و خواص کے درمیان رابطہ پیدا کیا جا سکتا ہے، اس طریق تعلیم نے ہمیں بہت متأثر کیا، لیکن ساتھ ہی یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ تو نصاب و دستور العمل ہے اب اسکے نتائج و ثمرات بھی دیکھنا چاہئیے مگر جب ہمارے سامنے مختلف عمروں کے چھوٹے بڑے طلبہ آئے اور ان سے گفتگو کرنے کا اور انکی تقریریں سننے کا موقع ملا تو انکی سلاست و روانی، اور فصاحت بیانی نے یہ سوال بھی حل کر دیا، اور بے ساختہ مدرسہ کی محنت و کارگذاری پر تحسین و آفریں کے الفاظ زبان سے نکل گئے۔"

اس ازہر کے وفد نے اپنی سرکاری رپورٹ میں ایک جگہ ازہر کے ماہانہ رسالہ مجلۃ الازہر کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ مولانا سید سلیمان ندوی سے اس رسالہ کے بارے میں کافی گفتگو ہوئی اور انھوں نے اس طرف توجہ دلائی کہ ازہر کا رسالہ اس سے زیادہ بلند ہونا چاہئے جیسا کہ وہ اب نکل رہا ہے اس رائے کے نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ بلاشبہ اسکی ضرورت ہے کہ مولانا سید سلیمان ندوی سے اس کے لئے مضامین لکھنے کی درخواست

ی جائے نیز ان کے مشوروں اور گرامی قدر آراسے فائدہ اٹھایا جائے اسی رپورٹ میں ندوہ کے ذکر میں ایک جگہ لکھا ہے کہ ندوہ ہندوستان کا جدید ازہر ہے جس میں دینی اور دنیاوی علوم پہلو بہ پہلو جمع کئے گئے ہیں جیسا کہ اب ازہر میں کیا گیا ہے

ندویوں اور ندوہ والوں کے لئے یہ فخر بھی بس ہے کہ مصر میں اگر کوئی شرقی علمی، دارہ وقیع نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے تو وہ صرف دارالعلوم ندوۃ العلماء ہے۔ ندوی علماء مصر میں روشناس ہیں اور انکی تصانیف کی شہرت اب اس حد تک پہونچ گئی ہے کہ وہ عربی زبان میں ترجمہ کیجا رہی ہیں، چنانچہ جامعہ مصریہ کے مشہور پروفیسر ڈاکٹر عبدالوہاب عزام نے سیرۃ النبی کا ترجمہ باجازت شروع کیا ہے، یہ سنکر آپ کو حیرت ہوگی کہ مصر کے اکابر علماء جن میں خصوصیت سے مصر اور ازہر کی سب سے بڑی دینی شخصیت صاحب الفضیلہ الاستاذ الامام مصطفیٰ المراغی شیخ الجامع الازہر کی ہے ندوہ کی اصلاحی تحریک، دارالعلوم ندوہ کے قیام، اور اس نے دین و ملت کی جو خدمات انجام دی ہیں ان سے بخوبی واقف اور ان خدمات کے قدردان و مداح ہیں، چنانچہ راقم الحروف اور مولانا سعدالدین صاحب ندوی استاذ جامعہ ملیہ کو قیام مصر میں جو سہولتیں اور غیر معمولی آرام و آسائش ملا اس کا اصل سبب بھی ندوہ کے دامن سے وابستگی تھی اور یہ ندوہ ہی کا فیض تھا کہ قیام کے لئے مخصوص انتظام کے ساتھ ساتھ شیخ کی عنایتیں اور شفقتیں ہمیشہ ہمارے شامل حال رہیں۔ (باقی)

بچہ اور تعلیم

محمد سمیع صاحب۔ ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ صدر شعبہ انگریزی دار العلوم ندوۃ العلما

(۳)

پہلے پہل ان تعلیمی اداروں میں اساتذہ و طلباء کی جماعتیں قومیت اور زبان کے لحاظ سے تقسیم تھیں، اور حقوق کا دارو مدار بھی اسی پر تھا۔ یہ قومی جماعتیں اپنی طریقہ کار کو چلال چلیں۔ اطوار و شہری حقوق۔ اور فقہی مسلک تک مد دو رکھتی تھیں۔ کچھ ہی عرصہ بعد فکلٹیاں (FACULTIES) قائم ہو گئیں مضامین اور نصاب کے لحاظ سے مخصوص ڈپارٹمنٹ بنے مثلاً فکلٹی آف لا (قانونی شعبہ) مذہبیات آرٹس وغیرہ۔

یہ قومی جماعتیں سالانہ ایک کاؤنسلر منتخب کرتیں۔ اور ہر فکلٹی ایک ڈین۔ یہ ملکر یونیورسٹی کے ریکٹر (RECTOR) کا انتخاب کرتیں۔ سولہویں صدی میں یہ عہدے حکومتی بنگئے۔ اور قومی جماعتوں کی خود اختیاری نا سب ہو گئی۔

انکی سیاسی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یورپ کو جمہوری نظام انھیں یونیورسٹی سے حاصل ہوا۔ سیاسی۔ مذہبی اور فقہی مسائل پر آزادانہ بحث کا دروازہ کھولا۔ گو اعلیٰ طبقہ سے وابستہ تھیں۔ لیکن عوام الناس کے جذبات کی ترجمانی کرتیں۔ بادشاہ اور پادریت کے خلاف آواز بلند کرتیں۔ نظام حکومت میں اور فرینچ اور انگلش پارلیامنٹ میں جگہیں حاصل کرلیں۔ حکومت اور کلیسا کے جھگڑے اور اختلافات دور کرتیں مثلاً ہنری ہشتم اور فلپ آف فرانس کے طلاق کا مسئلہ انھیں یونیورسٹیوں کی طرف رجوع کیا گیا۔ سب سے بڑھ کر ان تعلیمی اداروں نے آزاد تحقیقاتی رجحان کو زندہ کیا جسکی مشعل اسوقت مسلمانوں کے ہاتھ تھی۔ اور راجر بیکن۔ ڈنٹے پٹرارک۔ کوپرنیکس اشخاص پیدا کئے جنھوں نے یورپ میں ایک نئی روح

پھونک دی۔

اسلام کا اثر علوم و معاشرت پر ساتویں صدی عیسوی کا آغاز تھا متمدن دنیا اسطرح انسانیت کو کھو بیٹھی تھی کہ انسانی دل و دماغ معطل ہو چکے تھے۔ یورپ نے صدیوں پہلے مذہب تبدیل کر لیا تھا اور شہنشاہ کانسٹنٹائن کے احکامات سے سلطنت کا آفیشل مذہب عیسائیت قرار پاچکا تھا مگر عوام الناس کی ذہنیت اور طرز عمل وہی ہی تھا انکی خونی مناظر سے دلچسپی، غلاموں کے ساتھ بیدردی انسانی حسینوں کا دیوتاؤں کے بھینٹ چڑھانا سب ہی رسوم جاری تھے کہ ایک انقلاب آیا۔ وہ انقلاب ایک ایسے ملک سے اٹھا جسے ساسانی اور قیاصر اپنے نخوت کے سامنے حقیر اور غیر متمدن سمجھتے تھے اپنی نظروں میں بے وقعت اور ذلیل گردانتے تھے فردوسی نے عرب لشکر کشی کے متعلق ایرانی اسپرٹ کے حسب حال یوں کہا ہے۔

ز شیر شتر خوردن و سوسمار	عرب را بجائے رسید است کار
کہ تخت کیاں را کنند آرزو	تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

یہ انقلاب سرزمین عرب سے رونما ہوا۔ بعد رحلت نبی صلعم ۶۳۵ء تا ۹۳۰ء صرف تیس سال کا عرصہ گذرا تھا کہ اسکی موجیں مشرق میں ہند سے شمال میں شام سے مغرب میں صحرا اعظم افریقہ سے ٹکرا رہی تھیں ملکوں اور باشندوں کے مادہ فاسد کو ٹکرا ٹکرا کر دھونے لگیں۔ یہ انقلاب آفتاب اسلام کے طلوع ہونے سے شروع ہوا جسنے انسانیت کو از سر نو پیدا کیا گم گشتہ راہوں کو رستہ دکھلایا۔ اپنے پیروں کو ترقی کے اس بام اوج تک پہونچادیا جو آئندہ نسلوں کے لئے نمونہ بنا۔

عقیدہ کے اعتبار سے سیدھی سادھی وحدانیت کی تعلیم دی جسے دنیا یکسر فراموش کر چکی تھی۔ ہند برہمنوں کے پیچ در پیچ مذہبی رسوم میں گرفتار تھا۔ قدم قدم پر انکی ضرورت اور ہر شعبہ زندگی انھیں کے مدد سے تکمیل پاتا تھا غرض کہ خود دیوتا بنکر پجوانے لگا تھا۔ خالق و مخلوق کے درمیاں ضلالت کی دیوار کھڑی کر کے عوام کی ذہنی آزادی کو سلب کر چکا تھا۔

ایران آتش پرستی۔ یزدان واہرمن کے عقائد کے ساتھ شہنشاہیت کی پرستش میں اسقدر منہمک تھا کہ تفکر اور تلاش حقیقت مفقود تھی گو حقائق و معرفت کی جستجو از منہ قدیمہ میں کی گئی تھی مگر سب اوراق پارینہ بن چکے تھے۔ اسلام نے ان کو۔ کہ وحدہٗ لاشریک ہے نیز نوع انسان کو نکالا اور اشرف المخلوقات کے صحیح خطاب سے سرفراز کیا۔ جو قوم بھی پاس سے گذری اسے وحدانیت کا شیریں گھونٹ پلا دیا۔

عام زندگی اور عمل کے لحاظ سے انسانی آبادی دو خطوں میں تقسیم تھی۔ ایک متمدن دنیا مثلاً روم۔ ایران۔ ہند وغیرہ غیر متمدن مثلاً افریقہ کے وحشی اور عرب کے قبیل وغیرہ۔ متمدن دنیا مختلف طبقات میں اسطرح منقسم تھا کہ ان میں ربط و ارتباط معاشرتی و مذہبی ناممکن تھا۔ ایک طرف برہمن چھتری ویش اور شودر تھے، دوسرے جانب دولت کے اعتبار سے سلاطین شہزادے۔ امرا وغیرہ تھے تیسرے جانب پاپائے اعظم اور پادریت کے مختلف گروہ جنکو اسی دنیا میں حق حاصل تھا کہ کنفش (CONFESSION) اقرار گناہ کے ذریعہ معافی نامہ عوام کو دیدیں جسکی قیمت پادری کے مرتبہ اور نوعیت گناہ پر منحصر تھی کنفش کی خرید و فروخت بھی ایسا مستقل مرض تھا جس سے یورپ متنفر ہوئی اور پاپائے اعظم سے بغاوت کی۔

اسلام نے وہ عظیم انقلاب ذہنی مذہبی معاشرتی پیدا کر دیا جس سے نفوس انسانی اپنے اعمال نیک و بد کے خود ذمہ دار بنے خالق کے سامنے جوابدہ اور سزا و جزا کے مستحق ہوئے۔ خود ساختہ قید و بند سے آزاد ہوئے۔ دنیا نے تجسس اور تحقیق کا سبق سیکھا۔ آزادی کی سانس لی اور سوسائٹی کی ازسر نو تشکیل کر کے اپنے نئے قالب میں ڈھالدیا جو فطری تھا اور علاوہ مرتبہ کے لحاظ سے ملا کر پر بھی فوقیت لیگیا۔

اسلام کے ظہور سے ذیل کے اہم نتائج نکلے۔

(۱) مذہبی اسپرٹ۔ انفرادیت کو باقی رکھکر اجتماعی اور عمرانی زندگی کا ایک مکمل قانون پیش کر دیا۔

گوشہ نشینی۔ ترک دنیا جسمانی اذیتوں کو غلط طریقہ بتلایا۔ لا رہبانیۃ فی الاسلام کہکر سارے غیر فطری اصول کی تکذیب کر دی۔ اخوت کا بہترین سبق دیا جو مسلم کے مذہبی ارکان سے ظاہر ہے۔ نماز روزہ زکوٰۃ حج۔ ہر حکم میں جماعت اور سوسائٹی کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے اسکی نظر میں انسانی ہستی سب برابر ہے اگر فرق اور مرتبہ کا اظہار ہے تو یوں

ان اکرمکم عنداللہ اتقٰکم۔

(۲) اسلامی قوانین کی بنیاد جمہوری ہے جسکے نظر میں حاکم و محکوم، رئیس و فقیر، شاہ و گدا سب برابر ہیں نفاذ قانون ہر ایک پر یکساں ہے ہر مسلم کے لئے ساری ترقی کی راہیں کھلی ہوئی ہیں۔

(۳) عورت کی پامالی اس حد کو پہونچی ہوئی تھی جسپر انسانیت کو بھی شرم آتی تھی۔ لڑکی کا زندہ درگور کرنا اسکی پیدائش موت سے کم نہ تھی۔ بیوہ کی زبوں حالی، غرضکہ اثاث البیت سے زیادہ وقعت نہ تھی۔ اسکی انفرادیت اور حقوق وراثت کو تسلیم کیا۔ اور ہم مرتبہ مرد بنا دیا۔

(۴) تقسیم وراثت ایسی کی جس سے تمام خاندانی افراد مستفید ہوں اور سرمایہ دار نہ بن سکیں۔

(۵) تعدد ازدواج کو جائز بنایا۔

(۶) لین دین تجارت میں سود کو بالکل حرام کر دیا۔ کیا کوئی اس سے زیادہ بے غرضانہ اصول سوسائٹی کے لئے پیش کر سکتا ہے۔ یورپ با وجود متمدن ہونے کے مختلف نوع سے سود خواری کا شکار ہے۔ سرمایہ داری کے بوجھ سے دبا جاتا ہے

(۷) علم کو ہر مسلم پر فرض کر دیا۔ کوئی استثنا نہیں۔ پادریت نے صدیوں تک انجیل کو اپنا بنائے رکھا برہمن نے تو یہاں تک قدم بڑھایا کہ مقدس اشلوک کسی شدر کے کان میں بھی نہ پڑنے پائیں اگر وہ سن لے تو اسکے لئے سزا سخت ہے

(۸) موجودہ سوشلزم نے اسی سے خوشہ چینی کی ہے انسانیت کی پامالی جو یورپ نے حد تک پہونچا دی تھی اسی کا یہ ردعمل ہے عوام کے لئے رحمت ضرور بنا۔ مگر مادی نظریہ سے اسقدر محدود ہے۔ منظر ہے کہ اسکی پرواز خیال اقتصادی ضرورتوں کے دائرہ سے باہر نہیں۔ روح انسانی کے علویت کو بھول گیا۔ خالق و مخلوق کے تعلقات کو منقطع کر دیا۔ جو وجدان مذہب سے روح کو حاصل ہوتا ہے اس کا خاتمہ کر دیا اسی سرچشمہ کو بند کر دیا جس سے اعلی جذبات ابھرتے ہوں۔

اسلام اس سوشلزم کو محیط کرتا ہے اور حیات انسانی کے ہر شعبہ پر غائر نظر رکھکر روح و جسم دنیا و آخرت دونوں کے لئے وہ اصول پیش کرتا ہے کہ اگر اسپر کوئی قوم صحیح عمل پیرا ہو تو کوئی غریب نظر نہ آئے گا تاریخ اسلام

بکی شدت رہتی ہے نہایت وقت بھی تھا جبکہ خیرات و زکوٰۃ لینے والا ڈھونڈھے سے بھی نہیں ملتا تھا۔

اس تمہید کے بعد ذرا پیروان اسلام کے تعلیمی نظام پر بھی نظر ڈالی جائے۔اس مختصر تذکرہ میں عہد بہ عہد اور

ممالک اسلامیہ کے تفصیلی حالات سے عہدہ برآ ہونا ناممکن ہے اجمالی نظر ڈالی جائے گی۔

جب اسلام کے حامل اول اول قوم عرب ہوئی عرب کی آب و ہوا ریگستانی سرزمین تلاش معاش کی دشواریاں

نے قوم کو بالکل عملی بنا دیا تھا۔ اسلام ایک خالص عملی مذہب ہونے کی وجہ سے ان میں وہ جذبہ پیدا کر دیا کہ جزیرۃ العرب

میں محصور رہ سکے۔

عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا پلٹ دی بس اک آن میں اسکی کایا (حالی)

اعلاء کلمۃ الحق اور تلاش حقیقت کے لئے نکل پڑے۔ فتوحات انکی قدم لیتی رہی۔عالم میں جنگ اور صلح کن

طریقوں سے پھیل گئے۔ ابتدائی دور میں صرف قرآن کی تعلیم ہوتی تھی اور رسول کا اسوہ حسنہ سامنے تھا پھر تفسیر

اور حدیث کا اور اضافہ ہوگیا۔

جب فتوحات اور بڑھے دوسری قوموں سے سابقہ پڑا۔خارجی اثرات بڑھنے لگے فلسفہ اور حکمت نے بھی

درس تعلیم میں جگہ لی تعلیم عام تھی۔ پرائمری تعلیم ان مکتبوں میں دیجاتی تھی۔ اور تاریخ خلافت راشدہ کو بھی داخل درس

کر لیا گیا تھا۔ بچوں اور بچیوں کے لئے مکاتب علیحدہ نہ تھے بلکہ ۹ یا دس سال کی عمر تک یکساں تعلیم ہوتی تھی۔

ثانوی تعلیم صناعی یا پیشہ کی ہوتی تھی۔ لڑکوں کو معاش کمانے کے لئے تیار کرتے تھے۔ یہ تعلیم کچھ فیس لیکر

دیجاتی تھی سارے پیشہ کی راہیں سب کے لئے کھلی ہوئی تھیں۔ لڑکا عموماً باپ ہی کے پیشہ کو اختیار کرتا تھا لڑکیاں بھی

پیشہ کی تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ ازدواجی اور مادری فرائض کی واقفیت پیدا کرائی جاتی تھی تاکہ اس زندگی کے لئے تیار

ہو جائیں اعلی تعلیم مذہبی نظریہ سے ہوتی تھی جسمیں نقلی اور عقلی علوم شامل تھے جسکی تشریح آگے کیجاویگی۔ مقدا علامہ

خلدون کے الفاظ ملاحظہ ہوں کہ اسلام نے علوم کو کس طرح نوازہ۔

"جب یونانیوں کی سلطنت کا زمانہ گذر چکا۔ اور قیاصرہ تاج و تخت کے مالک ہوئے اور انھوں نے عیسائی

مذہب اختیار کیا باقتضائے شریعت رومیوں کو ان علوم کے پڑھانے سے روکدیا۔ اور فلسفہ کے کتابوں کو چن چن کر مقفل کردیا تاکہ کسی کے ہاتھ نہ پڑیں اور لوگ انھیں پڑھکر بیدین نہ ہوں۔ اسکے بعد شام پر بھی قیاصرہ کا قبضہ ہوگیا اور وہ کتابیں بدستور ان کے یہاں محفوظ رہیں جب اسلام کا زمانہ آیا اور عرب ملک گیری و جہاد کے لئے اٹھے اور مصر و شام و ایران کی سلطنتوں کو دم کے دم میں ڈلیا تو ایک صدی تک سادگی میں بسر کرتے رہے اور علوم و صنائع کیطرف متوجہ نہ ہوئے لیکن جب اسلام کی دولت و عظمت بڑھی اور مسلمانوں میں تمدن نے جڑ پکڑی تو تھوڑے ہی دنوں میں اُسے معراج کمال پر پہونچا کر صنائع و علوم کی طرف جھکے ان علوم فلسفہ کی حقیقت دریافت کرنے کا بھی خیال آیا کیونکہ علوم کے بعض مسائل پادریوں اور راسا فقہ کی زبانی سنکر ان کے دلوں میں شوق کا بیج پہلے سے جم چکا تھا۔ اسی لئے اسی شوق کو پورا کرنے کے لئے ابو جعفر منصور نے شاہ روم کو لکھا کہ ریاضی کی بعض کتابوں کا ترجمہ بھیجئے۔ شاہ روم نے خط کے پہونچنے پر اقلیدس اور طبیعیات کی بعض کتابیں منصور کے پاس بھیجدیں مسلمانوں نے جب ان کتابوں کو پڑھا شوق اور بڑھا اور فلسفہ کی کتابوں کی جستجو میں مشغول ہوئے۔ یہانتک کہ خلیفہ مامون رشید کا زمانہ آیا جسکو علم کیطرف خاص رغبت تھی اس نے لوگ روم کے پاس اپنے ایلچی بھیجکر یونانیوں کی کتابیں منگوائیں اور ترجمہ کا صیغہ قائم کرکے انکا ترجمہ کرایا۔ ان کتابوں کی اشاعت کے بعد مناظرین اسلام نے بھی ضرورت دیکھ کر ان علوم کو حاصل کیا اور اس قدر کمال پیدا کیا کہ معلم اول کی اکثر رایوں سے بھی اختلاف کرکے اپنا نیا مسلک اختیار کیا۔ بلکہ معلم اول ہی کی رائے کی تردید پر کیا منحصر ہے حکمائے یونان میں سے کسی کو بھی باقی نہ چھوڑا...... مشرق میں ابونصر فارابی اور شیخ بوعلی سینا نے اندلس میں ابن رشد اور وزیر ابو بکر بن صانع وغیرہ نے بڑا نام پایا۔ اور اکابر فلاسفۂ اسلام سمجھے گئے

پی منرو پی ایچ ڈی اپنی تاریخ تعلیم میں عربوں کی ترقی کے متعلق لکھتے ہیں۔

تاریخ تعلیم منرو صاحب۔ عربی علوم کا اثر چھٹی عیسوی میں فلسفہ یونان کا مطالعہ مشرقی کلیسا نے بوجہ گمراہکن اثرات کے بالکل بند کردیا جسنے شام میں وطن بنایا اور مسیحی فرقہ نسطوریہ نے اپنا خاص کرلیا یہاں یہ عربوں سے

[illegible] خاندان عباسیہ نے [illegible] مشرقی ممالک میں پرورش پائی۔

نسطوری عالم دلوں نے دربار میں بلائے گئے اور ترجمے شامی یا یونانی زبان سے عربی میں کئے گئے

طبعیات نجوم، طب کو فروغ تھا۔ دسویں صدی عیسوی میں فلسفہ کا شوق زیادہ بڑھا بوعلی سینا (۹۸۰ء-۱۰۳۷ء)

نے [illegible] کی [illegible] جبکہ یہی مدارس مشرقی و مغربی یورپ میں زوال پذیر تھے مگر بغداد، بصرہ، کوفہ، اور

عربی شہروں کے مدارس میں [illegible] ترقی و شہرت۔

اسپین میں بہار قرطبہ کا [illegible] مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ دسویں صدی کے بعد سے علوم کو مزید ترقی حاصل ہوئی

[illegible] شاندار اعلیٰ تجربے کئے گئے [illegible] مغربی دول خلافت میں عربوں نے کتب خانے اعلیٰ مدرسے جو سب

یونیورسٹیوں [illegible] تھے قائم کئے۔ شہروں میں مساجد سے ملحق بچوں کی تعلیم کے لئے درسگاہیں کھلیں جبکہ مسیحی یورپ

اس عقیدہ پر [illegible] تھا کہ زمین چپٹی ہے [illegible] جغرافیہ کی تعلیم گلوب (کرہ) سے دیتے تھے۔ اور جب

عیسائیوں کو مسلمانوں پر غلبہ حاصل ہوا تو وہ رصد خانے گھنٹہ گھروں میں تبدیل کر دیئے گئے کیونکہ وہ اس کا استعمال

بھی نہیں جانتے تھے۔ انھیں عربوں کے ذریعہ سے علم ہندسہ نے دسویں دگیارہویں صدی عیسوی میں رومن طریقہ کی

جگہ لی جبر و مقابلہ کا علم اور ریاضی کے اعلیٰ علوم انہی ذریعہ سے حاصل ہوئے طب میں، جراحی میں عطاری میں۔

میں طبعیات میں انھوں نے اس قدر اضافہ کیا جو آج اصولی بنیاد ہیں۔

انھوں نے روشنی کی رفتار [illegible] کے، باد کی تشریح کی فضا کی بلندی۔ ہوا کا وزن۔ اجسام کی کشش کا تعین کیا

ہیئت کے مختلف تجربے کئے ...... لنگر والی گھڑی ایجاد کی۔ تجارت جغرافی تحقیقات و انکشافات

غرضکہ حیات کے سارے فنون میں انکا تمدن اور تہذیب یورپ سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھا۔ چاول، شکر، روئی کا

استعمال بتلایا ریشم کے پیدا کرنے کا طریقہ سکھلایا۔ یورپ کو قطب نما سے روشناس کیا بارود اور بندوق کا استعمال

بتلایا۔ اس طرح مختلف طریقوں سے عرب تمدن تہذیب مغرب کے دبستان بنے۔ اور اسکے تمدن کو بلند تر بنایا۔

(باقی)

چند اہم تجاویز

۲۰ اپریل ۴۰ء کو مجلس کارکن نے حسب ذیل تجاویز منظور کی تھیں جن پر عملدرآمد شروع کیا جا چکا ہے

خدا نے چاہا تو ماہ اگست کی مجلس انتظامیہ کے بجائے ستمبر کے اواخر یا اکتوبر کے اوائل میں انجمن طلبائے قدیم کا سالانہ جلسہ لکھنؤ میں منعقد کیا جائیگا اور امید ہے کہ یہ جلسہ دار العلوم اور طلبائے دار العلوم کے درمیان جدید و مستحکم تعلقات کا ذریعہ ثابت ہوگا اور رسالہ الندوہ کی مدد سے طلبا و دار العلوم کی فلاح و ترقی و اصلاح کی تعلیمی و تعمیری خدمات کی صورتیں نکل سکیں گی

(۱) مجلس کارکن کا یہ جلسہ حامد علی ندوی ناظم انجمن مرکزی کے پیش کردہ حسابات ۳۹ء کو منظور کرتا ہے اور ان کو اختیار دیتا ہے کہ وہ اس کو بوقت ضرورت شائع کر سکتے ہیں۔

تفصیل آمد و خرچ مدوار ۱۹۳۹ء انجمن طلبائے قدیم ندوۃ العلماء

	آمد		اخراجات	
۱	سابق تحویل نقد	عا/ ۵	جمع در سیونگ بنک ا بنام حبیب اصغر مرحوم	صہ/
۲		لعہ/ ۴	جمع بچوں کا بنک دار العلوم ندوۃ العلماء	۶/
۳	سابق تحویل سیونگ بنک ۰۰.۰ بنام جناب حبیب اصغر مرحوم	صہ/	طباعت و مداد مع متفرق اخراجات	عہ/ ۱۳
			ڈاک	عہ/ ۱۵
۴	سابق تحویل بچوں کا بنک دار العلوم ندوۃ	ہے/ ۱۴	اسٹیشنری	سے/
۵	چندہ رکنیت	لعہ/	تنخواہ محصل	للعہ/ ۵
۶	عطیات [1]	معہ/ ۳	متفرق	عہ/ ۱۱
۷	امداد ندوۃ	عہ/	جمع در دفتر ندوۃ العلماء	للعہ/

[1] نوٹ صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے۔

(۲) مجلس کارکن کا یہ جلسہ ناظم انجمن مرکزی کے پیش کردہ طریق کار کو نہایت مناسب اور بہتر سمجھتا ہے اور یہ طے کرتا ہے کہ اسی نہج پر اس سال انجمن کا کام کیا جائے نیز ناظم صاحب موصوف سے امید کرتا ہے کہ وہ اس کام کے انجام دینے اور اس تجویز کو کامیاب بنانے میں پوری کوشش کریں گے۔

(۳) مجلس کارکن کا یہ جلسہ اپنے تمام ندوی بھائیوں اور ندوہ سے محبت وخلوص رکھنے والے احباب کرام سے درخواست کرتا ہے کہ وہ جلد سے جلد رسالہ الندوہ کے خریدار بن جائیں نیز عارضے لیکر جس حد تک

نوٹ: اس بجٹ کے سلسلہ میں میں یہ ظاہر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ عطیات کی مد میں عہ حامد علی ندوی ناظم مرکزی انجمن کے جمع کئے ہوئے ہیں جو ان کو دفتر ندوۃ العلماء نے پشاور سے چندہ وصول کرنے کے سلسلہ میں علامہ سید سلیمان صاحب کی ہدایت پر دیئے تھے۔ اخراجات میں جو عہ دفتر ندوۃ العلماء کو دیئے گئے وہ اگرچہ انجمن کی رسید بک کے ذریعہ وصول کئے گئے تھے لیکن تجویز عث کے مطابق اس پر نصف رقم (۵۰ فی صدی) نہیں لی گئی کیونکہ یہ سفر سید صاحب کی ہدایت اور ندوہ کے خرچ سے کیا گیا تھا ہاں ناظم مرکزی نے یہ کیا کہ اس سلسلہ میں جو رقم مذکور عہ اپنی دہ انجمن کے خزانہ میں جمع کر دی ہو اور اخراجات نکالنے کے بعد انجمن کو یوں بھی اس سے زائد رقم نہیں ملتی اس لئے انجمن کا اس سے کوئی نقصان نہیں ہوا دوسری بات یہ ہے کہ عطیات میں عہ کی رقم وہ ہے جو ہمارے صدر محترم مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی نے عہ ماہوار کے حساب سے انجمن کو ابتدائی حساب کے لئے دی اور واقعہ یہ ہے کہ اسی کے سہارے انجمن کا اتنا کام ہو سکا جو آج ہماری نظروں کے سامنے ہے اس لئے انجمن صدر صاحب موصوف کی بیحد ممنون و مشکور ہے۔

بھی وہ اپنی ضروریات سے بچا سکیں اس رقم کو ناظم صاحب انجمن طلبائے قدیم کے نام بادشاہ باغ لکھنؤ کے پتہ پر روانہ فرمادیں تاکہ انجمن طلبائے قدیم کے اس وعدہ کو پورا کیا جاسکے جو اجلاس پھلواری شریف میں تجویز کی صورت میں کیا گیا ہے کہ طلبائے قدیم کی جانب سے دارالعلوم کے لئے پانچ سو روپیہ جمع کئے جائیں۔

(۴) مجلس کارکن تمام شاخہائے انجمن طلبائے قدیم کے ناظمان اور آرگنائزروں سے درخواست کرتی ہے کہ

(ا) وہ اپنے اپنے حلقے میں رہنے والے ندویوں کی ایک فہرست تیار کریں جس میں ندوین کا نام پتہ، ندوہ کی تعلیم، مزید تعلیم موجودہ شغل مع عہدہ اور ماہوار یا سالانہ آمدنی کی وضاحت درج ہو۔

(ب) تمام ذی استطاعت ندویوں سے ان کی حیثیت کے مطابق ۴ر سے ۵ر تک ماہوار رقوم حاصل کریں اور اس رقم کو ہر مہینہ وصول کرکے خرچ وضع کرنے کے بعد جسکی مقدار ۴ر روپیہ سے زائد ناظم صاحب طلبائے قدیم یا ناظم صاحب معین الندوہ کو امانت بجانب دارالعلوم طلبائے قدیم کے عنوان سے بادشاہ باغ لکھنؤ کے پتہ پر بھیجدیں۔

(ج) مجلس کارکن کی منظور کردہ تجاویز کو (جسکی نقل آپ کی خدمت میں آچکی ہوگی) جلد سے جلد جامۂ عمل پہنائیں اور اپنے کام کی ماہانہ رپورٹ اور مطالبات کی ماہانہ قسط صدر دفتر کو پابندی سے بھیجتے رہیں۔

حالاتِ ندوہ

گرمیوں کی تعطیل ختم ہوگئی، دو ڈیڑھ ماہ کے بعد یکم جولائی کو دارالعلوم پھر کھل گیا اس زمانہ میں انگریزی مدارس میں تعلیمی سال کا آغاز ہوتا ہے لیکن عربی مدارس کا سال نو شوال سے شروع ہوتا ہے۔ ابھی تقریباً تین مہینے سالانہ امتحان میں باقی ہیں اساتذہ و طلبہ انہماک و توجہ سے درس و تدریس میں مصروف ہیں اسباق تیزی سے ہو رہے ہیں کہیں کہیں مطالعہ کے ساتھ اعادے کے حلقے بھی قائم ہو رہے ہیں۔

درس و تدریس کے ساتھ طلبہ کے اداروں میں بھی رونق آگئی ہے الاصلاح کے علمی مشغلے سوق عکاظ کے عربی اجتماعات بزم رحمانی کے تحقیقی مباحث بزم ادب کی صحبتیں پارلیمنٹ کی آئینی بحثیں پھر شروع ہو گئی ہیں آج کل الاصلاح کی تاریخ مرتب کرنے کا خیال ہو تاکہ حال و ماضی کے درمیان ربط قائم رہ سکے اس سلسلہ میں ابتدائی تاریخ بہت زیادہ تلاش و تفحص کی طالب ہے امید ہے کہ اس بارہ میں طلباء قدیم اور انجمن کے پرانے کارکن اپنے معلومات سے مستفید فرمائیں گے۔

عام ورزشی کھیلوں کے علاوہ طلبہ کی عسکری مشق و تربیت کا سلسلہ بدستور جاری ہے صبح کے وقت طلبہ کا نظم و ترتیب سے اجتماع، ولولہ انگیز اور حیات آفریں ترانے ایمان افروز اور روح پرور نعرے قواعد کی عربی اصطلاحیں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں امید ہے کہ مشق و تمرین کا یہ سلسلہ آئندہ بہت زیادہ مفید ثابت ہوگا

لکھنؤ میں معین الندوہ کے کام کا تذکرہ پچھلی اشاعت میں ہو چکا ہے اب قصبات اور دیہات میں بھی اس تحریک کو پھیلانے کی جد و جہد ہو رہی ہے منشی افتخار حسین وقتاً فوقتاً مختلف مقامات کا گشت کرتے رہتے ہیں

اب خود ناظم معین الندوہ مولوی حامد علی ندوی اودھ کے مشہور قصبات کا دورہ کر رہے ہیں اودھ کے باشندوں پر ندوہ کا بڑا حق ہے ندوۃ العلماء کی تحریک شروع ہوئی اور دارالعلوم کے قیام کی تجویز ہوئی تو ہندوستان کے مختلف حصوں سے تائید کی آوازیں آئیں اور اصرار ہوا کہ دارالعلوم کا سنگ بنیاد انھیں کے علاقہ میں رکھا جائے لیکن بالآخر اودھ کے علم دوستوں کو کامیابی ہوئی اور دارالعلوم لکھنؤ میں قائم ہوگیا توقع تھی کہ مصارف کا بار بھی بڑی حد تک یہیں کے لوگ برداشت کریں گے لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہوسکا اور اہالیان اودھ کے ذمہ ہنوز یہ قرض باقی ہے ہمیں امید ہے کہ اس صوبہ کے باشندے اپنی ذمہ داریاں محسوس کریں گے اور ندوہ کی امداد و اعانت میں اپنی روایتی فراخ حوصلگی اور بلند ہمتی سے کام لیں گے اور ندوہ کے کارکنوں کو مالی پریشانیوں سے نجات بخشیں گے۔

اودھ کے بعد بہار کے دورہ کا پروگرام ہے تجویز ہے کہ وہاں جم کر کچھ دن کام کیا جائے اہل بہار کی علم دوستی اور مہمان نوازی کے تذکرے مشہور ہیں ان کی کریم النفسی کے چرچے بہت سننے میں آئے ہیں، اب ندوہ کے کارکن "فقیروں کے بھیس میں" "تماشائے اہل کرم" دیکھنے نکلے ہیں دیکھنا ہے کہ اہل کرم کی اس محفل میں انکی کس طرح پذیرائی کی جاتی ہے بہار ندویوں کا مرکز بلکہ شاید اس سے بھی کچھ سوا ہے ہمیں امید ہے کہ ندوہ کے فرزند اپنے فرائض کی ادائگی میں کوتاہی نہ کریں گے اور ناظم صاحب معین الندوہ بہت جلد سالماً و غانماً واپس آئیں گے۔

نقد و نظر

نشاط روح | تعداد صفحات ۳۱۵ کاغذ نہایت اعلیٰ کتابت عمدہ طباعت اوسط قیمت عار

کتاب زیر نظر حضرت اصغر مرحوم کے کلام کا دوسرا اڈیشن ہے جو صدیق بکڈپو کے زیر اہتمام شائع ہوا ہے جیسا کہ کتاب سے ظاہر ہوتا ہے حضرت اصغر مرحوم نے اس اڈیشن کی اشاعت کے موقعہ پر اپنے کلام پر بہت ترمیم و تنسیخ کی ہے۔ بعض جگہ اشعار نکال دیئے گئے بعض جگہ مصرعوں کو بدل دیا ہے اور بہت سے نئے اشعار شامل کر دئے ہیں اصل کلام ۲۲۴ صفحات پر مشتمل ہے باقی ۷۰ صفحات میں سے ۳۱ صفحات مقدمہ و تبصرہ اول کی نذر کئے گئے ہیں اور ۳۹ صفحات میں کلام پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

حضرت اصغر مرحوم کا کلام کسی تعارف کا محتاج نہیں حقائق نگاری کے ساتھ ساتھ شاعرانہ انداز بیان کی لطافت و دلآویزی اور ندرت ادا کے ساتھ ساتھ جوش و مستی آپ کے کلام کی وہ خصوصیات ہیں جو آپ کو اپنے معاصرین میں نمایاں و ممتاز کرتی ہیں۔ چونکہ کلام کا صحیح اندازہ خود کلام ہی کے پڑھنے سے ہو سکتا ہے اس لئے ہم ذیل میں کچھ اشعار درج کئے دیتے ہیں۔

اشعار: مجھے جنوں نہیں لیکن یہ حال ہے — گھبرا رہا ہوں دیکھ کے دیوار و در کو میں

اس عارض رنگیں پر عالم وہ نگاہوں کا — معلوم یہ ہوتا ہے پھولوں میں صبا آئی

روداد چمن سنتا ہوں اس طرح قفس میں — جیسے کبھی آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا

اس میں وہی ہیں یا مرا حسن خیال ہے — دیکھوں اٹھا کے پردۂ ایوان آرزو

نظارہ بھی اب گم ہو بیخود ہے تماشائی — اب کون کہے اس کو جلوہ نظر آتا ہے

رخ رنگیں پہ موجیں ہیں تبسم ہائے پنہاں کی — شعاعیں کیا پڑیں رنگت نکھر آئی گلستاں کی

راز کی جستجو میں مرتا ہوں! — اور میں خود ہوں ایک پردۂ راز

یہ بھی فریب سے ہیں کچھ درد عاشقی کے — ہم مر کے کیا کریں گے کیا کر لیا ہے جی کے

وہ شمع حقیقت کی اپنی ہی جگہ پر ہے — فانوس کی گردش سے کیا کیا نظر آتا ہے

اک شورش بے حاصل اک آتش بے پروا — آتشکدۂ دل میں اب کفر نہ ایماں ہے

نہ کھلے عقدہائے ناز و نیاز — حسن بھی راز اور عشق بھی راز

یہ عشق نے دیکھا ہے یہ عقل سے پنہاں ہی — قطرہ میں سمندر ہی ذرہ میں بیاباں ہی

سو بار جلا ہے تو یہ سو بار بنا ہے — ہم سوختہ جانوں کا نشیمن بھی بلا ہی

ا ۔ ج

چند اہم کتابیں

نقوش سلیمانی ہندوستان کے مایۂ ناز ادیب و مفکر علامہ سید سلیمان ندوی کی تازہ ترین اہم کتاب ہے۔ علامہ موصوف نے ہندوستانی زبان و ادب کے متعلق اب تک جتنی تقریریں اور خطبے دئے ہیں ان سب کو اس مجموعے میں جمع کر دیا گیا ہے۔ ہندوستان میں ہندوستانی، ہماری زبان، بیسویں صدی میں، اردو انسائیکلوپیڈیا، زبان اردو کی ترقی کا مسئلہ وغیرہ جیسے اہم عنوانات پر اس مجموعے میں روشنی ڈالی گئی ہے یہ کتاب نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کی گئی ہے۔ قیمت مجلد ے غیر مجلد ع۱۲ر

یورپ کی حکومتیں مصنفہ نجم الدین جعفری بی اے، ایل ایل ڈی مظہر انصاری بی اے (آنرز) ہندوستان میں سیاسی بیداری بڑی تیزی سے پھیل رہی ہے اور ہر خاص و عام ایسے سیاسی لٹریچر کی تلاش میں رہتے ہیں جو انکی سیاسی تربیت کر سکے، اس کتاب میں برطانیہ، فرانس، اٹلی، سوئزرلینڈ اور جرمن کے نظام حکومت پر روشنی ڈالی گئی ہے ہر ملک کے تذکرہ حالات سے پہلے اس کی سیاسی ارتقا کی تاریخ بھی بیان کر دی گئی ہے۔ ضخامت ۲۲۵ صفحات مجلد عہ

معاہدہ عمرانی از ژاں ژاک روسو مترجمہ ڈاکٹر محمود حسین خاں صاحب بی اے (جامعہ) ایم اے پی ایچ ڈی (ہائیڈلبرگ) حریت، اخوت، اور مساوات جس کا روحانی پیام دنیا کو اسلام نے بھیجا تھا اس کی سیاسی تبلیغ یورپ میں روسو کے معاہدہ عمرانی نے کی یہ کتاب فلسفہ سیاست کی اہم کتاب ہے اور زبان و طرز بیان کے لحاظ سے سب سے سہل ہے۔ قیمت مجلد عار

مینیجر مکتبۂ جامعہ

دہلی، نئی دہلی، لاہور، بمبئی، لکھنؤ

Regd. No. A-596.

پبلشر سید حامد علی ندوی، پرنٹر بانکے لال سکسینہ، مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ

مجلس ندوۃ العلماء کا ماہوار رسالہ

الندوہ

جس کا مقصد

مسلمانوں کی تعلیمی اور تعمیری خدمت ہے

مرتبہ

سید ابو الحسن علی ندوی

استاذ تفسیر و ادب

عبد السلام قدوائی ندوی

استاذ تاریخ و اقتصادیات

الندوہ

زیر نگرانی

علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ

جلد ۱ رجب المرجب سنہ ۱۳۵۹ھ مطابق اگست سنہ ۱۹۴۰ء نمبر ۸

قیمت فی پرچہ تین آنے سالانہ دو روپے

تمام خط و کتابت اور ترسیل زر حامد علی ندوی منیجر رسالۂ الندوہ بادشاہ باغ لکھنؤ کے پتہ پر ہونی چاہیے

شذرات

گذشتہ شمارہ کار سالہ پریس میں جا چکا تھا کہ ہمیں جناب مفتی انوار الحق صاحب فنانس منسٹر ریاست بھوپال کے انتقال کی اطلاع ملی۔ دنیا وی عزت و مرتبت کے ساتھ مرحوم کو علم و فن سے بھی خاص ذوق تھا اس سلسلہ میں متعدد فن میں تصنیفیں، مباحث لکھے اور دقیق سنید ٹھہے تاریخ ابو البشر آپکے اس ذوق کی گواہ ہیں۔ ندوہ سے مرحوم کا دیرینہ بلکہ خاندانی تعلق تھا۔ آپکے والد مولانا مفتی عبداللہ صاحب ٹونکی مدتوں ندوہ کے رکن اور کچھ عرصہ تک وہاں کے مہتمم رہے۔ بعد کو مفتی انوار الحق صاحب مرحوم ندوہ کی مجلس منتظمہ کے رکن منتخب ہوئے اور خدمت دین و ملت کا یہ سلسلہ زندگی کے آخری لمحوں تک جاری رہا۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عنایت فرمائے۔

ڈاکٹر عبد الحمید سعید کا سانحہ ارتحال عالم اسلامی کا سخت حادثہ ہے، مرحوم شبان المسلمین کے بانی مصری پارلیمنٹ کے ممبر اور اسلامی تحریکوں کے روح رواں تھے۔ ان کی کوششوں نے مصر کی فرعونی تحریک کے پرخچے اڑا دیے، وطنیت کے بت کو پاش پاش کر دیا اور قومیت کے جاہلی نعروں کا خاتمہ کر دیا۔ یہ ڈاکٹر عبد الحمید ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ شبان المسلمین کی تحریک دیکھتے دیکھتے دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئی۔ اس تحریک نے عالم اسلامی میں بیداری کی ایک لہر پیدا کر دی۔ الحاد و تفرنج کے بازار سرد ہو گئے، مسلمان نوجوانوں کے دماغ فکر صحیح اور دل جوش عمل سے معمور ہو گئے اور نگاہوں کو ایک نئے عالم کی پیدائش کے آثار نظر آنے لگے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنی رحمتوں سے سرفراز فرمائے۔

افغانستان اپنی جغرافی خصوصیات اور اسلامی روایات کے اعتبار سے غیر معمولی اہمیت کا ملک ہے

کسی زمانہ میں یہ ملک قوت و طاقت کا مرکز سمجھا جاتا تھا، افغان بادشاہوں کی عظمت و جلال کی داستانیں آجتک تاریخ کے جلی عنوان ہیں لیکن بعد کو حالات کچھ ایسے پیش آئے کہ ترقی کی رفتار رک گئی اور ملک کی "گمنامی" اتنی بڑھی کہ "گمنامی" کا دھوکہ ہونے لگا. جنگ عظیم کے بعد ملک نے پھر سنبھالا لیا، ترقی کے آثار ظاہر ہونے لگے تھے کہ بچہ سقہ کی بغاوت نے سارا نظام درہم برہم کر دیا، لیکن مایوسیوں کے عین ہجوم میں "مردے از غیب بروں آمد و کارے کرد" غازی نادرشاہ اور ان کے خاندان نے گرتی ہوئی حالت سنبھال لی۔

پچھلے دس بارہ برس کے عرصہ میں ملک نے زندگی کے ہر شعبہ میں اتنی ترقی کی کہ آج اس کا اندازہ دشوار ہے. موجودہ حکومت کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اسنے راعی و رعایا کے تعلقات استوار کئے، عوام کو بیدار کیا اور ان میں سیاسی شعور اور ذمہ داری کا احساس پیدا کیا. اس غرض سے مختلف مشاورتی حلقے عرصہ ہوا قائم کئے گئے تھے. اب یہ خبر مسرت سے سنی جائیگی کہ ملک میں باضابطہ سیاسی نظام قائم کیا جارہا ہے، نئے دستور کا اعلان ہو گیا ہے، اب عنقریب اسکے ماتحت انتخابات ہوں گے اور ملک میں نئی سیاسی زندگی کا آغاز ہوگا۔

ندوہ کے تعلیم یافتہ حضرات کی مانگ ملک میں دن بدن بڑھتی جاتی ہے. دفتر میں اکثر اس قسم کی درخواستیں آتی رہتی ہیں چنانچہ ابھی حال میں ناظم صاحب انجمن طلبائے قدیم کی معرفت حسب ذیل کاموں کے لئے چند ندویوں کی ضرورت کی اطلاع ملی ہے:۔

۱۔ ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جو لائبریری کے کاموں کا تجربہ رکھتا ہو، کم از کم میٹرک تک انگریزی کی بھی استعداد بھی ہونی چاہئے، تنخواہ ۴۰ تا ۵۰ ر

۲۔ ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جو آٹھویں جماعت تک عام اسکولی نصاب پڑھا سکتا ہو، تنخواہ ۲۰ تا ۲۵ ر

(بقیہ صفحہ ۲۹ پر ملاحظہ فرمائیے)

عہدِ قریب کا ایک گمنام عالم

مولانا مظہر کریم دریابادی

متوفی ۱۳۲۰ھ
۱۹۰۲ء

از مولانا عبدالماجد دریابادی

پچھلی صدی میں صوبۂ اودھ کی خاک سے متعدد علما ایسے اٹھے کہ اپنے معاصرین میں ممتاز سمجھے گئے لیکن دیکھتے ہی دیکھتے گمنام ہوگئے، کوئی یادگار اپنی ایسی نہ چھوڑ سکے کہ نام عرصۂ دراز تک چلتا۔ انھیں گمنام مشاہیر میں ایک مولانا مظہر کریم صاحب دریابادی تھے، راقم کے حقیقی جد امجد۔ مولانا سید سلیمان ندوی کا حکم ہوا کہ ان کے حالات "الندوہ" میں تحریر کئے جائیں[1]۔ دادا کی تذکرہ نگاری سے بڑھکر پوتے کے نصیب میں سعادت کا اور کونسا موقع آسکتا ہے لیکن حالات و سوانح کچھ ملیں بھی جب تو مرتب کئے جائیں!

خاندان کے مورث اعلیٰ قاضی القضاۃ شیخ معز الدین ملقب بہ قدوۃ العلم والدین یا عرف عام کے مطابق محض قاضی قدوہ تھے[2]۔ مشہور ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کے برادر طریقت تھے۔ انھیں کے زمانہ میں ملک روم سے ہندوستان آئے اور انھیں کے حکم سے قصبۂ اودھ (اجودھیا) ضلع فیض آباد میں آکر آباد ہوئے، مزار بھی مسجد بابری سے ایک فرلانگ کے فاصلہ پر شمال مشرق میں ہے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ قاضی صاحب سلطان شہاب الدین غوری کے زمانہ میں دہلی میں آئے اور نو سال قیام کے بعد سلطان شمس الدین التمش کے عہد میں فرمائش سلطانی پر لکھنؤ کا رخ کیا۔ اور رجگور، رسولی (قدیم نام ہرسولی تھا) وغیرہ میں ہندو

[1] ملاحظہ ہو "الندوہ" (سلسلۂ جدید) جلد اول، ع۳، ص۲

[2] قاضی قدوہ اور ان کے خاندان کے حالات متعدد فارسی غیر مطبوع تذکروں میں درج ہیں، مثلاً بحر ذخار (دو ضخیم مجلدات) از قاضی شہاب الدینؒ۔ مرآۃ الاسرار از شیخ عبدالرحمٰن چشتیؒ۔ قدوۃ التواریخ از حکیم امداد احمد دریابادی، وغیرہ،

زمینداروں کی مزاحمت پر فتح پاتے بالآخر قصبۂ اودھ (اجودھیا) پہونچے[1]۔ قاضی صاحب کا شوق جہاد اور غایت تشرع و تقویٰ سب روایتوں میں مشترک ہے۔

قاضی صاحب موجودہ قدوائی خاندانوں کے شجروں کے مطابق نسباً اسرائیلی تھے۔ شجرۂ نسب جرشون بن حضرت موسیٰ علیہ السلام سے گذرتا ہوا حضرت لادہ (انگریزی قالب میں: LEVI) فرزند سوم حضرت یعقوب علیہ السلام تک پہونچتا ہے۔ ایک قول یہ بھی نقل ہوتا چلا آیا ہے کہ اسرائیلی نہیں بلکہ سادات میں سے تھے، صرف شادی اسرائیلیوں کے شاہی خاندان میں ہوئی تھی، اسلئے خود بھی اسرائیلی مشہور ہو گئے۔ واللہ اعلم، اتنا بہر حال مسلّم ہے کہ لکھنؤ اور حوالی لکھنؤ کے شیوخ صدیقی و عثمانی و انصاری اپنی عالی نسبی پر فخر کرنے کے خوگر تھے۔ خود انھوں نے بڑھکر قدوائیوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور بلا تکلف اپنی لڑکیاں اُن کے عقد میں دیں۔

انھیں قاضی قدوہؒ کی نسل میں ان سے کوئی دس پشتوں کے بعد ایک بزرگ و نمایاں ہستی مخدوم شیخ محمد آئکبش[2] (متوفی ۹۴۳ھ) بانی قصبۂ دریاباد[3] کی نظر آتی ہے۔ ان کی گیارھویں پشت میں مولوی مظہر کریم پیدا ہوئے ابن شیخ مخدوم بخش ابن شیخ کریم بخش، فقر و مشیخت خاندانی ورثہ تھا۔ علم و فضل کی تحصیل خود کی۔ چار بھائیوں میں یہ منجھلے تھے۔ تعلقات خود ان کے اور ان کے بڑے بھائی مولوی حکیم نور کریم کے، فرنگی محل (لکھنؤ) سے بہت بڑھے ہوئے تھے۔ اور فرنگی محل اُسوقت تھا بھی دار العلم و العمل۔ محض قافیہ کی رعایت سے نہیں، واقعہ کے اعتبار سے بھی درسیات کی تکمیل یہیں کی ہوگی۔ معاصر علما، فرنگی محل میں نام مولانا عبد الحکیم، مولانا عبد الحلیم، مولانا عبد الرزاق مولانا عبد الحی، مولانا علی محمد، مولانا محمد نعیم کے، فتاویٰ کی تائید میں دستخطوں کے سلسلہ میں ملتے ہیں۔ بدایوں

[1] سنہ وفات، خاندانی روایات کے مطابق ۶۰۶ھ تھا، لیکن سلطان التمش کا زمانہ اسکے بعد ۶۰۷ھ سے شروع ہوتا ہے اسلئے یا تو وہ سال وفات صحیح نہیں اور یا پھر آپکی آمد اودھ، عہد التمش سے پہلی کی ہے۔

[2] خلیفہ شیخ ابو الفتح جونپوریؒ سلسلۂ چشتیہ نظامیہ۔
"شیخ فخر الدین بجنوری و شیخ محمد آئکبش دریابادی باز کاملین شیخ ابو الفتح ست" (خزینۃ الاصفیا از غلام سرور لاہوری، جلد اول ص ۳۹۱ نولکشور) آئکبش کی وجہ یہ نقل ہوئی ہے کہ مرشد کے حسب ارشاد پانی بھر بھر کر سازروں کو پلایا کرتے اور نماز پڑھ کر وضو کرایا کرتے۔ تاریخ وفات "آفتاب شد" سے نکلتی ہے

[3] تاریخ آبادی قصبہ ۸۴۵ھ، سلطان حسین شرقی جونپوری کے زمانہ میں دریا خاں حاکم حکومت کی فرمایش پر مخدوم صاحب نے آکر قصبہ کو آباد کیا

بریلی، رامپور، شاہجہانپور، کلکتہ اور دہلی (شاہجہاں آباد) کے علماء سے بھی تعلقات تھے۔ فتاویٰ کے سلسلے میں مولانا مفتی صدرالدین خاں شاہی مفتی دہلی، مولانا فضل حق خیرآبادی، مولانا سعد اللہ رامپوری، مولانا فضل رسول بدایونی وغیرہم کے نام بار بار ملتے ہیں۔

انگریزی حکومت نئی نئی قائم ہوئی تھی، کہیں قائم ہو چکی تھی، کہیں قائم ہو رہی تھی، بالخصوص ان علاقوں میں جو آج صوبۂ متحدہ کہلاتے ہیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی بہادر کا چل رہا تھا۔ شاہجہانپور اس انتظام کے ماتحت ضلع قرار پا چکا تھا۔ ایک بہت کرم خوردہ یادداشت سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی نظہر کریم صاحب ۱۸۲۹ء میں بسلسلۂ ملازمت انگریزی شاہجہانپور پہنچے اور ایک ادنیٰ عہدہ سے ترقی کرتے کرتے سو روپیہ ماہوار کے مشاہرہ پر سررشتہ دار فوجداری ہو گئے۔ یہ عہدہ خدا معلوم تھا کیا۔ لیکن بہرحال اُس وقت کے معیار سے تنخواہ اور اختیارات دونوں کے لحاظ سے تھا کوئی بلند اور ذمہ داری ہی کا منصب۔ انگریز کلکٹر پر ان کا اثر قائم تھا۔ یہ جب ملنے جاتے تو خاندانی روایتوں میں سننے میں آیا ہے کہ کلکٹر اپنے مسلمان خانساماں سے حقہ بنوا کر پیش کرتا۔ ۳۱ مئی ۱۸۵۷ء کو جب سرکاری زبان میں غدر ہوا ہے یعنی ہندوستانی سپاہ نے بلوہ کرکے انگریز حکام کو قتل کیا ہے، تو قیام شاہجہانپور کی مدت اُس وقت تک ۲۷ سال کی ہو چکی تھی۔

اتنے طویل قیام سے پردیس دیس بن چکا تھا اور مسافرت میں شان وطن کی پیدا ہو گئی تھی۔ عمائد شہر سے روابط و رسم بہت گہرے بمثل عزیزوں کے قائم ہو چکے تھے اور اثر حکام و عوام پر بہت اچھا تھا۔ ایک انگریز J. F. FANTHOME جے۔ اف۔ فینتھوم نامی مقیم آگرہ نے ۱۹۰۸ء میں بنارس کے ایک مطبع سے غدر شاہجہانپور کی ایک ضخیم داستان انگریزی میں شائع کی، اسمیں بغاوت کا بڑا سرغنہ مولوی نظہر کریم صاحب ہی کو ٹھہرایا ہے اور خوب خوب انھیں جلی کٹی سنا کر اپنا دل ٹھنڈا کیا ہے۔ آس بھی شہر میں ان کے اثر و اقتدار کو بہ تنگ تسلیم کیا ہے۔

اصل واقعہ کا تو اللہ ہی کو علم ہے، خاندان میں روایت یہ مشہور چلی آتی ہے کہ تباہی اور بھگدڑ کے وقت

ایک انگریز حاکم (غالباً جوائنٹ مجسٹریٹ) کو مولانا نے ترس کھا کر اپنے ہاں پناہ دی تھی، لکڑی کے ایک بہت بڑے بکس کے اندر چھپا دیا تھا (وہ بکس اب تک ہمارے ہاں موجود ہے) وہیں کھانا پانی پہونچا دیتے تھے۔ وقت آپا دھاپی نفسی نفسی کا تھا کہ کسی فرنگی کو پناہ دینا خود بھی خطرہ سے خالی نہ تھا۔ "باغیوں" کو شبہ ہو جاتا تو خود پناہ دینے والے کو اپنی جان کے لالے پڑ جاتے، وہ انگریز ان کے ہاں سے زندہ سلامت چلا، لیکن قبل اس کے کہ انگریزی لشکر تک پہونچے، راستہ میں قتل ہو گیا۔ بہرحال واقعہ جو کچھ بھی ہو، دوبارہ انگریزی تسلط کے بعد مولانا پر الزام یہ لگا کہ فتویٰ جہاد پر دستخط ان کے بھی تھے، جرم بغاوت کا قائم ہوا، اور سزا چودہ سال کی عبور دریائے شور کی ہوئی۔

اس اسیری اور جلاوطنی میں رفاقت متعدد علماء وقت کی حاصل رہی، دو کے نام تو متعین طور پر معلوم ہیں۔ ایک مولانا مفتی عنایت احمد (صاحب تواریخ حبیب اِلٰہ) دوسرے مشہور معقولی مولانا فضل حق خیرآبادی۔ جلاوطنی کے گیارہ بارہ سال کٹ چکے تھے، کہ اپریل ۱۸۶۹ء میں گورنمنٹ کا یہ اشتہار شائع ہوا کہ بعض عام کتابوں کے ترجمہ پر، اہل علم کو بشرط پسند حکومت سے معقول نقد انعام عطا ہوگا۔ مفتی عنایت احمد صاحب اور مولانا مظہر کریم دونوں صاحبوں نے اس اعلان سے فائدہ اٹھا کر عربی جغرافیہ کی ایک ایک مشہور کتاب اردو ترجمہ کے لئے انتخاب کر لی، مفتی صاحب نے تقویم البلدان کو لیا، اور مولانا نے مراصد الاطلاع کو۔ اور جب انعام کا وقت آیا، تو بجائے کسی نقد رقم کے رہائی کو پیش کیا۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہوا، دونوں رہا کر دئے گئے، اور مولانا غالباً شروع ۱۸۷۰ء میں وطن واپس آ گئے، اسکے بعد وطن ہی میں خانہ نشین رہے۔ تمام یکسوئی کے ساتھ علمی و دینی خدمات میں لگے رہے۔ یہاں تک کہ ۱۰ رشعبان ۱۲۸۹ھ (۱۳ اکتوبر سنہ ۱۸۷۲ء) کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ اہلخانہ کا انتقال چھ ماہ قبل ہو چکا تھا۔ دریاباد کے خاندانی قبرستان میں دونوں قبریں پہلو بہ پہلو ہیں۔ چھ سال ادھر تک لوح مزار پر یہ تاریخ کندہ تھی۔ "دَخَلَ جَنّتَ النّعیم" (۱۲۸۹ھ) اب پتھر گر گیا ہے۔ دو لڑکے اور پانچ لڑکیاں کل سات اولادیں چھوڑیں۔ سب سے چھوٹے فرزند مولوی عبدالقادر مرحوم کا ایک نام لیوا یہ نامہ سیاہ ہے۔

خاص فن، فن فقہ تھا جزئیات کے گویا حافظ تھے۔ استفتے بکثرت آتے رہتے بعض دور دور سے بھی۔ فتاوی ہزارہا کی تعداد میں قلم سے نکلے ہوں گے، جتنے ضائع گئے اُنکا ذکر نہیں۔ جو محفوظ ہیں وہ ایک نسبی چوڑی تقطیع ۲۰۶ ورق یعنی ۴۱۰ صفحات کی ضخیم جلد میں خود مولانا کے ہاتھ کے لکھے ہوئے موجود ہیں۔ مجموعہ کا نام فتاوی مظہریہ ہے۔ آج اگر طبع کرائی جائے تو ضخامت ۲۰ × ۲۶ کی تقطیع کے چار چار سو صفحہ کی دو جلدوں سے کیا کم ہوگی۔

فہرست مضامین اور ترتیب اسطرح کی جامع و مکمل ہے جسطرح عام کتب فتاوی کی ہوتی ہے پہلے کتاب الطہارت و کتاب الصلوۃ سے متعلق مفصل شرح ابواب و فصول اور پھر مسائل صوم و اعتکاف کے بعد کتاب النکاح، کتاب الایمان، کتاب الطلاق وغیرہ ہوتے ہوتے آخر میں کتاب الفرائض۔ البتہ حیرت ہے کہ کتاب الزکوۃ و کتاب الحج سے متعلق کوئی باب و فصل مذکور نہیں۔ کتاب شروع سے آخر تک خود مولانا کے پختہ اور روشن خط میں ہے جلد وغیرہ شکستہ ہوگئی ہے لیکن بہتر بہتر سال گذر جانے پر بھی روشنائی بدستور تازہ اور کاغذ محفوظ و سالم ہے۔

فقہ کی عام کتابوں میں صرف مسائل درج ہوتے ہیں۔ فتاوی مظہریہ میں یہ صورت نہیں بلکہ فتاوی خیریہ نیز بعض جدید تر کتب فتاوی کی طرح پہلے استفتا ملیگا اُسکے بعد مصنف کے قلم سے اس کا جواب۔ کہیں کہیں ایسا بھی ہے کہ کسی معاصر عالم نے اسی استفتا کا کوئی دوسرا جواب دیا ہے یا مصنف کے فتوی پر تنقید کی ہے۔ ایسی صورتوں میں مصنف کی طرف سے از سر نو مفصل بحث و تنقید اور جواب الجواب درج ملتا ہے کتاب النکاح اور کتاب الفرائض کے ماتحت بعض مسائل میں اسکی نمایاں مثالیں موجود ہیں۔ فتاوی کی زبان ہے تو اردو لیکن متعدد فتاوی فارسی میں بھی ہیں۔ اور عربی کتابوں کے بکثرت اقتباسات نے اردو فتووں کی زبان بھی برائے نام ہی اردو رکھی ہے۔ مختصر دیباچہ، مختصر عربی خطبہ کے ساتھ، فارسی زبان میں مولانا کے بڑے صاحبزادہ کے نام سے ہے۔ اسمیں تصریح ہے کہ یہ فتاوی زمانۂ قیام شاہجہانپور کے ہیں؛ اور

"باوصف عدیم الفرصت از مشاغل دنیاوی بباعث علایق چاکری"

مولانا کے کمال تدین و تبحر در علوم شرعیہ کا شہرہ ننگر شاہ آباد و بلگرام و سانڈی دگوپامئو و سپانی و محمدی و تلہر و میرانپور کٹرہ و جلال آباد و کوتارہ و شہر بدایوں و بانس بریلی و دیگر بلاد و قصبات اسلامیہ قریبہ و بعیدہ سے برابر استفتے چلے آتے تھے اور اکثر استفتا مع جواب واپس چلا جاتا تھا۔ جن استفتوں اور ان کے جوابات کی نقل محفوظ رکھی وہی اس مجموعہ میں درج ہیں۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کل تعداد فتاوی کی کتنی ہوگی۔

مہر پر ۱۲۳۶ھ کندہ تھا مطابق ۱۸۲۱ء۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منصب افتا اس سے قبل ہی حاصل ہو چکا تھا۔ قیام شاہجہانپور کی ابتدا یعنی ۱۸۲۹ء سے قبل اور زمانہ گرفتاری و جلاوطنی کے بعد جو فتاوی دیے، افسوس ہے کہ ان کا کہیں پتہ نشان نہیں۔ ان کی ضخامت بھی یقیناً اچھی خاصی ہوگی۔ کتابوں کی کمیابی اس زمانہ میں ظاہر ہی ہے، اس پر بھی خدا معلوم کہاں کہاں سے کتابیں جمع کر لی تھیں۔ فقہ کی چھوٹی بڑی کتابوں کو ملا کر بڑی کثیر تعداد کا حوالہ اپنے فتاوی میں دیتے ہیں۔ دُرمختار بہت قدیم کلکتہ کی چھاپہ کی ابھی چند سال اُدھر تک ان کے ذخیرہ میں محفوظ تھی۔ اور مؤطا امام مالکؒ۔ اتقان۔ تفسیر احمدی۔ مشکوٰۃ۔ شرح سفر السعادۃ۔ فتاوی قاضی خان۔ فصول عمادیہ وغیرہ کے بہت ہی قدیم نسخے کلکتہ یا دہلی کے چھپے ہوئے ابتک مرحوم کے ترکہ کے ذخیرہ میں موجود ہیں۔ پھر جو قلمی یا مطبوعہ کتاب خود نہ حاصل کر سکے۔ اسکی نقل اپنے ہاتھ سے کر لی! بڑی سی بڑی ضخامت ان کے نزدیک کوئی چیز ہی نہ تھی۔ فتاوی بزازیہ، بڑی لمبی چوڑی تقطیع پر ۵۰۴ ورق (۱۰۰۸ صفحہ) کے حجم کی، کہ آج اسکی شکل دیکھکر ہیبت طاری ہوتی ہے، تمام و کمال ان کے ہاتھ کی نقل کی ہوئی موجود ہے! خاتمہ پر سال کتابت ۱۲۴۳ھ دیا ہوا۔ مطابق ۱۸۳۲ء۔ یعنی عین سرکاری ملازمت کی مشغولیت کا زمانہ تھا۔ یہ حال جوانی کا تھا۔ ۲۰۔۲۱ سال بعد بڑھاپے میں انڈمان میں تھے کہ تقویم البلدان کہیں سے ہاتھ آگئی! اپنے ہاتھ سے پوری نقل کر کے بڑے بھائی (مولوی حکیم نور کریم صاحب) کے نام روانہ کرائی یا ساتھ

بریں سنہ ۱۲۸۰ کی پڑی ہی ہو بمطابق ۱۸۶۳ء۔ اللہ اللہ! کیا ہمتیں تھیں اور کیا قوتیں!

بامصد الطلاح کا ترجمہ اوپر ذکر آچکا ہے کہ ہمیں جزیرہ انڈمان میں جلا وطنی کے زمانہ میں کیا۔ اصل کتاب عربی زبان لغت عربانیہ پر ایک معروف تالیف ہے۔ زمانہ تالیف ۹۹۵ھ اردو ترجمہ۔ اصل عربی کے اتباع میں دو حصوں میں ہے۔ حصہ اول حرف ہمزہ سے حرف ز تک۔ حصہ دوم حرف س سے حرف ی تک۔ پہلا حصہ مترجم کے نسخہ خطی میں ۲۶۳ ورق تک آیا ہے یعنی ۵۲۶ صفحہ۔ دوسرے حصہ کی ضخامت ۲۲۰ ورق یا ۴۴۰ صفحہ کی ہے۔ کل میزان ۹۶۶ صفحات کی۔ ترجمہ ۱۸۶۹ء میں تمام ہوگیا تھا۔ اور آج نسبراً اکثر سال گذرجانے پر مسودہ بدستور غیر مطبوع پڑا ہوا ہے۔

مترجم کا مختصر دیباچہ ہدیۂ ناظرین ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حمد و ستایش فراواں و شکر و نیایش بیکراں تا در بیچوں کو لائق ہے کہ آسمان کو بے ستون اور زمین کو اوپر پانی کے محض اپنی قدرت سے پیدا کیا اور روئے زمین کو امصار و قریات عظیمہ و حصون حصینہ و مکانات عجیبہ اور صحرا و بیاباں و کوہ ہائے متنوعہ سے زینت دیا۔ اور درود وافر و تسلیم متکاثر نثار حضرات انبیاء و رسولان کرام کے ہو کہ احکام حضرت حق جل شانہ کے مخلوقات پر ہویدا کر کے ظلمات ضلالت سے نکال کر شاہراہ ہدایت پر چلایا کہ بدولت ان کے تمیز و دانش آدمیوں کو اسقدر ہوئی کہ جہالت و خواص بہائمی سے دور ہو کر مراتب ملکوتی پر از روئے علم و عبادت بڑھ گئے۔ بعد حمد و صلوٰۃ کے کمترین خادمان علماء و فضلاء و ادباء محمد مظہر کریم ساکن قصبہ دریاباد پرگنہ ضلع نواب گنج بارہ بنکی متعلقہ ملک اودھ لکھنؤ عرض کرتا ہے کہ عرصۂ دراز سے مکنون خاطر تھا کہ کوئی ایسی کتاب تالیف و جمع کروں کہ بلا قید مذہب و ملت کے مفید عامۂ خلق و مرغوب و مطبوع خاطر ہر فرد بشر ہو۔

وباعث نفع یابی عام بمجولائے اشتہار گورنمنٹ ممالک مشرقی ومغربی نمبری ۹۱، والف ۲ مورخہ ۲۰ ماہ اگست ۱۸۶۹ء واشتہار گورنمنٹ صیغہ متفرقہ نمبری ۱۹۲۶ مورخہ ۱۹ اپریل ۱۸۶۹ء مطبوعہ اردو گورنمنٹ گزٹ ۲۸ اپریل ۱۸۶۹ء مقبول حضور گورنمنٹ بہادر ہوکر مستحق عطا و پرورش سرکاری کا ہوتی۔ ان دنوں کتاب مراصد الاطلاع علی اسماء الامکنہ والبقاع تصنیف قدوۃ المحققین وزبدۃ المدققین ابو الفضائل صفی الدین بن عبد المومن بن عبد الحق مدرس مدرسہ حنبلی بغداد کہ عبارت عربی میں چند مجلد ضخیم مصنفہ یازدہم شوال ۷۰۹ھ قدیمی تھی، مجکو دستیاب ہوئی۔ کیا عمدہ و نفیس کتاب ہے کہ فن جغرافیہ و تواریخ بلدان میں نظیر بے عدیل ہے مصنف نے کمال تحقیق سے جمع کیا مگر باعث عبارت عربی کے ہر ایک شخص اسکے فائدہ سے محروم تھا۔ لہذا میں نے ترجمہ اسکا بزبان اردو کیا۔ وسوائے ترجمہ عربی اصل کتاب کے کچھ کمی بیشی اپنی طرف سے نہیں کیا۔ اُمید عالمان و واقفان فن جغرافیہ و علم بلدان و سیر و تواریخ سے یہ ہے کہ اگر کسی جگہ غلطی ہو تو اصلاح فرمادیں و مجھکو مورد طعن و تشنیع نہ فرمادیں۔"

ترجمہ میں لفظی پابندی بہت برتی گئی ہے عجب نہیں کہ بعض مسامحات بھی ہو گئے ہوں۔ بہرحال اب اگر کوئی صاحب علم سارے ترجمہ پر ایک بار پھر نظر کرلیں اور جدید معلومات کے لحاظ سے بھی حواشی کا اضافہ کردیں تو کتاب طبع ہوکر اردو کے ذخیرۂ علوم میں ایک اچھا اضافہ بن سکتی ہے۔

حضرت رسالتؐ کے ساتھ خاص شیفتگی تھی۔ اور اس نے طبیعت میں محفل میلاد اور قیام تعظیمی جیسے مسائل کی حمایت و تائید میں غلو پیدا کردیا تھا۔ چنانچہ ایک مستقل کتاب دوران قیام شاہجہانپور میں اسی بحث پر لکھ ڈالی۔ اور زمانہ کے اکثر علماء کے ہاں خاص اہمیت تھی ہی اسی قسم کے مباحث کی۔ کتاب کا نام بلوغ المرام فی تحقیق المولد والقیام لتعظیم سید الانام ضخامت ۲۰ × ۲۶ کی تقطیع پر ۴۷ صفحہ سال طبع ۱۲۷۱ھ ۱۸۵۵ء

لکھنؤ میں اُسوقت مشہور مطبع کپتان تہور الدولہ مرزا مہدی علیخاں کا مطبع علوی تھا۔ وہیں کی چھپی ہوئی ہے۔ سرورق پر نام مولانا کے پردادا سید شاہ رؤف احمدؒ بانسوی کا پڑا ہوا ہے لیکن تالیف دراصل خود مولانا کی جو معاصرین میں، کوئی صاحب مولوی عبدالواحد فرخ آبادی اور مولوی نجم الدین قنوجی تھے، جو مانعین محفل میلاد تھے۔ انھیں دونوں صاحبوں کے مختصر فتاوی کے جواب میں یہ ایک مفصل و مبسوط فتوی بالمجموعہ شائع ہوا تھا جس پر دستخط اور عبارتیں بہت سے علماء عصر کی موجود تھیں۔ ان میں سب سے زیادہ مدلل و متوازن فتوی مفتی صدرالدین خاں دہلوی شاہی مفتی کے قلم سے ہے۔ اسکی ایک عبارت جا بجا ایک کرم خوردہ کتاب میں کسی عبارت کا صحیح پڑھا جانا ممکن ہے، حسب ذیل ہے:

"عمل مولد شریف در ماہ ولادت حضرت سید الاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وسلم، اجتماع مومنین صالحین دریں روز مسعود اگر خالی باشد از منہیات و مکروہات و منکرات و بدعات و رسوم و عادات غیر شرعیہ مثل غنا و سرود بہ آلات مطربہ محرمہ فتنہ زا و طلب فساق و اہل ع و ابدا و صرف مال حرام از رشوت و غصب و ریا و قصد ثنا و ستایش از خلق خدا و ناموری در اہل دنیا و ذکر حکایات ... عہ و قصہ ہائے بے اصل و بے سر و پا و طلب منافع و اخذ زر بدیں تقریب خوشامد و طرد و منع سائلان و عدم اعتنا بحال فقرا و مدارات و تواضع با امرا و تطویل مجالس با انتظار اغنیا و مردم ذی وجاہت از مشائخ و اہل دنیا و بیان ولادت و نشر مناقب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم موافق احادیث و آثار صحیحہ در آں محفل قدسی شامل و اظہار سرور و ادائے شکر حق سبحانہ بریں نعمت متبرک و خواندن درود و تسبیح و تہلیل و تلاوت قرآن و ابیات نعتیہ و تکمیل ذکر سید انام علیہ الصلوۃ والسلام و عد محاسن و تعظیم امر و تفنویہ قدر حضرت صلی اللہ علیہ وسلم و اطعام صلحا و فقرا و مساکین و ایثار صدقات و

عہ لفظ کرم خوردہ

خیرات در آں روز ہمیت افزوں از بہترین اعمال حسنہ ست و متوارث ست از علمائے اعلام و قضاۃ و مفتیان اہل اسلام" (ص۲۳)

ص۲۱ سے ایک شہر میں تعدد جمعہ کے عدم جواز کے باب میں مولوی محبوب علی صاحب مرادآبادی کے فتوی کا مفصل جواب شروع ہو گیا ہے۔ پھر ص۱۶۹ سے آخر تک بندوق کی گولی سے مرے ہوئے جانور کی حرمت کے فتاوی درج ہیں۔

(بقیہ ص۲) بڑے طلبہ کے لئے مباحثہ (ڈبیٹ) کا یہ عنوان تھا کہ "اس ایوان کی رائے میں موجودہ تہذیب انسانیت کے لئے باعث ہلاکت ہے" ان مباحثے میں طلبہ نے دلچسپی سے حصہ لیا اور متعدد طلبہ نے انعامات حاصل کئے۔

اس تقریری مقابلہ کے ساتھ ساتھ تحریری مقابلہ بھی ہوا جس میں چھوٹے، متوسط اور بڑے طلبہ کیلئے علی الترتیب "بچوں کی اسلامی خدمات" "اسلام کی تعمیر میں صوفیہ کرام کا حصہ" اور "دنیا کا آئندہ نظام" عنوانات دیے گئے تھے۔ افسوس کہ امتحان کی مصروفیتوں کی بنا پر اس مقابلہ میں زیادہ طلبہ شریک نہ ہو سکے۔ تاہم کئی لڑکوں نے مضامین لکھے اور انعامات حاصل کئے۔ اب آجکل النادی العربی (سوق عکاظ) کے آل انڈیا تقریری مقابلہ کا انتظار ہے جو اس مہینہ کے وسط میں ہو رہا ہے۔

الندوہ کے حلقہ میں رسالہ نگار اور اسکے مدیر نیاز فتحپوری کے لئے کسی تعارف کی ضرورت نہیں، ادھر پچھلے چند برسوں سے انھوں نے آزادانہ مذہبی مباحث کا سلسلہ شروع کر دیا ہے، کلام کی شوخی رفتہ رفتہ رکاکت کی حد تک پہونچی، ان مباحث نے دیندار طبقہ میں ایک عام بےچینی پیدا کر دی چنانچہ چند برس ہوئے اس بارہ میں ناگواری اور برہمی کے سخت مظاہرے ہوئے۔ ان حالات سے متاثر ہو کر نیاز صاحب نے گذشتہ واقعات پر افسوس کا اظہار کیا آئندہ کے لئے احتیاط کا وعدہ کیا، لیکن افسوس کہ یہ وعدہ زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکا، اب ایک عرصہ سے پھر

(باقی صفحہ ۲۰ پر ملاحظہ فرمائیے)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اخلاق کا حصّہ قومی تعمیر میں

از شاہ محمد عطا صاحب سلونی

کسی قوم کے عروج و زوال، تعمیر و تخریب اور ترقی و تنزل کے مختلف اسباب اور محرکات ہوا کرتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہو کہ اخلاق کو اس میں خاص اہمیت حاصل ہو۔ اس مضمون میں ذرا تفصیل سے اسی بات پر غور کرنا ہے اور دکھلانا ہو کہ ملت کی تعمیر کا اہم جزو اخلاق کی صحیح تربیت ہے۔

اخلاق کی تعریف اخلاق سے مقصود باہم بندوں کے حقوق و فرائض کے وہ تعلقات ہیں جنکو ادا کرنا ہر انسان کے لئے مناسب بلکہ ضروری ہو۔ انسان جب اس دنیا میں آتا ہو تو دنیا کی ہر چیز سے اسکا کچھ نہ کچھ تعلق پیدا ہو جاتا ہو اسی تعلق کے فرض کو بحسن و خوبی انجام دینا اخلاق ہےلے۔

اخلاق اور انسانی نشوونما اخلاق کی تولید و نشوونما کے مختلف علل و اسباب ہوتے ہیں آب و ہوا جغرافیائی ماحول، مذہب اور حکومت تہذیب و معاشرت، وحشت و جہالت، اخلاق و عادات کی تولید کے خاص اسباب ہیں۔

یہی وجہ ہو کہ دنیا کی مختلف قوموں کے اخلاق میں بہت بڑا اختلاف ہو کیونکہ ہر ملک کا جغرافیائی ماحول جدا ہو اور ہر جگہ کے جغرافیہ کا انسانی سوسائٹی پر خاص اثر پڑتا ہے مثلاً عرب گرم ملک ہو وہاں کے باشندوں کی ضروریات جداگانہ ہیں پتھریلی زمین اور کوہستانی مقامات میں زندگی بسر کرنے کے لئے اُن کو بہت جد و جہد کرنی پڑتی ہو اس چیز نے انھیں جوشیلا اور غصہ ور تند مزاج اور جفاکش بنا دیا ہو۔ وحشت و جہالت اور بدویانہ طرز زندگی نے بھی اُنہیں ایک خاص قسم کا

لے سیرۃ النبی جلد ۶

اخلاقی نظام پیدا کر دیا ہے۔

غرض جسقدر بھی آپ غور کریں اور جسقدر گہری نگاہ ڈالیں اُسی قدر آپ کو یقین ہوتا جائیگا کہ ملک اور اُسکی آب وہوا کا انسان پر بہت زیادہ اثر پڑتا ہے جیسا آدمی کھاتا پیتا ہے جیسی اسکی معاشرت ہوتی ہے ویسے ہی اُسکے خیالات ہوتے ہیں اور ویسے ہی وہ کام کرتا ہے اُسکے خورد و نوش، غور و فکر بود و باش اور کاروبار کے مطابق ہی اُسکی سوسائٹی بنتی ہے اور آپس کے تعلقات ہوتے ہیں۔

اصناف اخلاق اخلاق کے دو خاص حصے ہیں۔ فضائل اور رذائل۔ فضائل اخلاق کی قرآن مجید اور احادیث نبوی میں جا بجا تفصیل ہے۔ جن اخلاقی فضائل کا بیان آیا ہے وہ عام طور سے صدق، سخاوت، عفت و پاکبازی، انصاف و امانت، شرم و حیا، رحم و کرم، ایفائے عہد، احسان، بردباری، عفو و درگذر، رفق و لطف، تواضع و خاکساری، ایثار و اتحاد اور میانہ روی و شجاعت ہیں۔

رذائل اخلاق میں جھوٹ، وعدہ خلافی، خیانت و غداری، بہتان و غیبت، بخل و حرص، بے ایمانی و چوری، سود خواری و شراب خواری، بغض و حسد، ظلم، غرور، خود بینی و خود نمائی، فضول خرچی اور فحش گوئی شامل ہیں۔

اخلاق اور قومی عروج اخلاق کی عمدگی اور تمدن کی ترقی لازم و ملزوم ہیں جب کوئی قوم اخلاقی حیثیت سے اپنی حالت درست کرتی ہے تو وہ ترقی اور عروج پر ہوتی ہے اور جب اس کا اخلاق گرا ہوا ہوتا ہے تو وہ ہر حیثیت سے پست ہوتی ہے۔ قوموں کی تاریخ خود اس بات پر گواہ ہے کہ وہ تمام قومیں جو ایمان اور عمل صالح سے آراستہ تھیں، عروج پر تھیں اور وہ تمام قومیں جنکا اخلاق درست نہ تھا قائم نہ رہ سکیں اور دنیا میں ذلیل و خوار ہو کر رہ گئیں۔ اسکی سب سے بڑی مثال یہودی قوم ہے اب ہم اسی نظریہ کے ماتحت گذشتہ قوموں کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالیں گے۔ انسانی تمدن کا ایک نہایت پیچیدہ اور اہم مسئلہ یہ ہے کہ عورت اور مرد کا تعلق کس طرح قائم کیا جائے۔ اسی مسئلہ کو

لئے ہم آگے بڑھتے ہیں کیونکہ یہ ایک بہت اہم مسئلہ ہے جو گوناگوں اخلاقی اوصاف کا حامل ہے اور حقیقت یہ ہے کہ عورت اور مرد کا تعلق ہی دراصل تمدن کا سنگ بنیاد ہے۔

اس باب پر جب ہم تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہم کو افراط و تفریط کی کشمکش کا ایک عجیب سلسلہ نظر آتا ہے ایک طرف ہم دیکھتے ہیں کہ وہی عورت جو ماں کی حیثیت سے آدمی کو جنم دیتی ہے اور بیوی کی حیثیت سے زندگی کے نشیب و فراز میں مرد کی رفیق رہتی ہے وہ لونڈی کے درجہ میں رکھدی جاتی ہے اسکو بیچا اور خریدا جاتا ہے اسکو ملکیت اور وراثت کے تمام حقوق سے محروم رکھا جاتا ہے اسکو گناہ و نجاست اور ذلت کا مجسمہ سمجھا جاتا ہے۔ دوسری طرف ہم کو یہ نظر آتا ہے کہ وہی عورت اُٹھائی اور اُبھاری جا رہی ہے مگر اس شان سے کہ اُسکے ساتھ بداخلاقی اور بدنظمی کا طوفان بھی اُٹھ رہا ہے اور اسکے اُبھرنے کے ساتھ انسانیت کے گرنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے عورتوں اور مردوں کے اختلاطات فواحش کا سیلاب پھوٹ پڑتا ہے عیش پرستی پوری قوم کو تباہ کر دیتی ہے اخلاقی تنزل کے ساتھ ذہنی جسمانی اور مادی قوتوں کا تنزل بھی لازمی طور پر رونما ہو جاتا ہے جسکا آخری انجام ہلاکت اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

یونان اقوام قدیمہ میں سے جس قوم کی تاریخ سب سے زیادہ شاندار نظر آتی ہے وہ اہل یونان ہیں۔ تمدنی ارتقاء کے ابتدائی مراحل میں تہذیب اور علم کی روشنی کا صرف اتنا اثر ہوا کہ عورت کو معاشرت میں نسبتاً ایک بلند تر حیثیت دیدی گئی۔ گھر کے اندر اُسکے احکام چلتے تھے وہ یونانی گھر کی ملکہ تھی۔ اُسکی عصمت ایک قیمتی چیز تھی پردے اور نکاح کا عام رواج تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب یونانی قوم خوب طاقتور تھی، اور اُسکی تہذیب اسکے تمدن اور اُسکے علم و ہنر کی نہایت سرعت کیساتھ ترقی ہو رہی تھی، اُسی زمانہ میں بڑے بڑے فلاسفر، شعرا، مورخین اور اہل ادب پیدا ہوئے۔ مگر رفتہ رفتہ اُن پر نفس پرستی کا غلبہ شروع ہوا۔ یہانتک کہ اُن کے ذہن سے یہ خیال ہی جاتا رہا کہ عصمت و عفت بھی کوئی چیز ہے اور نفس پرستی بھی کوئی اخلاقی

عیب ہے اُن کا اخلاقی معیار اتنا بدل گیا کہ بڑے بڑے فلاسفہ اور معلمین اخلاق بھی زنا اور فحش میں کوئی قباحت اور کوئی قابل ملامت چیز نہ پاتے تھے معیار اخلاق کے اسقدر گر جانے کے بعد تاریخ کی شہادت تو یہی ہے کہ یونان کو پھر کبھی عروج نہیں ہوا۔

بابل ایران اور ہندوستان ہندوستان میں بام برگ اور ایران میں مزدکیت کا ظہور بھی اسی زمانہ میں ہوا۔ بابل میں بھی قحبہ گری کو مذہبی تقدس کا درجہ اسی زمانہ میں حاصل ہوا جس کے بعد پھر دنیا نے کبھی بابل کا نام افسانۂ ماضی کے سوا کسی دوسری حیثیت سے نہ سنا۔

روم روم کا بھی یہی حال ہوا تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ اُن کا نظریہ عورت کے بارے میں بدلتا چلا گیا اور ان میں رفتہ رفتہ تمام بداخلاقیاں سرایت کر گئیں مشہور رومی فلسفی و مدبر سنیکا (۴ سنہ ق م تا ۶۵ سنہ ء) سختی کے ساتھ رومیوں کی کثرت طلاق پر ماتم کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ "اب روم میں طلاق کوئی قابل شرم چیز نہیں رہی عورتیں اب اپنی عمر کا حساب اپنے شوہروں کی تعداد سے لگاتی ہیں۔" بہیمی خواہشات سے بے انتہا مغلوب ہو جانے کے بعد روم کا قصر عظمت ایسا ہلا کہ آج صرف وہ ایک داستان ماضی ہے۔

دیگر قدیم اقوام عاد، ثمود، قوم لوطؑ اور اہل مدین کی ہلاکت اور بربادی کا بھی خاص سبب اُن کا اخلاقی انحطاط تھا۔ عاد و ثمود نے شرک و بت پرستی میں اتنا غلو کیا کہ اُن سے تمام اخلاقی اوصاف جاتے رہے اور آخر اُن پر عذاب الٰہی مسلط ہو گیا۔ حضرت شعیبؑ جب اپنی قوم کو ناپ تول کی کمی بیشی اور شرک سے روکتے تھے تو وہ برجستہ اُن سے یہ کہتی تھی کہ " اصلوا ذلک تامرک ان نترک ما یعبدا باؤنا او ان نفعل فی اموالنا ما نشاء، کیا تمہاری نماز تم کو یہ حکم دیتی ہے کہ ہم اپنے معبودوں کی پرستش کرنا چھوڑ دیں جنکو ہمارے باپ دادا پوجتے آئے اور اس طریقہ کو چھوڑ بیٹھیں کہ ہم اپنے مالوں میں جس طرح سے چاہیں کریں؟) اس نافرمانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہلاکت و بربادی اُن پر مسلط ہو گئی حضرت لوطؑ کی قوم کی داستان بھی ایک عبرت انگیز داستان ہے جس سے اخلاقی انحطاط اور قومی زوال کا لازم

ملزوم ہونا بالکل عیاں ہو حضرت نوحؑ کی قوم کا اخلاقی احساس تو اسقدر مردہ ہو چکا تھا کہ شرک و بت پرستی میں مبتلا ہو کر وہ ہر طرح کی برائیوں میں مبتلا تھے مگر حضرت نوحؑ کی نو سو سالہ جد و جہد کا کوئی اثر نہ ہوا آخر اخلاقی انحطاط کے سبب قوم نوحؑ غرق آب ہو کر فنا کے گھاٹ اتر گئی۔

اوپر کی تاریخی مثالوں سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ گذشتہ قومیں عمدہ اخلاق کی بدولت ابھریں اور اخلاقی انحطاط ہی کے سبب اُن کا زوال ہوا۔ والعصر ان الانسان لفی خسر الا الذین امنوا و عملوا الصلحٰت (زمانہ کی قسم انسان گھاٹے میں ہیں مگر وہ جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے)

اخلاق اور مذاہب اخلاق کی اسی اہمیت کو مد نظر رکھتے ہوئے تمام دنیا کے مذاہب نے اخلاق پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔ اصل شریعت میں دنیا کے اکثر مذاہب میں اشتراک اور اتحاد پایا جاتا ہے لیکن ان کے طریقے اور ان کے جزئیات کے احاطہ میں کمی بیشی ہے اور اسی چیز نے اُن میں امتیاز پیدا کر دیا ہے۔

اسلام اور اخلاق اسلام کو دوسرے مذاہب پر جو ترجیح ہے اُسکا ایک سبب اُسکے احکام کی تفصیل ہمہ گیری اور انضباط ہے یعنی اسلام نے اپنے اصول اور احکام کی تفصیل اس وسعت اور جامعیت کے ساتھ کی ہے کہ برائیوں کا کلی استیصال ہو گیا ہے اور نیکیوں کے نظام عام ہو گئے ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا کے سارے مذہبوں کی بنیاد اخلاق ہی پر ہے لیکن مذہب کے دوسرے ابواب کی طرح اس باب میں بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ایک تکمیلی حیثیت رکھتی ہے خود آپ نے ارشاد فرمایا۔ بعثت لاتمم مکارم الاخلاق (میں حسن اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہوں)[1] اس سے بھی زیادہ صاف الفاظ یہ ہیں کہ انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق[2] (میں تو اسی لئے بھیجا گیا ہوں کہ اخلاق حسنہ کی تکمیل کر دوں) پیغمبری کی خلعت سے سرفراز ہونے کے بعد ہی آپنے اس فرض کو

---

[1] مؤطا امام مالکؒ [2] مسند امام احمدؒ

انجام دینا شروع کر دیا حضرت ابوذر غفاریؓ کے بھائی ابتدا میں جب حضرت نئے پیغمبر کی تصدیق کے لئے آئے تو لوٹ کر اپنے بھائی سے کہا کہ (رایتہ یامر بمکارم الاخلاق) (میں نے اُسے دیکھا کہ وہ مکارم اخلاق کا حکم دیتا ہو) خود حضرت جعفرؓ نے نجاشی کے سامنے دربار حبشہ میں جو تقریر کی تھی اسمیں بھی اسی بات کو تفصیل سے بیان کیا تھا کہ آنحضرتؐ مکارم اخلاق کی تعلیم دیتے ہیں۔ قرآن مجید نے جا بجا آنحضرتؐ کی تعریف میں یہ کہا ہے کہ

و یزکیہم و یعلمہم الکتاب و الحکمۃ (پیغمبر اُن پڑھ جاہلوں کو پاک و صاف کرتا ہے اور اُن کو کتاب و حکمت کی باتیں سکھاتا ہے) ایک اور آیت اسی مضمون کی ہے۔

یا ایہا الذین امنوا ارکعوا و اسجدوا و اعبدوا ربکم و افعلوا الخیر لعلکم تفلحون (اے ایمان والو رکوع کرو سجدہ کرو اپنے رب کو پوجو اور نیکی کرو تا کہ تم فلاح پاؤ) اس سے ظاہر ہے کہ اسلام میں گویا ایمان کے بعد دو اہم چیزیں ہیں۔ ایک عبادات اور دوسرے اخلاق۔ ایک خالق کا حق دوسرا مخلوق کا، اور انھیں کے مجموعہ کا نام اسلام ہے۔

عربوں کے اخلاقی اوصاف تفصیلات بالا سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہو کہ اسلام میں اخلاق کو کیا اہمیت حاصل ہو اور کیوں نہو جبکہ اسلام ایک دائمی مذہب ہے۔ اس موقعہ پر ایک بات اور قابل غور ہو کہ کیا آنحضرتؐ کی بعثت کے لئے عرب جیسے ریگستان کے علاوہ اور کوئی بہتر جگہ نہ ہوسکتی تھی؟ حقیقت یہ ہو کہ عرب سے بہتر موزوں مقام کوئی نہ ہوسکتا تھا چھٹی صدی کی تاریخ دیکھئے تو آپکو معلوم ہوگا کہ اس نبوت کے لئے عربی قوم سے زیادہ مناسب کوئی قوم نہ تھی۔ بڑی بڑی قومیں اپنا اپنا زور دکھا کر گویا بے دم ہوچکی تھیں اور عربی قوم تازہ دم تھی، تمدن کی ترقی سے دوسری قوموں کی عادتیں بہت بگڑ گئی تھیں اور عربی قوم میں اُسوقت تک کوئی ایسا تمدن پیدا ہی نہ ہوا تھا جو اُسکو رذیل، آرام پسند اور عیش پسند بنا دیتا اہل عرب اُس زمانہ کی متمدن قوموں کے بُرے اثرات سے بالکل پاک تھے، اُنمیں وہ تمام انسانی خوبیاں

موجود تھیں جو ایک ایسی قوم میں ہو سکتی ہیں جسکو تمدن کی ہوا نہ لگی ہو۔ وہ بہادر تھے، شجاع تھے، بخوف تھے، فیاض تھے، عہد کے پابند تھے۔ آزاد خیال اور آزادی پسند تھے، غلام نہ تھے۔ اپنی عزت پر جان دیدینا ان کے لئے آسان تھا۔ نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے اور عیش و عشرت سے بیگانہ تھے۔ اسمیں شک نہیں کہ انمیں بہت سی برائیاں بھی تھیں مگر یہ اسلئے تھیں کہ ہزاروں برس سے ان کے ہاں کوئی پیغمبر نہیں آیا تھا، نہ کوئی ایسا رہنما پیدا ہوا تھا جو ان کے اخلاق درست کرتا اور انھیں تہذیب سکھاتا۔ وہ عرصہ دراز تک ریگستان میں زندگی بسر کرتے رہے، جہالت میں اسقدر سخت ہو گئے تھے کہ انکو آدمی بنانا کسی معمولی انسان کا کام نہ تھا۔ لیکن اسکے ساتھ انمیں یہ قابلیت ضرور موجود تھی کہ اگر کوئی زبردست انسان انکی اصلاح کردے اور اسکی تعلیم کے اثر سے وہ کسی اعلیٰ مقصد کو لیکر اٹھیں تو دنیا پر چھا سکتے جائیں، اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے اسلئے اسکو ایسی ہی جوان، طاقتور، بلند اخلاق اور بلند نظر قوم کی ضرورت تھی۔

آنحضرتؐ اور اخلاقی تعلیم ہم دیکھتے آنحضرتؐ کی اصلاح کا کیا نتیجہ ہوا، عربوں کے اخلاق درست ہونیکے بعد دنیا نے کیا دیکھا، انھوں نے چار دانگ عالم میں اسلام کا ڈنکا بجایا، مشرق اور مغرب کے ڈانڈے ملا دیے بحر و بر پر ان کا قبضہ ہو گیا۔ اور وہی ان پڑھ اور جاہل عرب تہذیب و تمدن اخلاق و عادات، عدل و انصاف، علم و ہنر اور حکومت و سیاست میں دنیا کے معلم بن گئے ؎

غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرا نشیں کیا تھے
جہانگیر و جہاندار و جہانبان و جہاں آرا

(باقی)

(بقیہ نوٹ) قابل اعتراض مذہبی مباحث شروع ہو گئے ہیں جنپر ملک کے مختلف حصوں سے ناراضگی کا اظہار ہو رہا ہے۔ اس سلسلہ میں ۲۳ جولائی کو دار العلوم میں بھی ایک احتجاجی جلسہ منعقد ہوا جس میں کیاز صاحب کی اس روش کے خلاف سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا۔

جامعہ ازہر

از
حافظ محمد عمران خاں ندوی متخصص ازہر انچارج مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء

(۴)

ازہر کا موجودہ نظام

ازہر میں اسوقت ۲ قسم کی تعلیم ہے۔

۱۔ غیر نظامی۔

۲۔ نظامی۔

۱۔ پہلے ہم غیر نظامی تعلیم کو بہ تفصیل لکھنا چاہتے ہیں۔ اسلئے بھی کہ ازہر کی تعلیم کی تفصیلات اور پورا حال نہ جاننے کی وجہ سے ہندوستان میں بالخصوص ازہر سے واپس آنیوالے طلبہ نے خاصی غلط فہمی پھیلا رکھی ہے بعض اوقات تو آدمی متحیر ہو جاتا ہے کہ فلاں شخص جو ہندوستان میں معمولی صلاحیت بھی نہیں رکھتا تھا معمولی مدت میں کیونکر ازہر ایسی وسیع درسگاہ سے سند فراغت حاصل کر کے واپس آگیا۔ ذیل کے تفصیلات سے سندوں کی اصلی قدر و قیمت معلوم ہو گی اور پتہ چلے گا کہ خاصی طویل مدت میں بھی رہنے کے بعد اب تک ازہر سے ہندوستانی طلبہ کیا لائے ہیں۔

اس غیر نظامی تعلیم کا نام مصر میں قسم عام ہے جسمیں عموماً غیر مصری طلبہ داخل ہوتے ہیں۔ اسمیں ہندوستانی، عراقی، ترکی، شامی، فلسطینی، دمشقی، حجازی، چینی، جاپانی، البانی، جاوی غرضکہ تمام دنیا کے غیر مصری عموماً اسی قسم میں داخل ہوتے ہیں۔ داخل ہونیکی شرط غیر مصری طلبہ کے لئے یہ ہے کہ وہ کچھ عربی (کم سے کم قرآن شریف کا کچھ حصہ بوقت امتحان داخلہ قرآن میں دیکھکر پڑھ سکیں جو طالبعلم اس لیاقت کا حامل ہو وہ قسم عام میں داخل ہو جاتا ہے، اس میں طریقۂ تعلیم وہی پرانا ہے۔

ازہر کی مسجد میں ہر ستون کے پاس مختلف اساتذہ مختلف فنون کے درس دیتے ہیں۔ طالب العلم کا جس اُستاد کے پاس جی چاہے بیٹھ جائے سبق سُن لے کہنے کو نام کے لئے حاضری ہوتی ہے لیکن وہ نہونے کے برابر ہو۔ امتحان کی قیود سے طالب علم اسوقت تک آزاد رہتا ہو جبتک کہ وہ خود مقررہ نصاب میں اپنے کو اس قابل نہ سمجھے کہ امتحان دے سکتا ہو۔ اس درجہ میں ابتدائی علوم صرف ونحو وغیرہ ۱۲ علوم کا امتحان دیا ہوتا ہو۔ طالب علم کو اختیار ہو کہ وہ جے برس تک جی چاہے اس درجہ میں رہے، چاہے امتحان دے چاہے نہ دے۔ کسی قسم کی کوئی بازپرس اس سے ضروری نہیں، جب طالب علم یہ سمجھے کہ اب اُسے امتحان دینا ہو اور اس قابل ہوگیا ہو کہ امتحان دیسکے درخواست پیش کردے کہ امسال امتحان میں بیٹھنا چاہتا ہوں، اسکا نام امتحان دینے والے طلبہ میں درج کرلیا جائے گا۔

طریقۂ امتحان اس درجہ کا طریقۂ امتحان بھی بہت ہی عجیب وغریب ہو، امتحان کے لئے تین اساتذہ کی کمیٹی بنادی جاتی ہو، یہ کمیٹی امتحان سے ایک ہفتہ قبل اعلان کرتی ہے کہ امتحان دینے والے طلبہ اپنی اپنی کتابیں لیکر فلاں وقت فلاں جگہ حاضر ہوں۔ طلبہ جاتے ہیں استاد بارہ بارہ پندرہ پندرہ طالبعلموں کے ایک ایک گروپ کو ان کی کتاب لیکر کتاب کے چند صفحے جو عموماً دس بارہ سے زیادہ نہیں ہوتے متعین کردیتے ہیں کہ فلاں بحث میں فلاں صفحہ سے فلاں صفحہ تک امتحان ہوگا۔ طالب علم واپس آکر ایک ہفتہ کے اندر اسکو خوب مع حاشیہ وشروح کتنا چاہئے کہ حفظ کرلیتے ہیں بلکہ حیرت ہوگی کہ بعض اساتذہ مصر میں خاص ایسے ہیں کہ اس تعین شدہ حصہ پر طلبہ کو خاص طور سے تیار کرلتے ہیں اس امتحان کا نام امتحان تعیین ہے، کیونکہ اسمیں امتحان والا حصہ متعین کردیا جاتا ہو، امتحان کے دن طالبعلم وہ حفظ شدہ حصے کتابوں کے لیکر جاتا ہو ممتحن اسمیں (عموماً کتاب دیکھکر) امتحان لیتا ہو، اور ساری کتابوں کا اسی طرح ایک ہی دن میں امتحان ختم ہوجاتا ہو، آپکو شاید حیرت ہو کہ اس درجہ میں ایسے ایسے لائق طلبہ امتحان میں ہوتے ہیں جو باوجود ان ساری مراعات کو بھی فیل ہوجاتے ہیں۔

اس درجہ میں کونسی سند دیجاتی ہے جو طلبہ اس امتحان میں پاس ہوجاتے ہیں ان کو شہادہ عالیۃ الغربا، دیجاتی ہو، یہ غربا، جمع ہو غریب کی، غریب یعنی اجنبی، غیر مصری، جو طلبہ فیل ہوتے ہیں انکی دو قسمیں ہوتی ہیں بعض ایسے ہوتے ہیں جو مقررہ ۱۲ علوم میں سے ۸ میں پاس ہوجاتے ہیں اور چار میں فیل ہوتے ہیں، اور بعض ۴ سے زیادہ علوم میں فیل ہوتے ہیں، جو طلبہ ۸ علوم میں پاس ہوتے ہیں انکو ایک سند دلدہی کے لئے دیدیجاتی ہو جسکا نام شہادہ اہلیہ ہو۔ اور جو طلبہ ۴ سے زیادہ علوم میں فیل ہوتے ہیں وہ دوبارہ امتحان دیتے ہیں تاآنکہ شہادہ عالیۃ الغربا، حاصل کریں یا شہادہ اہلیہ۔

اس سند کی مصر میں کیا قیمت ہو؟

ابتک عام طور سے ہندوستانی بھی شہادہ اہلیہ یا اگر بہت ہی ہمت کی ہو تو عالیۃ الغربا، ازہر سے لائے ہیں اور ہندوستان پہونچتے ہی فاضل ازہر اور ازہری علامہ کا خطاب حاصل کرنیکے تمنی رہے ہیں اور انکی تمنا کچھ بیجا نہیں، ان کو یہ خطاب مل ہی جاتا ہو لیکن اس سند کی قیمت خود مصر میں کیا ہے؟

شہادہ اہلیہ کی قیمت اسکول کی ابتدائی تعلیم کے برابر ہو اور عالیۃ الغربا، کی زیادہ سے زیادہ ثانوی تعلیم کے برابر، اس کا فرق اسطرح بھی واضح ہوگا کہ ازہر کی نظامی تعلیم میں ثانوی کی شہادہ حاصل کرنیکے بعد طالبعلم ازہر کی عالی تعلیم یعنی کسی کلیہ میں داخل ہوسکتا ہے، یہی ثانوی کی شہادہ معیار ہو اعلیٰ تعلیم میں داخلہ کا جسطرح کہ ہندوستان میں انٹرنس پاس طالب علم ایف، اے میں داخل ہوتا ہے، برخلاف عالیۃ الغربا، کی شہادت کے کہ اسکو حاصل کرنیوالا طالبعلم ازہر کے کلیہ میں عام طور سے بلا امتحان داخل نہیں ہوسکتا[1] بلکہ جگہیں اگر کم ہوں (کیونکہ داخلہ ازہر میں اپنے یہاں کے عربی مدارس کی طرح ہر وقت اور بلا تعیین عدد نہیں ہوتا، بلکہ شروع سال میں ازہر کی مجلس منتظمہ کی منظور کردہ تعداد میں صرف ازہر کھلنے کے پہلے دن ہوتا ہے) تو اس طالب علم کو ترجیح دیجاتی ہو جو نظامی تعلیم کی ثانوی کی سند رکھتا ہے۔ اس عالیۃ الغربا، کی سند حاصل کرنیوالے طالب علم پر اس سے آپ اس سند کی قیمت کا اندازہ لگا سکتے ہیں

---

[1] اگرچہ ازہر کے قانون میں ہو کہ "عالیۃ غربا،" جس شخص کے پاس ہو وہ کلیہ میں داخل ہوسکتا ہو، لیکن عملاً طلبہ نظامی تعلیم کی شہادہ ثانویہ والے طلبہ کے بعد جگہ ہونے پر داخل کئے جاتے ہیں۔

جسکے حاصل کرنیوالے طالبعلم ہندوستان پہونچکر علامہ سے کم کے خطاب پر راضی نہیں ہوتے اور اگر کوئی "واقف کار" بسلسلہ تحقیقت واضح کر دے تو ان کے سرپرست و والدین اسکا یقین نہیں کرتے کہ ان کا لڑکا مصر سے "اتنی قیمتی سند لیکر آیا ہے"۔

ایک ہندوستانی طالبعلم جو میرے مصر جانیسے کئی سال پہلے سے وہاں تھے اور شاید کئی سال کی مسلسل کوشش کے باوجود عالمیۃ الغربا بھی حاصل نہ کرسکے بلکہ "اہلیہ" ان کو ملی، انھوں نے پرلطف بات کہی اور صحیح کہی کہ ہندوستان میں یہ کون جانتا ہو کہ یہ شہادہ اہلیۃ ہو یا عالمیۃ الغربا ہو یا شہادہ عالیہ ہو، ہاں تو علامہ بننے کے لئے یہ کافی ہو، ازہر کے شیخ کی دستخط شدہ لمبے کاغذ پر سند موجود ہو اور بس، میں نے کہا ازہر کی اعلیٰ درجہ کی سندیں تو شیخ الازہر کی دستخط سے بھی نہیں ملتیں بلکہ شاہ مصر کی مہر کے بعد ملتی ہیں، کہنے لگے پھر وہی لقاطت، اسکو ہندوستان میں کون جانتا ہو ۱۹۲۹ء میں قسم عام[1] میں ۱۷۳۲ طلبہ میں جنمیں سے ۱۰۱۷ مصری طلبہ ہیں اور ۷۰۵ غربا غیر مصری۔

۲۔ دوسری تعلیم نظامی ہے جو مصری طلبہ پاتے ہیں، اسکو چار مرحلوں پر تقسیم کیا گیا ہو۔

ابتدائی تعلیم ۱۔ ابتدائی جسکی مدت تعلیم ۴ سال ہے، اور اسکے پہلے درجہ میں داخلہ کیلئے یہ شرط ہو کہ

(الف) طالبعلم کی عمر ۱۲ سال سے کم نہو اور ۱۶ سے زیادہ نہو۔

(ب) پورے قرآن کا حافظ ہو اور بوقت داخلہ جانچ کے امتحان میں حفظ قرآن کا امتحان دے۔

(ج) املا، خط، ابتدائی حساب اور عام مطالعہ معلومات کا امتحان دیکر پاس ہو۔

(د) طبی امتحان میں (جو خاصا اہم اور سخت ہوتا ہو) پاس ہو

شروط داخلہ سے آپ جان سکیں گے کہ ابتدائی تعلیم سے مراد پرائمری تعلیم نہیں ہو بلکہ یہ تعلیم زیادتی حفظ قرآن ابتدائی میں داخلہ کے لئے ضروری ہے۔

---

[1] قسم عام میں وہ مصری طلبہ داخل کئے جاتے ہیں جنمیں نظامی تعلیم کے بیان کردہ شرائط نہ پائے جاتے ہوں۔

اس کا نصاب حسب ذیل ہے۔

علوم دینیہ:- الفقہ[1]، السیرۃ النبویہ، التوحید، سیرۃ کبار الصحابہؓ، تجوید القرآن الکریم،

علوم اللغۃ العربیہ:- الانشاء، النحو الصرف، الاملاء، المطالعہ والمحفوظات

علوم اخری۔ التاریخ الجغرافیہ، الریاضہ، تدبیر الصحۃ، الرسم الخط،

یہ کورس ابتدائی تعلیم کے چار سال میں پڑھایا جاتا ہے۔ نصاب میں عموماً بجائے کتب کے مباحث درج کئے جاتے ہیں اور ہدایت کر دی جاتی ہے کہ تعلیم کا معیار فلاں کتاب کے موجب ہوگا۔

مثال کے لئے ایک فن لیجئے، مثلاً فقہ کے وہ مباحث جو سال اول میں پڑھائے جائیں گے انکا معیار متن نور الایضاح کے برابر ہوگا، دوسرے سال میں جو مباحث فقہ کے پڑھائے جائیں گے وہ شرح مراقی الفلاح کے معیار کے موجب ہوں گے تیسرے اور چوتھے سال میں جو مباحث و ابواب پڑھائے جائیں گے ان کا معیار شرح المیدانی علی القدوری کے برابر ہوگا۔ ابواب و مباحث کی تعیین میں جزوی تفصیلات منہج و نصاب میں دیجاتی ہیں۔

کتاب کی عدم تعیین کی بناء پر عموماً استاد خود مقررہ مباحث پر مذکرات تیار کرتا ہے، اسمیں یہ سہولت طلبہ کو ہوتی ہے کہ قدیم کتابیں جنکی زبان وطرز ادا موجودہ ذوق پر پوری نہیں اترتیں۔ نئے استاد کی نئے طرز پر ادا کی ہوئی عبارت میں آسانی سے مسائل کو سمجھ جاتے ہیں اور بلا وجہ فقہ کے مسائل میں "ضمیر کے مرجع" کی تلاش پر وقت ضائع نہیں ہوتا۔

اس ابتدائی تعلیم کو پاس کرنے کے بعد "الشہادۃ الابتدائیہ" دیجاتی ہے اور اسکو حق ہوتا ہے کہ وہ ثانوی کے پہلے درجہ میں داخل ہوسکے۔

---

[1] فقہ کی تعلیم میں چاروں ائمہ کے مذاہب کی تعلیم دیجاتی ہے، ہر طالب علم داخلہ کے وقت اپنے مذہب کی اتباع کا اظہار خطاب کرتا ہے، تعلیم فقہ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، ہر ہر مذہب کا استاد علیحدہ دیتا ہے۔ "ع"

ثانوی تعلیم ۲. ثانوی تعلیم جسکی مدت ۵ سال ہے. اس کے پہلے درجہ میں داخلہ کے لئے شرط یہ ہے:-

(الف) "الشہادۃ الابتدائیہ" ازہر کی ابتدائی تعلیم کی اسکے پاس ہو۔

(ب) یا اسکے مساوی کوئی ایسی سند ہو جسے ازہر کی ابتدائی سند کے برابر تسلیم کر لیا جائے۔

(ج) طبی امتحان میں پاس ہو۔

ثانوی تعلیم کا نصاب حسب ذیل ہے۔

علوم دینیہ: الفقہ، التفسیر، الحدیث

علوم اللغۃ العربیہ:- النحو، الصرف، البلاغۃ (البیان والمعانی والبدیع) الانشاء، ادب اللغۃ، العروض والقافیہ، المطالعہ والمحفوظات

علوم اُخری:- المنطق، ادب البحث، الطبیعۃ، الکیمیا، علم الحیاۃ، التاریخ، الجغرافیہ،

اسکے نصاب میں بھی بجائے کتب کے مباحث منہج میں درج ہیں اور اساتذہ کو ہدایت ہو کہ فلاں مباحث فلاں معیار کے موجب ہوں گے۔ تعلیم ابتدائی کے نصاب میں فقہ کی مثال لیکر واضح کیا تھا کہ تعلیم فقہ کا معیار کیا ہوگا. یہاں بھی یہی فقہ کا معیار بیان کیا جاتا ہے تاکہ فرق واضح ہو سکے. ثانوی کے پہلے سال میں جو مباحث فقہ کے پڑھائے جائیں گے اُن کا معیار شرح الکنز ملا مسکین کے موجب ہوگا. دوسرے سال میں جو مباحث ہیں اسکا معیار بھی یہی ہوگا. تیسرے، چوتھے اور پانچویں سال میں جو مباحث فقہ کے پڑھائے جائیں گے ان کا معیار "کتاب الاختیار شرح المختار" کے مساوی ہوگا۔

ثانوی تعلیم کے پاس کرنیوالے طالب علم کو "الشہادۃ الثانویہ" دیجاتی ہو اور اسکو کلیات (کالج) ازہر میں داخلہ کا حق ہوتا ہے۔

معہد کی اصطلاح اور اس کا اطلاق ازہر کی اصطلاح میں ان ابتدائی اور ثانوی تعلیم گاہوں کا

نام معہد ہو یہ معاہد (جمع ہے معہد کی) مصر کے تمام بڑے اضلاع میں ہیں اور طلبا اور ورثہ دونوں کو اس میں یہ سہولت ہو کر طالب علم اپنے مکان ہی پر رہ کر ازہر کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم حاصل کر لیتے ہیں، عالی تعلیم یعنی کلیات کی تعلیم کے لئے ان کو قاہرہ آنا پڑتا ہے۔

یہ معاہد بعض اضلاع میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے لئے ہیں اور بعض اضلاع میں صرف ابتدائی تعلیم کے ہیں، ثانوی تعلیم کے لئے ان اضلاع کے طلبہ کو قاہرہ کے یا قریب کے کسی ایسے معہد میں جانا پڑتا ہے جہاں ثانوی تعلیم ہے۔

جامع ازہر کا اطلاق جامع ازہر کا اطلاق قانون میں کلیات ازہر اور ان سے متعلقہ تخصصات پر ہوتا ہو، کوئی طالب علم جو ابتدائی یا ثانوی میں پڑھتا ہو اس سے جب آپ دریافت کریں تو وہ جواب دے گا معہد قاہرہ میں پڑھتا ہوں یا معہد اسکندریہ میں، مثلاً "جامع ازہر میں تعلیم پاتا ہوں" یہ جواب وہ نہیں دیسکتا مجازی طور پر اسلئے کہ تعلیم ازہر ہی کی ہو اگر کوئی جامع ازہر کہدے تو دوسری بات ہے۔

لیکن وہ طلبہ جو کلیات میں داخل ہیں اور وہاں تعلیم پاتے ہیں وہ جامع ازہر کے طالب العلم ہونے کا اور طالب العلم یہ کہہ سکتا ہے کہ میں جامع ازہر میں تعلیم پاتا ہوں۔

معاہد کتنے ہیں ازہر کے تابع اسوقت ۹ معہد ہیں ذیل میں ہم ان معاہد کا ذکر کرتے ہیں جہاں ابتدائی اور ثانوی یا صرف ابتدائی تعلیم ہوتی ہے، ہر معہد کے سامنے ۳۹-۱۹۴۰ء کے طلبہ کی تعداد بھی درج ہو

شمار	نام معہد	قسم تعلیم	تعداد طلبہ ابتدائی	تعداد طلبہ ثانوی	تعداد مجموعی ابتدائی وثانوی
۱	معہد القاہرہ	ابتدائی وثانوی	۱۱۹۳	۹۹۳	۲۱۸۶
۲	معہد طنطا	" "	۶۶۱	۸۱۵	۱۴۷۶
۳	معہد الاسکندریہ	" "	۴۵۷	۳۵۱	۸۰۸
۴	معہد الزقازیق	" "	۷۴۹	۷۴۷	۱۴۹۶

شمار	نام معہد	قسم تعلیم	تعداد طلبہ ابتدائی	تعداد طلبہ ثانوی	تعداد مجموعی ابتدائی و ثانوی
۵	معہد فواد الاول باسیوط	ابتدائی و ثانوی	۶۹۲	۳۷۰	۱۰۶۲
۶	معہد شبین الکوم	" "	۳۸۵	۲۷۴	۶۵۹
۷	معہد دمیاط	صرف ابتدائی	۴۲۸	+	۴۲۸
۸	معہد دسوق	"	۲۸۶	+	۲۸۶
۹	معہد قنا	"	۲۶۸	+	۲۶۸
		کل	۵۱۱۹	۳۵۵۰	۸۶۶۹

۸۶۶۹ یہ تعداد سال رواں کی ہے۔ ثانوی تعلیم کے پانچویں سال میں (آخری سال) امسال تمام معہدوں میں مذاکرہ ۶۵۰ لڑکے ہیں، یہ لڑکے ثانوی پاس کرکے کل کے کل قریبًا ازہر کی کلیات میں امسال رہیں گے۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم تمام طلبہ کی ایک ہے لیکن عالی تعلیم میں ہر طالب العلم آزاد ہے کہ اپنے ذوق اور آیندہ زندگی کے لائحۂ عمل کے موجب ازہر کی تینوں کلیات میں سے (جن کا ذکر آگے آتا ہے) کسی ایک کلیہ میں داخل ہو۔

ہر معہد کا نظام چلانے کے لئے شیخ الازہر کی تجویز اور شاہ مصر کی منظوری کے بعد ایک ہیڈ ماسٹر ہوتا ہے جس کو شیخ المعہد کہتے ہیں اور جو اکابر علما سے ہوتا ہے۔

(باقی)

دعوت عمل

مکرمی۔ السلام علیکم

آپ کو معلوم ہے کہ حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی کی خدمات دارالعلوم ندوۃ العلماء کو نصیب ہو گئیں ہیں اور آپ کی نگرانی و سرپرستی کی بدولت دارالعلوم کے ہر شعبہ میں ترقی کے آثار نمایاں ہونے لگے ہیں اگر علامہ موصوف کی توجہ بدستور قائم رہی اور کارکنان کو مفوضہ فرائض کے انجام دینے کے حسب دلخواہ مواقع میسر آئے تو چند ہی دنوں میں دارالعلوم سے ندوۃ العلماء کی تحریک کے حسب منشا ایسے افراد پیدا ہونے لگیں گے جو اپنے علم و عمل اور فہم و فراست کی بدولت ملت اسلامیہ کی صحیح خدمات انجام دے سکیں گے اور اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چل کر دوسروں کے لئے نمونہ عمل اور دلیل راہ ثابت ہوں گے چونکہ یہ جدید و قدیم اور دینی و دنیاوی ہر قسم کے علوم و فنون ضروریات و حالات اور افکار و خیالات سے کماحقہ واقف ہوں گے اور شعبہ ہائے حیات کے تمام نشیب و فراز ان پر روز روشن کی طرح واضح اور ظاہر ہوں گے اس لئے وہ خود صراط مستقیم پر قائم رہ سکیں گے اور دوسروں کو اسکی طرف دعوت دینے اور اس پر قائم رکھنے میں کامیاب ثابت ہوں گے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ طلبائے قدیم انفراداً و اجتماعاً اپنی تمام تر توجہ دارالعلوم کی اصلاح و ترقی کے لئے وقف کردیں اور صرف یہی نہیں بلکہ واقعۃً دامے، درمے، قدمے، سخنے، اسکی خدمت کے لئے آمادہ و تیار ہو جائیں، اگر یہ ہو جائے تو پھر ندوۃ العلماء کی تحریک کی کامیابی اور دارالعلوم کے قیام کے مقصد کا حصول یقینی ہے۔

اس وقت ہمیں سب سے پہلے دارالعلوم کے بجٹ میں توازن قائم کرنا اور دارالعلوم کے انتظامی و تعلیمی شعبہ جات کو بحال کرنا ہے تاکہ کارکنان یکسوئی کے ساتھ کام کرسکیں حساب لگایا گیا ہے کہ اگر دارالعلوم کے قدیم طلبا و صرف سالانہ یا ماہوار بمد امداد دارالعلوم کو عنایت فرمائیں تو دارالعلوم کی مالی حالت استوار

[illegible] کام کرنے والوں کے بہت کچھ ہیں۔ خدا کے فضل سے طلبائے دارالعلوم اکثر و بیشتر برسرکار ہیں اور ان کی [illegible] معقول ہے اگر وہ ہمت کریں تو یہ کوئی دشوار کام نہیں ہے تھوڑی سی تکلیف اٹھانے [illegible] کام [illegible] آسان ہے۔

مجھے امید ہے [illegible] ندوی جن کی غیرت [illegible] گی بلا پس و پیش تجویز مذکور کو جامۂ عمل پہنانے کی کوشش کریں گے۔ گذشت [illegible] دفتر معین [illegible] ندوہ بادشاہ باغ لکھنؤ کے پتہ پر ناظم صاحب کو اپنی جانب سے [illegible] روانہ فرمادیں گے۔ قوموں کی زندگی عمل و احساس فرض سے بنتی ہے [illegible] قومی زندگی کا ثبوت دینا چاہیے۔

یا قومنا اجیبوا داعی اللہ!!

حامد علی ندوی

ناظم مرکزی انجمن طلبائے قدیم

(بقیہ صفحہ ۳)

۲۔ ایک ایسے صاحب کی ضرورت ہے جو ہائی اسکول کے امتحان کے لئے ایک طالب علم کو تیار کر سکتے ہوں، معاوضہ کے لئے ناظم صاحب طلبائے قدیم کے ذریعہ گفتگو کیجا سکتی ہے۔

اس سلسلہ میں ندویوں کو اس جانب توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے صحیح پتے اور موجودہ حالات سے دفتر کو باخبر رکھیں تاکہ ان مواقع پر انھیں اطلاع دیجا سکے۔

اطلاع

جنوری ۱۹۳۸ء (جلد ا نمبر ۱) کے پرچوں کی ضرورت ہے۔ جو صاحب اپنے پرچے فروخت کرنا چاہیں وہ دفتر کو مطلع کریں۔

"منیجر"

حالات ندوہ

جولائی کے آخری عشرہ میں مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ نے اپنی تشریف آوری سے سرفراز فرمایا۔ تقریباً ایک ہفتہ دارالعلوم کے طلبہ اور اساتذہ کو اس خرمن علم سے خوشہ چینی کا موقع ملا فیوض و برکات کا سلسلہ ایکی دارالعلوم ہی تک محدود نہیں رہا بلکہ اسکا اثر باہر تک پہونچا۔ ۲۱ جولائی کو امین آباد میں میلاد النبی کی تقریب تھی، منتظمین کی درخواست پر آپنے ایک مؤثر اور دل آویز تقریر فرمائی جو اپنے معارف و حقائق کی بنا پر عرصہ تک یادگار رہیگی۔ ۲۶ جولائی کو دارالمصنفین اعظم گڈھ کی جانب واپسی ہوئی۔ وسط اگست تک پھر آمد کی توقع ہے۔

سید صاحب قبلہ کے علاوہ اس درمیان اور متعدد بزرگوں نے اپنی پذیرائی کا شرف بخشا۔ ان معزز مہمانوں میں حکیم عبدالعزیز ندوی (پشاور) مولانا سید طلحہ پروفیسر اورنٹیل کالج لاہور اور جناب شیخ عبدالمجید صاحب (بنارس) خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ مولانا طلحہ ندوہ کے خاندان کے ایک فرد ہیں لکھنؤ آتے ہیں تو دارالعلوم کو فراموش نہیں کرتے ہیں بلکہ دو چار دن خاصکر یہاں قیام کرتے ہیں اور طالبین کو علمی استفادہ کا موقع دیتے ہیں، افسوس ہو کہ ابکی آپکی آمد بہت سرسری رہی، اُمید ہو کہ آئندہ اس اتفاقی کوتاہی کی تلافی ہوجائیگی اور مستقل طور پر خرمن عالی سے خوشہ چینی کی اجازت ہوگی۔

شیخ عبدالمجید صاحب آزاد مسلم کانفرنس کی صدارت کی غرض سے لکھنؤ تشریف لائے تھے کانفرنس کی مشغولیتیں کسی اور طرف توجہ میں مانع تھیں لیکن دارالعلوم کی محبت بالآخر سب پر غالب آئی اور کاموں کے ہجوم کے باوجود آپ یہاں تشریف لائے گو صرف چند گھنٹے قیام رہا، لیکن دل ابتک اسکی یاد سے معمور ہیں

اس قلیل مدت میں متعدد علمی مسائل پر گفتگوئیں رہیں، طلبہ کی خواہش تھی کہ شیخ صاحب ایک دن مستقل طور پر دارالعلوم میں قیام کریں۔ لیکن کانفرنس کی مصروفیتوں نے اسکا موقع نہیں دیا۔ اُمید ہو کہ آئندہ کبھی اسکی تلافی ہو جائیگی۔

حکیم عبدالعزیز صاحب ندوہ کے فرزند ہیں انھیں اپنی درسگاہ سے والہانہ محبت ہو، اسی تعلق خاطر کا نتیجہ ہو کہ خاندان کا بچہ بچہ ندوہ ہی میں تعلیم حاصل کرتا ہو۔ ندوہ کی محبت کبھی کبھی آپکو لکھنؤ کھینچ لاتی ہو، جہاں چند دن ندوہ اور ندویوں کی صحبت میں بڑے لطف و مسرت سے گذرتے ہیں۔ ندوہ ندویوں کے لئے مرکز جذب و کشش ہو یہاں پہونچکر زندگی کے بھولے ہوئے خواب پھر یاد آجاتے ہیں۔ فکر و خیال کے مدھم نقوش اُجاگر ہونے لگتے ہیں، ماضی کی تمنائیں مستقبل کا نقشہ بناتی ہیں اور عزم و حوصلہ کی طاقتیں اس نقشہ میں زندگی کا رنگ بھرتی ہیں۔ حکیم صاحب جوش و ولولہ کی دنیائے آدمی ہیں۔ ندوہ اور ندویوں کی اس فضا میں پہونچ کر ہمہ تن عمل بنجاتے ہیں۔ اس مرتبہ ڈیڑھ دو ہفتے قیام رہا جسکا ایک ایک لمحہ ندوہ کی ترقی و سربلندی کی فکر و دو میں بسر ہوا، جند اللہ کے عسکری مظاہروں سے بیحد متأثر ہوئے اور اس غرض کے لئے خاصی رقم عطا فرمائی اللہ، اور معین الندوہ کے کاموں کو آگے بڑھانے کا وعدہ کیا۔ ہمیں اُمید ہو کہ صوبۂ سرحد کے احباب ان کاموں میں موصوف کا ہاتھ بٹائیں گے، اس بارے میں برادران گرامی حکیم عبدالجلیل صاحب ندوی حکیم عبدالرؤف صاحب ندوی، مولوی نورالحق صاحب ندوی اور حکیم عبدالواسع صاحب ندوی سے خاص توقعات ہیں اُمید ہو کہ وہ اپنی روزمرہ کی مصروفیتوں میں ندوہ کو فراموش نہ کریں گے۔

---

۳۱ جولائی اور یکم اگست کو الاصلاح کے انعامی جلسے منعقد ہوئے۔ اس موقع پر چھوٹے اور متوسط طلبا نے "آنحضرتؐ کا دشمنوں سے سلوک" اور "ہندوستان میں اسلام کا مقام" کے عنوان پر تقریریں کیں

(باقی صفحہ ۱۳ پر ملاحظہ فرمایئے)

Regd. No. A-596.

ملکی اور سیاسی کتابوں کا ذخیرہ

نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت
آتش پارے	۸ر	جانباز دوراں	۶ر	چند اہم خطوط	عہ
آزادی	۶ر	بھارت ماتا	۱۲ر	چیمبرلین	۱۲ر
آزادی	۳ر	بھگت سنگھ	۱۲ر	حالات حسرت	عہ
آزادی (ناول)	۴ر	بیداری ہند	۴ر	حکومت خود اختیاری	۵ر
آگہ شہد	۳ر	پیام عمل	۴ر	جماعت خالدؓ	۸ر
ابن سعود	۶ر	پکار (سیاسی ڈرامہ)	۸ر	حقیقت ہنگامہ ہائے پنجاب ۴ر معافی	عہ
احیاء اسلام	۵	تاریخ بغاوت ہند	۶ر	جامعہ صلاح الدین	۴ر
اشتالن	۱۲ر	تاریخ حریت اسلام	سے ر	خالد بن ولیدؓ (ڈرامہ)	عہ
اشتالن کلاں	۱۲ر	ترکان احرار	۶ر	خالدہ خانم	۱۲ر
اسلامی ہند پر ایک نظر	۸ر	ترک معاہدہ	۱۳ر	خطابات کی اصلیت	۱۳ر
اصلاح قوم و ملت	۲ر	ترک موالات	۲ر	خطبات سیاسیہ	۸ر
املائے کلمۃ الحق	۳ر	تذکرہ احیا اسلام	۴ر	خطبۂ صدارت تحریری	۳ر
افغان بادشاہ	۸ر	ترکی میں مغربی و مشرقی کشمکش	۸ر	خطبۂ صدارت تقریری	ار
امتحان کامل	عہ	تعمیر زر	۴ر	خطبۂ صدارت مولانا محمد علی	۴ر
انسانی قربانیاں	۸ر	تقاریر گوکھلے	۱۲ر	خطبۂ صدارت مولانا محمود الحسن	۲ر
انسداد جرائم کاری	ار	تقاریر محمد علی ۲ جلد	عہ	خلافت اور مقاطعہ	۲ر
انسداد گداگری	ار	تلاش حق ۲ جلد	سعہ روعکر	خلافت اور ہندوستان	عہ
انقلاب افغانستان	۶ر	تلک مہاراج	ار	خواتین انگورہ قسم اول	عہ
انقلاب دہلی	۶ر	تاریخ کانگریس	۶ر	خوشحال ہندوستان	عہ
انقلاب ششہ	عہ	ٹالسٹائی	۲ر	خون کے آنسو حصہ (۱)	۲ر
انقلاب فرانس (از جلد ارناق)	۴ر	ٹالسٹائی کی کہانی	۸ر	خون ناحق	۸ر
انقلاب فرانس (از عبدالقادر)	۱۲ر	جاپان	۸ر	خیر الدین پاشا	عہ
انقلاب روس (از انیس احمد)	۱۰ر	جاں باز ترک	۸ر	دختران شمشیر	عہ
انقلاب روس	عہ	جذبات احرار	۴ر	دختر سمرنا	۸ر
انقلاب فرانس (از باری)	۱۲ر	جذبات جوہر	۱۲ر	داستان زوال	۸ر
انقلاب میں کسانوں کا ہاتھ	۸ر	جذبات حریت	۸ر	داستان غدر	۸ر
انقلابی افسانے	عہ	جلا وطنی کی داستان	۱۳ر	درس عمل	۵ر
انگورہ اور ترک	۱۲ر	جمال الدین افغانی	۸ر	دعوت حق	۲ر
آہنگ رزم	۸ر	جمال الدین افغانی (از ظفر علی خاں)	۴ر	دنیا میں دوزخ	۵ر
آئینۂ جمہوریت	۴ر	جنگ آزادی	۶ر	دو خدائی خدمت گار	۱۲ر
آزادی کی جنگ (دیگ کے نامہ نگار سے)	۶ر	جنگ صلیب و ہلال	۸ر	دولت عزنویہ	۸ر
افسانۂ ترکستان	عہ	جنگ طرابلس	۱۳ر	دیگر ممالک میں قطع تعلق	۱۰ر
بالشویک شہزادی	۴ر	جنگ نامہ اسلام	عہ	رپورٹ کانگریس احمد آباد	۵ر
بالشوی شہزادی	۴ر	جواب شکوہ	۴ر	روایات اسلام	۱۴ر
بالشویک جنرل	۸ر	جواہرات دستور آل انڈیا کانگریس لکھنؤ	۸ر	روح سیاست	۸ر
برطانیہ اور افغانستان کے تعلقات	۹ر	جواہر ریزہ	۳ر	روز ولٹ	۱۲ر
برہمن دیوتا	۸ر	چمن مخزاں	۴ر	روسی افسانے	عہ

ملنے کا پتہ

صدیق بک ڈپو۔ لکھنؤ —— یا —— اسکول بک ایجنسی نظیر آباد لکھنؤ

مجلس ندوۃ العلماء کا ماہوار رسالہ

الندوہ

جس کا مقصد
مسلمانوں کی تعلیمی اور تعمیری خدمت ہے

مرتبہ
سید ابوالحسن علی ندوی
استاذ تفسیر و ادب
عبدالسلام قدوائی ندوی
استاذ تاریخ و اقتصادیات

الندوہ

زیر نگرانی

علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ

جلد ۱ شعبان المعظم ۱۳۵۹ھ مطابق ستمبر ۱۹۴۰ء نمبر ۹

قیمت فی پرچہ تین آنے سالانہ دو روپے

تمام خط وکتابت اور ترسیل زر حامد علی ندوی منیجر رسالہ الندوہ، بادشاہ باغ لکھنؤ کے پتہ پر ہونی چاہئے

شذرات

ہندوستان میں تعلیم کی جو غلط بنیادیں قائم ہوگئی تھیں انکی کج نہادی اب روز بروز آشکارا ہوتی جارہی ہے حکومت نے وقتی مصالح کے مطابق تعلیم کے جو نقشے بنائے تھے پچھلے پچاس برس کے تجربات نے اب انکی غلطی نمایاں کردی ہے، درد مند شاعر کو تو صرف اسی کا ماتم تھا کہ ؎

ہم سمجھتے تھے کہ لائیگی فراغت تعلیم — کیا خبر تھی کہ چلا آئیگا الحاد بھی ساتھ

لیکن اسے کیا خبر تھی کہ کچھ دنوں میں یہ فراغت بھی مفقود ہوجائیگی اور دین کے ساتھ دنیا کے دروازے بھی بند ہوجائیں گے۔

تعلیم جدید کی اس ناکامی نے اضطراب و بےچینی کی ایک لہر پیدا کردی ہے اب اس نئے نظام سے بیزاری عام ہوتی جارہی ہے اور ہر جگہ ضرورت محسوس ہورہی ہے کہ تازہ حالات و ضروریات کے مطابق تعلیم کا ایک نیا نقشہ مرتب ہو جس میں ملک کے معاشی، سیاسی اور تمدنی رجحانات کا لحاظ رکھا گیا ہو، پچھلے پچیس برس کی طوفانی سیاست اور اس سے زیادہ معاشی دباؤ نے اس احساس کو ترقی دی بالآخر حکومت کو بھی اس جانب توجہ ہوئی تعلیمی مسائل پر غور و خوض کیلئے کمیٹیاں قائم ہوئیں اور نصاب و نظام تعلیم کے نئے نئے نقشے بننے لگے ضرورت ہے کہ اسوقت احتیاط کے ساتھ قدم اٹھایا جائے نئے تعلیمی نظام میں صرف معاشی ضرورتوں ہی کا خیال نہ رکھا جائے بلکہ اسمیں زندگی کی حقیقی قدروں کو ملحوظ رکھا جائے تاکہ نئے تعلیمی نتائج انسانیت کے صحیح معیار پر پورے اتر سکیں اور زندگی کے تمام شعبوں میں مناسبت و ہم آہنگی پیدا ہوسکے

ندوہ کے حلقہ میں نواب غلام احمد صاحب کلامی رئیس بنگلور کی شخصیت محتاج تعارف نہیں نواب صاحب

موصوف مجلس ندوۃ العلماء کے دیرینہ رکن ہیں آپ کو ندوہ سے بیحد محبت اور اس کے کاموں سے غیر معمولی دلچسپی ہے ۱۹۱۱ء میں مدراس میں ندوہ کا جلسہ ہوا تو نواب صاحب اسکے لئے ہمہ تن عمل تھے اس موقع پر آپکی مؤثر اور ہمدردانہ تقریر آجتک شرکاء بزم کو یاد ہے اسی تعلق خاطر کا نتیجہ ہے کہ الندوہ شائع ہوا تو آپکو خاص مسرت ہوئی، نامۂ کرمت نامہ میں رسالہ کے متعلق جن خیالات عالیہ کا اظہار فرمایا ہے وہ کارکنوں کے لئے بہت حوصلہ افزا ہیں۔ رسالہ کی اشاعت کی جانب خصوصیت سے آپکی توجہ ہے چنانچہ اس سلسلہ میں ایک معتد بہ رقم بھی ارسال فرمائی ہے ان عنایتوں پر ہم سراپا تشکر و امتنان ہیں، امید ہے کہ توجہات کا سلسلہ آئندہ بھی اسیطرح جاری رہیگا

ذہن و دماغ کی صحیح تربیت اور فکر و خیال کی حقیقی اصلاح کے لئے مطالعہ ناگزیر ہے لیکن اسکے لئے کتابوں کے صحیح انتخاب و ترتیب کی ضرورت ہے ورنہ ذہنی کجی دماغی پریشانی اور عقلی بے راہی کا سخت اندیشہ ہے۔ عرصہ سے خیال تھا کہ اس بارے میں مشاہیر علم و ادب کے تجربوں سے فائدہ اُٹھایا جائے تاکہ اسکی روشنی میں نوجوان صحیح قدم اُٹھا سکیں اس سلسلہ میں الندوہ نے متعدد بزرگوں کو اظہار خیال کی دعوت دی تھی، ہمیں مسرت ہے کہ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے ہماری درخواست کو قبول فرمایا دوسرے اکابر سے خط و کتابت جاری ہے، آیندہ ماہ سے انشاء اللہ یہ مضامین شائع ہونے شروع ہوں گے اُمید ہے کہ قارئین الندوہ کے حلقہ میں یہ سلسلہ دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

ان مضامین میں مضمون نگار حضرات اپنے ذاتی تأثرات بیان کرینگے اور یہ دکھائیں گے کہ کن کتابوں نے انکے دل و دماغ پر خاص اثر ڈالا اور دیرپا نقوش چھوڑے۔ ہمیں اُمید ہے کہ ان جوابات میں مطالعہ اور استفادہ کے متعلق ضروری ہدایات اور ذاتی تجربات بھی ہوں گے۔

جامعہ ازہر

از مولانا حافظ محمد عمران خان صاحب ندوی متخصص جامعہ ازہر

(۴)

عالی تعلیم ۳۔ عالی تعلیم کی مدت ۴ سال ہے اور ان تعلیم گاہوں پر کلیہ کا اطلاق ہوتا ہے عالی تعلیم کے علوم کی تقسیم کے اعتبار سے تین کلیے ہیں:-

۱۔ کلیۃ اللغۃ العربیۃ

۲۔ کلیۃ الشریعۃ

۳۔ کلیۃ اصول الدین

تعلیم تخصص (ریسرچ)

۴۔ تعلیم کا آخری مرحلہ تخصص (ریسرچ یا ڈاکٹریٹ) کی تعلیم ہے جس کا نمبر کلیات کی ۴ سال کی تعلیم ختم کرنے کے بعد شروع ہوتا ہے تخصص کی تعلیم چونکہ کلیہ کی تعلیم کے بعد ہوتی ہے اسلئے ہر کلیہ سے متعلق تخصص کے بعض شعبے ہیں اور ہر کلیہ کی تعلیم کی مناسبت سے اس کے تخصص کے درجے ہیں۔

درجۂ تخصص میں دو قسم کی تعلیم ہے۔ ایک کی تعلیم ۲ سال ہے اور ایک کی تعلیم ۵ سال ہے۔

ذیل میں ہم ہر کلیہ کا نصاب اور اس سے متعلق تخصص کا نصاب و مدت تعلیم درج کرتے ہیں

(۱) کلیۃ اللغۃ العربیۃ

کلیۃ اللغۃ العربیہ کا نصاب حسب ذیل ہے۔

النحو، الصرف، الوضع، فقہ اللغۃ، الاصول، الانشاء، علوم البلاغۃ، الآداب العربیہ و تاریخہا، العروض والقافیہ، التفسیر، الحدیث، المنطق، الفلسفہ، المطالعہ۔

یہ نصاب کلیہ کے چار سال میں پڑھایا جاتا ہو، ہر سال کا نصاب اور اسکے مباحث منہج میں درج ہیں، اسمیں بھی علی العموم کتابیں نہیں ہیں، بلکہ اساتذہ مذکرات تیار کرتے ہیں۔ البتہ بعض بعض اسباق میں کتابوں کا ذکر ہو، مثلاً نحو کے پہلے، دوسرے اور تیسرے سال کے مقررہ مباحث کے متعلق ہدایت ہے کہ یہ مباحث الفیہ ابن مالک اور اسکی شرح اشمونی میں پڑھائے جائیں۔ چوتھے سال کے مباحث کے متعلق ہدایت ہو کہ ابن ہشام کی مغنی اللبیب میں پڑھائے جائیں۔ کلیہ کا نصاب ختم کرنیکے بعد شہادۃ العالیہ فی اللغۃ العربیہ دیجاتی ہے۔

تخصصات کلیۃ اللغۃ　کلیۃ اللغۃ العربیہ سے حسب ذیل درجے تخصص کے متعلق ہیں اور ذیل کے تخصصات میں داخلہ کے لئے بجز تخصص تدریس کے شرط ہو کہ کلیہ لغۃ سے شہادہ عالیہ حاصل کی ہو۔

(الف) تخصص فی التدریس، اسکی مدت تعلیم ۲ سال ہے اور اس کا نصاب حسب ذیل ہو

علم النفس العام، علم النفس التعلیمی، اصول التربیۃ والطرق العامہ والتنظیم المدرسی تاریخ التربیۃ التربیۃ العملیہ، طرق التدریس الخاصہ، الاخلاق، تدبیر الصحۃ المدرسی، الرسم، تجوید الخط، التربیۃ البدنیۃ لغۃ اجنبیہ[1]

تخصص تدریس میں طریقۂ تعلیم　اس تخصص میں تعلیم کا تمامتر مدار استاذ کے لکچروں اور طلبہ کی ذاتی محنت وکاوش اور مطالعہ پر موقوف ہو، اس درجہ کو پاس کرنیکے بعد "شہادۃ العالمیۃ مع اجازۃ التدریس" دیجاتی ہے۔

اس تخصص تدریس میں ہر کلیہ کی شہادہ عالیہ داخلہ کے لئے کام دیسکتی ہے۔

(ب) تخصص فی النحو، اسکی مدت تعلیم پانچ سال[2] تک ہے۔ اسمیں داخلہ کے لئے ضروری ہو کہ طالب علم نے شہادہ العالیۃ کلیۃ اللغۃ العربیہ سے لی ہو۔

---

[1] لغۃ اجنبیہ میں انگریزی اور فرنچ زبان پڑھائی جاتی ہو، ایک سال انگریزی کی ابتدا ہوتی ہو اور ایک سال فرنچ زبان کی۔
[2] قانون ۱۹۳۱ء میں ۶ سال سے ۷ سال تک اسکی مدت ہو بعد کو مجلس اعلیٰ نے اسمیں ترمیم کرکے ایکسال کم کر دیا ہو۔　"ش"

اس کا نصاب حسب ذیل ہے۔

النحو، الصرف، الانشاء، فقہ اللغہ، العروض والقافیہ، مبادی اللغتین العربیۃ والسریانیۃ

طریقۂ تعلیم۔ طریقۂ تعلیم اس تخصص میں یہ ہے کہ خود طالب علم فنون متعلقہ کی تمام کتابوں پر عبور حاصل کرے۔ متعدمین کی متعلق کتابوں کے سمجھنے کا اسمیں ملکہ پیدا ہو۔ استاذ ہفتہ میں دو بار موضوع پر لکچر دیگا۔ فن کی بعض متعلق کتابیں استاذ سے پڑھی جائیں گی۔ طالب علم کو جدل ومناقشہ کی پوری آزادی ہوگی۔

(ب) تخصص فی البلاغۃ اسکی مدت تعلیم بھی کم سے کم ۵ سال ہے اسمیں داخلہ کے لئے بھی شرط ہے کہ طالب علم نے کلیۃ اللغۃ سے شہادۃ عالیہ حاصل کی ہو، اسکا نصاب حسب ذیل ہے۔

علوم البلاغۃ، الادب العربی وتاریخہ، العروض والقافیہ، مبادی اللغتین العربیۃ والسریانیۃ

طریقۂ تعلیم اس تخصص میں بھی وہی ہے جو تخصص فی النحو میں بیان کیا گیا۔

ان تخصصات کو پاس کرنیکے "شہادۃ العالمیۃ من درجۃ استاذ فی النحو اور فی البلاغۃ" ان تخصصات میں تخصص کیا ہو دیجاتی ہے۔

(۲) کلیۃ اصول الدین

کلیۃ اصول الدین کا نصاب حسب ذیل ہے۔

التوحید، التفسیر، الحدیث متنا ورجالا، مصطلح المنطق وادب البحث، الاخلاق، الفلسفہ، الاصول، التاریخ الاسلامی، علم النفس، لغۃ اجنبیۃ

یہ نصاب کلیہ کے چار سال میں پڑھایا جاتا ہے، اسکے منہج اور نصاب میں بعض علوم میں خود استاذ مذکرہ موجب مباحث مقررہ تیار کرتا ہے اور بعض مباحث میں کتب پڑھائی جاتی ہیں مثلاً توحید میں مواقف اور منطق میں بصائر نصیریہ پڑھائی جاتی ہے۔ علوم الحدیث میں امام ابن کثیر کی اباحث حثیث

الی معرفۃ علوم الحدیث" یا حدیث میں "تیسیر الوصول الی جامع الاصول من حدیث الرسول" للعلامۃ المحدث عبد الرحمن بن علی الشیبانی پڑھائی جاتی ہے۔

کلیہ کا نصاب ختم کرنیکے بعد "شہادۃ العالیہ فی اصول الدین" دیجاتی ہے۔

تخصصات　کلیہ اصول الدین سے متعلق حسب ذیل تخصصات ہیں۔

(الف) تخصص فی الدعوۃ والارشاد: اسکی مدت تعلیم ۲ سال ہے، اس تخصص میں داخلہ کے لئے شرط ہے کہ "شہادۃ العالیہ فی کلیۃ اصول الدین" طالب علم نے لی ہو، اس کا نصاب حسب ذیل ہے۔

: القرآن الکریم وعلومہ، الحدیث الشریف وعلومہ، الدعوۃ الی سبیل اللہ ووسائلہا، الخطابۃ والمناظرہ، الملل والنحل والمذاہب الفقہیۃ وتواریخہا، البدع والدراسات اللغۃ الاجنبیۃ[1]، لغۃ شرقیہ،

طریقۃ التعلیم　اس تخصص تعلیم کا مدار تمام تر طالب علم کے ذاتی مطالعہ کتب اور محنت وکاوش پر ہے، استاذ معینہ مباحث پر لکچر دیتا ہے اور طلبہ ان کے اصل مراجع وماخذ کو پڑھتے اور سمجھتے ہیں، اس درجہ کو پاس کرنیکے بعد "شہادۃ العالیۃ مع الاجازۃ فی الدعوۃ والارشاد" دیجاتی ہے۔

(ب) تخصص فی التوحید والفلسفۃ: اسکی مدت تعلیم ۵ سال سے ۶ سال تک ہے، اسمیں بھی داخلہ کے لئے ضروری ہے کہ طالب علم نے شہادۃ العالیہ فی اصول الدین حاصل کی ہو، اسکا نصاب حسب ذیل ہے۔

التوحید، المنطق، الفلسفہ، الاخلاق،

(ج) تخصص فی علوم القرآن الکریم والحدیث الشریف، اسکی مدت بھی ۵ سال سے ۶ سال تک ہے اور اسمیں داخلہ کی شروط بھی وہی ہیں جو تخصص سابق میں تھے۔

نصاب حسب ذیل ہے۔

التفسیر، علوم القرآن، الحدیث وعلومہ،

---

[1] انگریزی یا فرنچ جس کی یاد ہو

(د) تخصص فی التاریخ الاسلامی ، اسکی مدت تعلیم بھی ۵ سال سے ۳ سال تک ہو اور شرط داخلہ بھی وہی ہو جو اوپر گذر رہی اسکے نصاب میں تاریخ اسلامی تمام ادوار اور دوسرے علوم جو تاریخ کے سلسلہ میں ضروری ہیں پڑھائے جاتے ہیں۔

طریقہ التعلیم وہی ہو جو کلیۃ اللغۃ العربیہ کے تخصص فی النحو میں بیان ہوا۔

ان تینوں تخصصات کو پاس کرنے کے بعد شہادۃ العالمیۃ من درجہ استاذ " فی التوحید والفلسفہ یا فی علوم القرآن الکریم والحدیث الشریف' یا فی التاریخ الاسلامی یعنی جس مضمون میں تخصص کیا ہو دیجاتی ہے۔

۲۔ کلیۃ الشریعۃ

کلیۃ الشریعۃ کا نصاب حسب ذیل ہے۔

التفسیر، الحدیث متنا ورجالا ومصطلحا، اصول الفقہ، الفقہ مع حکمۃ التشریع ومقارنۃ المذاہب فی المسائل الکلیہ، تاریخ التشریع الاسلامی، المنطق، الفلسفہ، لغۃ اجنبیہ (الانکلیزیۃ والفرنسیہ) وتدرس بصفۃ اختیاریہ۔

یہ نصاب بھی کلیہ کے چار سال میں پڑھایا جاتا ہے، اس کلیہ کے منہج میں بھی بعض علوم میں اساتذہ مذکرات تیار کرتے ہیں اور انہیں ہدایت ہوتی ہو کہ تعلیم کا معیار فلاں کتاب ہوگی، مثلاً فقہ کہ اس کے متعلق ہدایت ہو کہ اسکا معیار ہدایہ کے سا دی ہوگا بعض کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، مثلاً اصول فقہ کے نصاب کے متعلق درج ہو کہ پہلے سال کے مباحث کتاب "افاضۃ الانوار شرح اصول المنار" میں پڑھائے جائیں دوسرے تیسرے اور چوتھے سال کے نصاب کو کتاب "مشکوۃ الانوار فی اصول المنار لابن نجیم" میں پڑھایا جائے، اس درجہ کو پاس کرنے کے بعد "شہادۃ العالیہ فی الشریعۃ" دیجاتی ہے۔

تخصصات کلیۂ شریعہ سے متعلق حسب ذیل تخصصات ہیں۔

(الف) تخصص القضاء الشرعی، اسکی مدت ۲ سال ہو اور داخلہ کے لئے یہ شرط ہو کہ شہادہ العالیہ فی الشریعہ طالب علم نے حاصل کی ہو اسکا نصاب حسب ذیل ہے۔

قوانین ولوائح المحاکم الشرعیۃ والاوقات والمجالس الحسبیہ ومجلس البلاط، التوثیقات الشرعیہ اجراءات وتمرینات قضائیہ ودراسۃ القضایا ذات المبادی، الہیئۃ الشرعیۃ، القانون الدولی الخاص تاریخ القضاء والقضاۃ فی الاسلام، النظام الدستوری للدولۃ، محاضرات فی مبادی الاقتصاد، محاضرات طبیہ، محاضرات فلکیہ، لغۃ اجنبیہ اختیاریہ وہی التی درست فی الکلیہ،

طریقۃ التعلیم اس درجہ میں وہی ہو جو اس کے پہلے ۲ سالہ تخصصات کے درجوں میں بیان ہوا اس درجہ کو پاس کرنے کے بعد "شہادہ العالمیۃ مع اجازۃ القضاء الشرعی" دیجاتی ہے۔

(ب) تخصص فی الفقہ والاصول، اسکی مدت تعلیم وہی ۵ سال ہے، سال بکسے ہی اسمیں داخلہ کیلئے بھی شرط ہے کہ "شہادۃ العالیہ فی الشریعۃ" لی ہو، اس کا نصاب حسب ذیل ہے۔

الاصول، الفقہ مع حکمۃ التشریع ومقارنۃ المذاہب، تاریخ التشریع الاسلامی،

طریقۃ التعلیم اس تخصص میں بھی وہی ہو جو اس سے پہلے پانچ سالہ تخصص میں بیان کیا گیا ہے۔ اس درجہ کو پاس کرنے کے بعد "شہادۃ العالمیۃ من درجۃ استاذ فی الفقہ والاصول" دیجاتی ہے۔

یہ دونوں عالمیہ کی سندات خواہ مع الاجازۃ ہو خواہ من درجۃ استاذ ہوں ازہر کی اعلیٰ ترین ڈگریاں ہیں، ازہر کے قانون دفعہ ۱۱۲ میں ہے، العالم من بیدہ شہادۃ العالمیۃ، دفعہ ۱۱۵ میں ہے تمنح شہادات العالمیۃ مع الاجازۃ وشہادات العالمیۃ من درجۃ استاذ براءۃ ملکیہ وتعتبر من الشہادات العلیا من حیث الحقوق التی تخولہا لحاملیہا۔

سند کس کے دستخط سے دیجاتی ہے

شہادۃ ابتدائی، شہادہ ثانوی اور شہادہ عالی شیخ الازہر کے دستخط سے دیجاتی ہو، ازہر کے

قانون دفعہ ۱۱ میں ہے

یمنح شیخ الجامع الازہر شہادات الدراسات الابتدائیہ والثانویہ والعالیہ[1]

تخصصات کی سندیں، خواہ ۲ سال کا ہو یا ۵ سال کا، یعنی شہادۃ العالمیۃ شاہی مصر کی مُہر کے ساتھ دیجاتی ہو اور اسمیں شیخ الازہر کے دستخط نہیں ہوتے، جیسا کہ دفعہ ۱۱۵ میں جسکا تذکرہ ابھی اوپر ہوا، الندوہ لکھتا ہے۔

کلیات کا نظام اداری

ہر کلیہ کا نصاب اور اسکی مدت تعلیم کا تذکرہ اوپر ہوا، ذیل میں ہم مختصر طور پر اداری (دفتری) نظام کو بیان کریں گے۔

ہر کلیہ کا ایک پرنسپل ہوتا ہے جسکو قانون کی اصطلاح میں شیخ الکلیہ کہتے ہیں[2]۔ یہ عموماً ہیئۃ کبار علماء کا ممبر ہوتا ہے اور شاہی فرمان سے اسکا تقرر ہوتا ہے، اسکے ماتحت ایک مجلس ہوتی ہے جس کو مجلس کلیہ کہتے ہیں۔ یہ مجلس کلیہ کے دو بڑے استادوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ ۲ آدمی غیر استاذ یعنی ازہر کے باہر کے بھی ہوتے ہیں جنکو تعلیمی امور سے دلچسپی ہو، شیخ کلیہ اس کا صدر ہوتا ہے اور اس کا کام اہم امور میں شیخ کا ہاتھ بٹانا ہوتا ہے یا جس کام کو شیخ کمیٹی کے سپرد کردے۔

کلیہ کا بجٹ بنانا بھی اس کمیٹی کے ہاتھ میں ہے، یہ کمیٹی بجٹ بنا کر شیخ الازہر کے پاس بھیجتی ہے اور وہ اسکو مجلس اعلیٰ میں پیش کرتا ہے، نصاب کی ترمیم، حذف و اضافہ، کتب درسیہ کا تقرر، اور سال میں داخل ہونیوالے طلبہ کی تعداد کا تقرر بھی ابتدائی طور پر کمیٹی کرتی ہے اور مجلس اعلیٰ کی منظوری لیتی ہے۔

---

[1] شہادۃ العالمیہ اور عالیہ غرباء بھی شیخ الازہر کے دستخط سے دیجاتی ہے۔ ازہر کا غرباء کا ضمنی قانون علیحدہ ہے اسلئے ازہر کے اصلی قانون میں نہ اسکی تعلیم وغیرہ کا تذکرہ ہے نہ اسکی شہادتوں کا۔

[2] ازہر کی اصطلاح میں پرنسپل کو شیخ الکلیہ کہتے ہیں ورنہ جامعہ مصریہ اور دوسرے تعلیمی اداروں میں پرنسپل کے لئے "عمید" کا لفظ مستعمل ہے، ہندوستان میں لفظ "ناظر" جو پرنسپل کے معنی میں مستعمل ہے غلط ہے، ناظر کا لفظ اصطلاحاً اسکول کے ہیڈ ماسٹر کے لئے ہے

کلیات میں طلبہ کی تعداد

۳۹-۱۹۳۸ء میں ازہر کی کلیات میں تفصیل ذیل طلبہ تھے۔

نام کلیہ	طلبہ کلیہ	طلبہ تخصص ۲ سالہ یعنی اجازات	تخصص پنج سالہ یعنی ...	تخصصات بہ ازہر کے نظام پر	جملہ
کلیہ اللغۃ العربیہ	۲۸۷	۱۹۰	۳۰	۱۱	۵۳۳
کلیہ الشریعہ	۹۰۳	۷۲	۶۹	۳۵	۱۰۸۰
کلیہ اصول الدین	۶۹۱	۸۶	۵۵	۷۰	۹۰۳
میزان	۱۸۸۲	۳۵۶	۱۶۲	۱۱۶	۲۵۱۶

۲۵۱۶ یہ تعداد ہوا اسوقت ازہر کی کلیات زیر موجود طلبہ کی۔ ہم ذیل میں ازہر کے پڑھنے والے ۴۰-۱۹۳۹ء کے کل طلبہ کی تعداد بتقسیم تعلیم درج کرتے ہیں جس سے اندازہ ہو سکیگا کہ مسلمانوں کی سب سے قدیم دینی و مذہبی تعلیم کی قابل فخر یونیورسٹی میں پڑھنے والوں کی اسوقت کیا تعداد ہے۔

قسم ابتدائی	۵۱۱۹
قسم ثانوی	۳۵۵۰
قسم کلیہ لغۃ	۵۳۳
کلیہ شریعہ	۱۰۸۰
کلیہ اصول الدین	۹۰۳
قسم عام (غیر نظامی)	۱۷۳۲
	۱۲۹۱۰

کل ازہر میں پڑھنے والے طلبا اسوقت ۱۲۹۱۰ ہیں۔ اس تعداد میں سے اگر ۷۰۰ طالبعلم نکالدیے جائیں جو غیر مصری ازہر میں پڑھتے ہیں تو بھی کل مصری طلبہ کی تعداد ۱۲۲۱۲ رہتی ہے۔

جو مصر کی آبادی دیکھتے ہوئے بہت غیر معمولی ہے، مصر کی کل آبادی ۱۶ ملین ہے یعنی ایک کروڑ ساٹھ لاکھ
یعنی ہندوستان کے چھوٹے صوبہ پنجاب کی آبادی سے بھی کم درانحالیکہ مصر دینی اور مذہبی حمیت کے
اعتبار سے ہندوستان کا مقابلہ نہیں کرسکتا، مصر کی اس آبادی میں سے ایک ملین یعنی دس لاکھ قبطی اور
قریباً نصف ملین پچاس ہزار دوسری غیر مسلم آبادی کو اور نکال دیجئے تو مسلمانوں کی خالص تعداد
ایک کروڑ ۴۵ لاکھ رہجاتی ہے۔

اسکے برخلاف آپ ہندوستان کو ملاحظہ کیجئے جہاں کہا جاتا ہے، اور سچ کہا جاتا ہے کہ دینی
حمیت مذہبی جوش اور اسلامیت زیادہ باقی ہے، میرا اندازہ تو یہ ہے کہ ہندوستان سے ایسے برا عظم میں جہاں
مسلمانوں کی تعداد ۹ ملین ۹۱ کروڑ کے قریب ہے، عربی دینی تعلیم پانیوالوں کی تعداد مشکل ہی سے اس
تعداد کے کچھ برابر نکلے۔ یہ اندازہ بھی کچھ حسن ظن ہی کی بنا پر کیا گیا ہے۔

۱۹۲۲ء میں ازہر میں طلبہ کی جو تعداد تھی اسکو اگر سامنے رکھکر اسوقت کی موجودہ تعداد کو دیکھا
جائے تو مزید حیرت ہوتی ہے، جدید تہذیب و تمدن اور روشن خیالی کے باوجود دینی تعلیم پانیوالے طلبہ میں
یہ اضافہ میرے لئے تو حیرت انگیز ہی ہے۔

۱۹۳۲ء میں قسم دارالتعلیم میں طلبہ حسب ذیل تھے

قسم ابتدائی	۴۵۴۴
قسم ثانوی	۴۱۵۹
قسم عالی[1]	۶۵۲
کلیہ الشریعہ	۲۸۵

[1] کلیات کے افتتاح سے قبل جو تعلیم تھی وہ بھی عالی تعلیم کہی جاتی تھی، کلیات کے افتتاح کے بعد بھی جبتک طلبہ اس قسم سے
فارغ ہوکر نکل نہ گئے وہ تعلیم جاری رہی۔

ایک ضروری تصحیح

از پروفیسر محمد بدر الدین علوی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

الندوہ ماہ اگست ۱۹۴۶ء (صفحہ ۱) میں مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی تقویم البلدان اور مراصد الاطلاع کے ترجموں کی نسبت تحریر فرماتے ہیں:-

"اپریل ۱۸۶۴ء میں گورنمنٹ کا یہ اشتہار شائع ہوا کہ مفید عام کتابوں کے ترجمے پر اہل علم کو حسب پسند حکومت معقول انعام عطا ہوگا۔ مفتی عنایت احمد صاحب و مولانا مظہر کریم دونوں نے اس اعلان سے فائدہ اٹھا کر عربی جغرافیہ کی ایک ایک مشہور کتاب اردو ترجمے کے لئے انتخاب کر لی۔ مفتی صاحب نے تقویم البلدان کو لیا اور مولانا نے مراصد الاطلاع کو اور جب انعام کا وقت آیا تو بجائے کسی نقد رقم کے رڑکی کو پیش کیا۔"

مجھکو تقویم البلدان کے متعلق یہ عرض کرنا ہے کہ استاذ الاساتذہ حضرت مفتی عنایت احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کتاب کو مذکورہ بالا اعلان کی بنا پر ترجمہ کیلئے انتخاب نہیں فرمایا تھا اسلئے کہ ۱۸۶۹ء میں سنین ہجری ۱۲۸۵ھ اور ۱۲۸۶ھ تھے حضرت مفتی صاحب تو ۱۲۷۴ھ میں انڈمان بھیجے گئے اور چار سال بعد ۱۲۷۸ھ میں ہندوستان واپس تشریف لے آئے اور ۱۲۷۹ھ میں شہید ہوئے۔ (تائید کیلئے ملاحظہ ہو رسالہ استاذ العلماء مطبوعہ معارف پریس صفحہ ۶ و ۷) تو تاریخ مذکورہ بالا اس بات کی گواہ ہیں کہ صرف تقویم البلدان کا ترجمہ گورنمنٹ کے اس اعلان سے برسوں قبل ہو چکا تھا بلکہ اس سے کئی سال پیشتر حضرت شہید بھی ہو چکے تھے جیسا کہ رسالہ استاذ العلماء میں (صفحہ ۳) لکھا ہے ایک انگریز کی خواہش ترجمہ کا باعث ہوئی۔ کتاب کا انتخاب بھی اسی نے کیا تھا نہ کہ حضرت مفتی صاحب نے۔

کلیہ اصول الدین	۱۵۲
کلیہ اللغہ	۹۲
تخصصات	۲۳۲
قسم عام (غیر نظامی)	۱:۱۳
	۹۲۰۲

یعنی ۱۹۴۳ء کی تعداد اور ۱۹۴۶ء کی تعداد میں ۲۰۱۵ طلبہ کا فرق ہے جو عام مسلمانوں کی دینی تعلیم کی طرف سے بددلی اور عدم توجہی کو دیکھتے ہوئے کچھ کم نہیں ہے۔

اخلاق کا حصہ قومی تعمیر میں

از شاہ مرادی عطا صاحب سلونی

آنحضرت کی اسلامی پکار ایک بجلی کا کڑاکا تھی یا ایک صوت ہادی تھی جس نے عرب کی ساری زمین ہلا دی اور سارے عرب میں اصلاح کا شور مچ گیا ایک زندگی گراں ہونے لگی اور بہت دن کے سوتے ہوئے جاگے اور ان کی آنکھیں ایک نئی دنیا دیکھنے لگی۔

قرآن مجید کا اخلاق پر اثر دور نبوت میں قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیمات اور آپکی پاکیزہ اخلاقی زندگی نے اسلامی نظام اخلاق کو قائم کیا تھا اور انھیں چیزوں کی وجہ سے اس نظام اخلاق نے عملی صورت اختیار کی متعدد روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ صحابہؓ کی معاشرتی اور اخلاقی زندگی میں قرآن مجید کی اخلاقی تعلیمات نے نمایاں انقلاب پیدا کر دیا تھا اور اسکے عملی نتائج علانیہ ظاہر ہونے لگے چنانچہ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں ہمارے نزدیک عورتوں کی کوئی حیثیت نہ تھی لیکن جب قرآن میں انکے متعلق احکام نازل ہوئے تو انکا خاص درجہ قائم ہو گیا[1] اس مثال کے علاوہ بکثرت مثالوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی کوئی اخلاقی تعلیم عملی تجربہ سے خالی نہ تھی، جب قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی کہ من ذا الذی یقرض اللہ قرضا حسنا (کون ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے) اسوقت حضرت ابوالدحداحؓ اپنے اہل و عیال کیساتھ اپنے باغ میں مقیم تھے فوراً اپنی بی بی کے پاس آئے اور کہا کہ اے ام دحداح باغ سے نکلو میں نے یہ باغ خدا کو قرض دیدیا یعنی اسکو فقرا و مساکین پر وقف کر دیا[2]۔ جب آیۂ لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون (تم حقیقی نیکی کو اسوقت تک ہرگز نہ پاؤگے جبتک کہ اپنی پسندیدہ مال میں سے اللہ کی راہ میں نہ صرف کرو) نازل ہوئی تو حضرت ابوطلحہؓ نے مقام بیرحا کی اپنی ذاتی زمین آنحضرتؐ کو شاہد بنا کر اپنے قرابتداروں میں تقسیم کر دی[3]۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو وہاں کے لوگ ناپ تول میں سخت خیانت کرتے تھے لیکن آیۂ ویل للمطففین کے نازل ہوتے ہی لوگ دیانت سے کام لینے لگے[4]۔ اصحاب صفہؓ نہایت نادار تھے انکی معاش کا دارومدار صرف انصارؓ کی فیاضی پر تھا اور انصارؓ بسر و چشم اس فرض کو انجام دیتے تھے آیت یا ایہا الذین آمنوا لا ترفعوا اصواتکم کے نازل ہونیکے بعد حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے اسقدر آہستہ سے بولتے تھے کہ انکی بات سننے میں نہیں آتی تھی حضرت مسطحؓ نے باوجود کہ حضرت عائشہؓ پر تہمت لگائی تھی مگر ولا یاتل اولوا الفضل کے نازل ہونیکے بعد

---

[1] بخاری کتاب التفسیر سورۂ تحریم [2] استیعاب تذکرہ ابوالدحداحؓ [3] ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ باب فی صلۃ الرحم [4] ابن ماجہ ابواب التجارات باب التوقی فی الکیل والوزن۔

حضرت ابوبکرؓ نے تہمت لگانیکے سبب اُن کی مدد جو بند کردی تھی پھر جاری کردی۔

صحابہؓ میں یہ ایثار، یہ فیاضی، یہ تقویٰ اور آنحضرتؐ کی یہ عزت کرنیکا جذبہ صرف قرآن کی اخلاقی تعلیماؐ کے اثر سے پیدا ہوا تھا۔

آنحضرتؐ کی اخلاقی تعلیمات کا اثر خود آنحضرتؐ کی اخلاقی تعلیمات اسقدر اہم تھیں کہ صحابہؓ ان کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے تھے اور اُن پر عمل کرتے تھے۔ حدیث کی کتابوں میں اسکی بکثرت مثالیں موجود ہیں۔ قرآن مجید اور آنحضرتؐ کی اخلاقی تعلیمات اسقدر اہم تھیں کہ اُن کے آگے دنیا کی تمام اخلاقی تعلیمات صحابہؓ کی نظروں میں بے قیمت ہوکر رہگئی تھیں۔ ان دونوں چیزوں کے علاوہ دور نبوت میں نظام اخلاق کی عملی تشکیل کا ایک اہم سبب خود رسول اللہؐ کی اخلاقی زندگی تھی جسکو محدثین کی اصطلاح میں "ہدی صالح" یعنی عمدہ روش کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہو اور صحابہؓ کی تمامتر زندگی اسی ہدی صالح کی بنا پر قائم ہوئی اور قائم رہی، بالخصوص صحابہؓ میں جو لوگ زیادہ مقرب بارگاہ تھے اُن کی عملی زندگی تو تمامتر اسی سانچے میں ڈھل گئی عبد اللہ ابن مسعودؓ کے متعلق حضرت حذیفہؓ نے یہ الفاظ روایت کئے ہیں: "ان اشبہ الناس دلا و سمتا و ھدیا برسول اللہ صلعم لابن ام عبد من حین یخرج من بیتہ الی ان یرجع الیہ لا ندری ما یصنع فی اھلہ اذا خلا" اور اس کا خاص سبب یہی تھا کہ وہ آنحضرتؐ کے خدام خاص میں سے تھے۔

اس حدیث کی شرح میں فتح الباری میں حافظ ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہو کہ صرف اسی روایت کی بنا پر اُن کے تلامذہ اُن کے طور طریق کو بغور دیکھتے تھے اور اُن سے مشابہت پیدا کرتے تھے۔

صحابہ کرامؓ اخلاقی حیثیت سے دور نبوت میں مکی زندگی ابتلا و امتحان کی زندگی تھی اس لئے اس زندگی میں صحابہؓ کے جن اخلاق کا ظہور ہوا وہ صبر و استقامت تھے۔ چنانچہ کفار نے بیکس صحابہؓ پر جو مظالم کئے انکو انھوں نے نہایت صبر و تحمل کے ساتھ برداشت کیا اور انکی جبین استقلال پر شکن تک نہ آئی۔ ایک بار کفار

[1] بخاری کتاب الادب باب الہدی الصالح

حضرت سمیہؓ، عمارؓ اور یاسرؓ کو مکہ کی تپتی ہوئی زمین میں اذیتیں دے رہے تھے، آنحضرتؐ کا گذر ہوا تو آپ نے فرمایا "اے آل یاسر صبر کرو تمہارا ٹھکانا جنت ہے"۔

لیکن ان مظلوموں میں بعض بزرگ ایسے بھی تھے جو صبر وتحمل کے ساتھ شجاعت کا بھی اظہار کرتے تھے چنانچہ حضرت ابوذر غفاریؓ گو غریب الوطن تھے مگر اسلام قبول کرنیکے بعد انھوں نے نہایت جوش سے اپنے عقیدہ کا اظہار کیا، حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے خاص خانہ کعبہ میں قرآن مجید کو کفار کے سامنے بآواز بلند پڑھا، حضرت عمرؓ نے بھی اپنے اسلام کا اعلان نہایت دلیری سے کیا۔

ہجرت مدینہ کے بعد ابتلاء وامتحان کا یہ دور ختم ہوا تو اسلامی اخلاق میں ہمدردی، ایثار اور مہمان نوازی کا ایک موثر اخلاقی منظر مدینہ میں نظر آیا کیونکہ جو صحابہؓ ہجرت کرکے مدینہ آئے تھے وہ بالکل بے خانماں اور بے سروساماں تھے لیکن انصار نے اُن سبھوں کو اپنے گھروں میں ٹھیرایا اور دل کھول کر اُن کی مہانداری کی۔ مہاجرین وانصار میں مواخات کا رشتہ قائم ہوا اور انصار نے مہاجرین کو ہر چیز میں اپنا شریک بنالیا یہاں تک کہ ایک دولتمند انصاری نے ایک مہاجر کو اپنی دولت کا نصف حصہ تقسیم کرنا چاہا تو اپنی دو عورتوں میں سے ایک کو طلاق بھی دینا چاہا، مگر اُن مہاجر نے صرف بازار کا راستہ پوچھنے پر اکتفا کی۔ کیا اس خلوص وایثار اور اس استغنا وخودداری کی مثال دنیا کی کوئی اور تاریخ پیش کرسکتی ہے؟

عہد نبوی میں تعاون وہمدردی اور ایثار واخوت کی بہترین مثال قبیلۂ اشعری کے لوگوں نے قائم کی تھی اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُن کو نہایت محبوب رکھتے تھے چنانچہ ایک بار آپ نے فرمایا کہ قبیلۂ اشعری کے لوگ مجھ سے ہیں اور میں اُن سے ہوں[۲]۔

مدینہ میں فقراء ومساکین کی ہمدردی کا سب سے بڑا ذریعہ زکوٰۃ تھی اور مدینہ میں زکوٰۃ کی فرضیت نے ایک موثر اخلاقی منظر پیدا کردیا تھا چنانچہ جب آیت صدقہ نازل ہوئی تو بعض لوگوں نے بڑی بڑی

---

[۱] اسد الغابہ تذکرہ سمیہ [۲] بخاری کتاب الشرکۃ فی الطعام

رقمیں خیرات کیں۔

مدنی زندگی میں اسلامی اخلاق کا ایک موثر مظہر جہاد تھا جس میں صحابۂ کرامؓ کے محاسن اخلاق کا ظہور مختلف صورتوں میں ہوا تھا فیاضی، ایثار نفس، صداقت و خلوص، صبر و استقامت، جاں نثاری اور جانبازی کی اکثر مثالیں غزوات ہی میں قائم ہوئیں چنانچہ غزوۂ بدر کے موقع پر جب حضرت مقدادؓ نے انصار کی طرف سے کہا کہ ہم لوگ ہر ممکن طریقہ سے آپکی مدد کریں گے تو آنحضرتؐ کا چہرۂ مبارک فرط مسرت سے چمک اٹھا صحابیاتؓ کی اخلاقی خدمات کا بھی سب سے زیادہ ظہور لڑائیوں ہی میں ہوا وہ اپنی ہر امکانی کوشش سے مجاہدین کی خدمت کرتی تھیں بیمارداری کرنا، تیر اٹھا کر دینا، ستو گھول کر پلانا، اسباب کی نگرانی کرنا، پانی پلانا، زخمیوں کو خیمہ میں اٹھا کر لانا یہ سب صحابیات ہی کے سپرد تھا۔

اسلامی تاریخ کا یہ وہ عہد مبارک ہے اور صحابۂ کرامؓ کا یہ وہ مقدس زمانہ ہے جب اسلام اپنے پورے عروج پر تھا ہر طرف اسلام کا ڈنکا بج رہا تھا ساری دنیا پر علمی، مذہبی، اخلاقی، معاشرتی، تجارتی اور سیاسی حیثیت سے مسلمانوں کا غلبہ ہوا۔ روم و ایران، مصر و ہند، ترک و اسپین انھوں نے فتح کئے حقیقت میں انکی فتح و ظفر اور ان کی اقبالمندی کا راز صرف اُن کے بلند اخلاقی معیار میں پوشیدہ تھا جسکی متعدد مثالیں اوپر گذر چکیں۔

اسلامی قوت کا انحطاط مگر جب مسلمانوں کی انتہائی ترقی ہو چکی تو بقول ہر کمالے را زوالے انکا بھی تنزل شروع ہو گیا جس کا اہم سبب اخلاقی انحطاط تھا، اُنمیں قیصر و کسریٰ کے طرز کی سلطنت قائم ہو گئی تمدن کی ترقی سے عیش و عشرت اور ناز و نعم کی زندگی بسر کرنے لگے امارت اور حکومت کے سبب انمیں بغض و حسد اور کینہ و فساد کی آگ سلگنا شروع ہو گئی عبادات میں وہ تساہل کرنے لگے۔ انھوں نے خالص علم سے منھ موڑ کر مناظرہ اور مکابرہ شروع کر دیا، اتحاد اسلامی کا شیرازہ بکھر کر فرقہ بندیاں شروع ہو گئیں۔ بڑی بڑی خونریزیاں ہوئیں اور پھر اسپین اور بغداد کا قصر حکومت ایسا پیوند خاک ہوا کہ آج صرف پرانے کھنڈر اپنی

زبان حال سے اُنکی بے عنوانیوں کا رونا رو رہے ہیں۔ دنیائے اسلام پر جمود طاری ہو گیا۔ وہ نظام اخلاق جو صحابہؓ کے مقدس عہد میں قائم ہوا تھا ٹوٹ گیا۔ آپس کا وہ اتحاد، وہ ایثار اور وہ ہمدردی جسکی بدولت صحابہؓ نے قیصر و کسریٰ کی حکومتوں کے تختے اُلٹے تھے سب کو مسلمان بھول گئے۔ اور آج گو وہ دنیا میں ایک بہت بڑی اکثریت میں ہیں تاہم اُن کی اقتصادی، مذہبی، علمی، معاشرتی اور سیاسی حالت صرف اُن کا نظام اخلاق ٹھیک نہ ہونے کے سبب بالکل تباہ ہو۔ ہندوستان کی عظیم الشان اسلامی سلطنت بھی اخلاقی انحطاط ہی کے سبب مٹی اُس زمانہ کی معاشرت میں فسق و معصیت داخل ہو کر آداب میں داخل ہو گئے تھے مسلمان اس پر علانیہ فخر کرتے تھے۔ شراب اور اشیائے نشی کا استعمال عام تھا جس سے اخلاق کے ساتھ قوائے عقلیہ اور صحت بھی خراب ہو رہی تھی بازاری عورتیں ہر مجلس کی زینت تھیں بہت سے لوگ نکاح اور کسی تعداد کے پابند نہ تھے امراء و متوسطین سے لیکر غربا تک عیاشی عام تھی۔ ہر ایک نشہ میں سرشار تھا، وقت کی نزاکت، اور ملکی انقلاب کی طرف کسی کی توجہ بھی نہیں جاتی تھی۔ غرض مسلمانوں سے فاتح اور زندہ قوموں کے خصائص رخصت ہو رہے تھے اور ان کی اخلاقی حالت بعینہ وہی تھی جو قوموں کے زوال کے وقت ہوتی ہے آخر اسی اخلاقی انحطاط نے ۱۸۵۷ء میں انھیں ذلت کے قعر عمیق میں ڈھکیل دیا۔ قوموں کی تعمیر میں اخلاق کو جو اہمیت حاصل ہو وہ گذشتہ تاریخ اور اسلامی تاریخ سے واضح طور پر ثابت ہو چکی اب ہم کو موجودہ دور میں بھی اسی بات پر غور کرنا ہے۔

یورپ کا عروج یورپ کی تاریخ پندرھویں صدی تک نہایت تاریک نظر آتی ہے صنف نازک کی ذلت، مذہبی لیڈروں کی مطلق العنانی، اخلاق کی پستی اور اوہام پرستی کے سبب وہ زمانہ ہی تاریک کہلاتا ہے اٹھارھویں صدی میں جب یورپ کے فلاسفہ اور اہل قلم نے سوسائٹی کے خلاف فرد کے حقوق کی حمایت میں آواز اُٹھائی اور شخصی آزادی کا صور پھونکا تو پرانے نظریات ٹوٹ گئے اور قدیم نظام اخلاق کو توڑ کر جدید یورپ کے معماروں نے جو نظریات قائم کئے اُن کے نتیجہ میں انقلاب فرانس رونما ہوا اس کے بعد

مغربی تہذیب و تمدن کی رفتار اُن راستوں پر لگ گئی جن پر بڑھتے بڑھتے وہ آج کی منزل پر پہونچی ہے۔

اس دورِ جدید کی ابتدا میں عورتوں کو پستی سے اُٹھانے کے لئے جو کچھ کیا گیا اجتماعی زندگی میں اُسکے خوشگوار نتائج مترتب ہوئے نکاح و طلاق کے پچھلے قوانین کی سختی کم کی گئی عورتوں کے معاشی حقوق بڑی حد تک اُنھیں واپس دیدیے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عورتوں نے گھروں کو سنوارا، معاشرت میں نفاست پیدا کی رفاہِ عام کے بہت سے مفید کام کئے۔ انقلابِ فرانس کے بعد یورپ نے اپنی ہر چیز میں تجدید کی وہاں کی اصلاح اور تجدید کے علمبرداروں نے نئے نئے نظریات قائم کئے، اوہام پرستی کو مٹایا۔ پوپوں کی بادشاہی ختم ہوئی، آپس کا نفاق و شقاق مٹگیا، قوم کے افراد میں حب الوطنی اور ایثار کا جذبہ پیدا ہوا اُنھوں نے شجاعت اور پامردی کے ساتھ مصائب کا مقابلہ کیا اور دلیری کے ساتھ میدان جد و جہد میں سرگرم کار رہے آپس کے اتحاد و ایثار، شجاعت اور حب الوطنی کے جذبہ کے ماتحت اُنھوں نے دنیا پر اپنی حکومت قائم کی طرح طرح کی ایجادات و اختراعات شروع ہوئیں اور یورپ کی ہر حکومت علم و ہنر صنعت و حرفت اور تہذیب و تمدن میں ترقی کرنے لگی۔ یورپ کی جو قومیں دنیا پر حکمراں ہیں یہی بات نہ کہ اُن کی حکومت تلوار کے سایہ میں قائم ہو لیکن غور سے دیکھئے کہ ان کی تلواروں کی صفوں کے پیچھے اس قوم کے مضبوط کیرکٹر، مستحکم اخلاق، یہی حب الوطنی اور قومی ایثار کا بلند جذبہ ہی ان کے وہ قلعے ہیں جنکی حفاظت میں اُن کی یہ عالمگیر حکومت قائم ہے۔

یورپ کا اخلاقی انحطاط یہ ایک عجیب بات ہے کہ جسطرح سوسائٹی کے اخلاق کو درست کرنے کیلئے سب سے پہلے فرانس نے آواز اُٹھائی اسی طرح بعد کو "افراط" میں پڑکر وہ خود اُس سے بڑھکر اخلاقی مصائب میں گرفتار ہو گیا۔ اصل بات یہ ہو کہ تجدید کے ابتدائی نظریات میں شروع ہی سے افراط کا پہلو غالب تھا، مثلاً عورت کے متعلق جو نظریات قائم کئے گئے وہ یہ تھے:۔

عورتوں اور مردوں کی مساوات، عورتوں کا معاشی استقلال، دونوں صنفوں کا آزادانہ اختلاط۔

یہ وہ نظریات تھے جنھوں نے حقیقت میں مغربی معاشرت کی جڑوں کو ہلا کر رکھدیا۔ آج یورپ کے ہر ملک میں بداخلاقی، بے شرمی اور بیحیائی کے جو عبرت انگیز مناظر دیکھنے میں آتے ہیں وہ انھیں نظریات کے نتائج ہیں انھیں نظریات پر مجموعی طور پر سب کا عمل ہو مگر فرانس ہی سے چونکہ تحریک تجدد اٹھی تھی اسلئے وہیں اصلاح کا ردعمل بھی بہت جلد اور تیزی کے ساتھ ہوا فرانسیسی قوم عیاش، بزدل بداخلاق اور کمزور ہو گئی عیش و عشرت میں مبتلا ہو کر اُسنے اس جرمنی کے عزائم اور ارادے بھلا ڈالے جنکے اسپہ ہمت کی تگ و تاز نے سارے یورپ کو روند ڈالا تھا اور جس کے بلند کیرکٹر اور مستحکم اخلاق کے سبب سارا یورپ اس سے لرزتا تھا۔ آرٹ کا فریب دے دیکر فرانسیسیوں نے خوب اچھی طرح حسن پرستی عیش پرستی اور نفس پرستی کی نظریات بالا کی اشاعت کا اولین اثر یہ ہوا کہ صنفی معاملات میں لوگوں کی اخلاقی حس مفلوج ہونے لگی شرم و حیا اور غیرت و حمیت روز بروز مفقود ہوتی چلی گئی نکاح و سفاح کی تمیز دلوں سے نکل گئی اور بدکاری ایک ایسی معصوم چیز بن گئی جسے اب کوئی اخلاقی عیب یا قباحت کی بات سمجھا ہی نہیں جاتا کہ اسکو چھپانے کا اہتمام کیا جائے یہ اخلاقی انحطاط وہ عظیم الشان تخریبی قوت تھی جو فرانس کی زندگی کو اندر ہی اندر گھن کی طرح کھاتی رہی۔ یہاں تک کہ آخر اسے اتنا کھوکھلا کرکے رکھدیا کہ ایک اچانک صدمہ نے اُسکے قصر عظمت کو آن کی آن میں پیوند خاک کر دیا اور آج آخر ہمیں صرف اتنا یاد ہے کہ فرانس نامی ایک عظیم الشان سلطنت کچھ دن پہلے دنیا میں موجود تھی۔ فرانس کا زوال تاریخ عالم کا ایک بہت اہم واقعہ ہے جو صرف اخلاقی انحطاط کے سبب ظہور میں آیا۔ ابھی ۸ جولائی کو لندن میں تقریر کرتے ہوئے دارالعوام کے اجلاس میں خود برطانیہ کے ایک بڑے مدبر مسٹر اٹیلی نے کہا کہ "حال ہی میں ہماری نگاہوں کے سامنے دنیا کی ایک بڑی سلطنت فرانس کا تختہ اُلٹ دیا گیا لیکن اُس کو شکست ہتھیاروں کی طاقت سے نہیں ہوئی بلکہ آپس کے نفاق پست ہمتی اور بداخلاقی کے سبب سے ہوئی۔"

دنیا کے دوسرے غیر ترقی یافتہ ممالک بھی اخلاقی انحطاط میں مبتلا ہیں۔ ملکی ترقی کے لئے جس ایثار، جوانمردی، ہمدردی اور بہادری کی ضرورت ہے اس سے وہ بالکل عاری ہیں اور اسی سے موت کی نیند سو رہے ہیں۔

خاتمہ غرض ملک و ملت کی تعمیر اور ترقی و عروج میں اخلاق کا بہت بڑا حصہ ہے۔ مضبوط چال چلن، مستحکم کیرکٹر اور بلند اخلاق سے قوم کو ترقی ہوتی ہے، تہذیب و تمدن، علم و ہنر، صنعت و حرفت اور حکومت و سیاست کو عروج ہوتا ہے اور بداخلاقی، پست ہمتی، برا اور بدترین کیرکٹر قوم کی تباہی اور ہلاکت کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔

آئیے تاریخ کی اس روشنی میں ہم اپنے اخلاق کی صحیح تربیت کریں، اپنے کیرکٹر کو مستحکم اور خیالات کو بہتر اور اعلیٰ بناکر پھر دنیا میں ترقی کریں اور ملک و ملت کو بام ترقی پر گامزن کریں کہ ملت کی تعمیر کا اہم جز اخلاق کی صحیح تربیت ہے۔ ٥٠

جلالِ شہریاری ہے ابھی تیرے تجمل میں
ابھی تیرے تخیل میں کمالِ فخر رازی ہے

بچہ اور تعلیم

از محمد سمیع صاحب ایم اے۔ بی۔ ٹی۔ صدر شعبۂ انگریزی دارالعلوم ندوۃ العلماء

(سلسلہ کے لئے دیکھو الندوہ ماہ جولائی سنہ ۱۹[illegible]ء)

گذشتہ اشاعت میں پیش کیا جاچکا ہے کہ اسلام نے معاشرت پر کسقدر گہرا اثر ڈالا اور مُردہ علوم کو پھر حیات نو بخش کر دنیا کو جگایا۔ برس ہا برس کے جمود کو توڑا، انسان کو اپنے قویٰ عقلی، ذہنی اور جسمانی کا صحیح استعمال بتلایا۔ پچھلی اشاعتوں میں مختلف دور کے معلمین اور مفکرین کی رایوں پر روشنی بھی ڈالی جاچکی ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں بعض مسلم مفکرین کا بھی ذکر کیا جائے۔

اس سلسلہ میں امام غزالیؒ اور علامہ ابن خلدونؒ کا تذکرہ کرتا ہوں۔

امام غزالیؒ آپکا نام محمد تھا، حجۃ الاسلام لقب پایا اور غزالی کے عرف سے مشہور ہوئے۔ ضلع طوس کے شہر طابران میں ۴۵۰ھ میں پیدا ہوئے۔ خاندانی پیشہ کاتنے کا تھا، اسی نسبت سے غزالی کہلائے۔

علامہ سمعانی کے نزدیک غزالہ طوس کا ایک گاؤں تھا وہیں کے رہنے والے تھے۔ مگر یہ تحقیق مؤرخین کے نزدیک صحیح نہیں۔ حقیقتاً اسلام کے نزدیک کوئی پیشہ ذلیل نہیں۔ یہی وجہ ہو کہ تعلیم عام ہونیسے ایسے ایسے صاحب کمال پیدا ہوئے کہ آج ہم انھیں امام کے لقب سے پکارتے ہیں مثلاً امام ابوحنیفہؒ بزازی کرتے تھے، امام ابوجعفرؒ کفش دوز تھے۔ وغیرہ۔

آپکے والد نے انھیں اور ان کے چھوٹے بھائی امام احمد غزالی کو ایک دوست کے سپرد کرکے انتقال کیا۔ جنھوں نے جبتک پسماندہ رقم رہی تعلیم دلائی اور آخر ایک مدرسہ میں داخل ہوگئے۔ اُسوقت امراء اور رؤساء مساجد اور درسگاہوں کے کفیل ہوتے تھے۔ کم مقدرت طالبعلم بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کرسکتا تھا۔

آپکی ابتدائی تعلیم اپنے ہی شہر میں ہوئی، پھر جرجان گئے وہاں امام ابونصر اسمٰعیلی سے درس حاصل کیا۔

استاد کی تقریر کی یادداشت کا مجموعہ تیار کر لیا اور وطن واپس ہوئے، راہ میں ڈاکہ پڑا مجموعہ لٹ گیا سخت صدمہ تھا، قزاق سے اُسے طلب کیا جس نے طعنہ سے کہا کہ "کاغذ نہ رہا تو کورے رہ گئے؟" اس کا ایسا اثر پڑا کہ اُن مسائل کے حافظ بن گئے۔

مسلمانوں کا علمی مذاق علم دوستی اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ ایک ایک شہر بلکہ قصبہ بھی مدرسوں سے خالی نہ تھا، نیشاپور اور بغداد کو نمایاں مرتبہ حاصل تھا۔ امام الحرمین اور علامہ ابواسحٰق شیرازی جیسے اجل اساتذہ ان مقامات پر درس دیتے تھے بڑے بیہقیہ، سعدیہ، نصیریہ اور نظامیہ نیشاپور میں تھے۔ امام صاحب امام الحرمین سے تعلیم حاصل کی جو نظامیہ کے مدرس اعظم تھے۔ ان کے حلقۂ درس میں چار سو طلبا تعلیم پاتے تھے جنمیں امام غزالی بہت ممتاز تھے۔ اور معید کے منصب کو اپنی قابلیت سے حاصل کر لیا معید کا کام استاد کے پڑھانے کے بعد باقی طالبعلموں کو دوبارہ درس دینا تھا۔

امام الحرمین کی خدمت میں ان کے انتقال تک حاضر رہے صاحب تصنیف بھی ہو گئے تھے۔ ۲۸ سال کی عمر میں نیشاپور سے بڑی شان کے ساتھ نکلے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ملک شاہ سلجوقی حکمراں تھا جسکی وسعت سلطنت کاشغر سے بیت المقدس تک تھی جس کا مشہور وزیر نظام الملک تھا جو ایشیا کے وزیروں میں فرد تھا سلطنت کی ساری رونق اور کامرانی نظم و نسق امن و امان اُسی کے دم سے تھی۔ اس وزیر نے ممالک اسلامیہ میں چپہ چپہ پر مکاتب اور مدارس قائم کئے تھے۔

"کوئی شہر ایسا نہ تھا جہاں اسکا تعمیر کردہ مدرسہ موجود نہ تھا یہانتک کہ جزیرۂ ابن عمر میں بھی جو بالکل ایک گوشہ میں واقع ہے اور کسی کا وہاں گذر نہیں ہوتا ایک بڑا مدرسہ موجود تھا" (روضتین فی اخبار الدولتین)

اسکے زمانہ میں مدارس کا سالانہ خرچ ۶ لاکھ اشرفیاں تھیں۔ اسکے سوا اپنی کل جاگیرات کا دسواں حصہ تعلیم کے مصارف پر وقف کر دیا تھا۔" (آثار البلاد مصنفۂ علامۂ قزوینی)

یہ وزیر علماء کی بڑی عزت کرتا تھا۔ امام غزالیؒ نے بھی نیشاپور سے اسکے دربار کا رُخ کیا جہاں نہایت

تعظیم و تکریم سے استقبال کیا گیا۔ جس کے دربار میں بڑے بڑے مناظرے سر کئے۔ اور نظام الملک کو نظامیہ یونیورسٹی کا مدرس اعظم مقرر کیا۔ یہ وہ منصب تھا جسکی آرزو میں اہل کمال عمریں صرف کر دیتے مگر حسرت ہی رہتی تھی، رفتہ رفتہ ان کے علم و فضل کا یہ اثر ہوا کہ ارکان سلطنت کے ہمسر بن گئے اور ان کے آگے امرا کا جاہ و جلال دب گیا۔ امام صاحب کے درس میں تین سو مدرسین اور سو امرا اور رؤسا حاضر ہوتے تھے۔ درس کے علاوہ وعظ بھی ہوتے تھے جو حقیقتاً علمی لکچر تھے۔

آپنے متکلمین، باطنیہ فلاسفہ، اور صوفیہ کے ہر فرقہ کے علوم و عقائد کی تحقیقات شروع کی۔ تصوف نے ایسا اثر کیا کہ ارادہ کر لیا کہ عزلت نشینی اور سیاحت کریں۔ بغداد چھوڑا ایسی حالت میں کہ بدن پر کمبل تھا۔ غذا ساگ پات تھی۔ دمشق پہونچے۔ وہاں جامع اموی میں مراقبہ ذکر و شغل میں مصروف ہو گئے، درس بھی دیا کرتے تھے اسوقت جامع اموی دمشق کی یونیورسٹی تھی، دو برس بعد بیت المقدس کا رخ کیا، جہاں صخرہ کے حجرہ میں مجاہدہ کیا کرتے تھے۔ یہاں سے بھی سفر اختیار کیا۔ مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، مصر، اسکندریہ پہونچے۔ اسطرح دس برس تک سفر کرتے رہے، آخر میں فلسفہ اور عقلیات کے مقابلہ میں مذہبی عقائد کی ہوا اکھڑتی دیکھکر نیشاپور کے مدرسہ نظامیہ میں سنہ درس کو زینت دی اور بدستور پڑھنے پڑھانے میں مشغول ہوئے۔

فخر الملک وزیر سنجر سلجوقی سنہ میں ایک باطنی کے ہاتھ شہید ہوا۔ اسکے بعد امام صاحب نے طوس میں خانہ نشینی اختیار کی اور ایک مدرسہ اور ایک خانقاہ کی بنیاد ڈالی۔ مرتے دم تک یہیں تلقین کرتے رہے۔ امام صاحب ۱۴ جمادی الاول سنہ میں بمقام طابران پچپن سال کی عمر میں انتقال کیا۔

اصلاح تعلیم گو امام صاحب کا وہ زمانہ تھا جبکہ تعلیم اپنے اوج شباب پر تھی، لیکن طرز تعلیم میں بے اعتدالیاں پیدا ہو گئی تھیں جنکا اثر مذہب، اخلاق اور تمدن سب پر پڑا۔ سب سے بڑا خلط مبحث یہ تھا کہ مذہبی اور غیر مذہبی علوم آپس میں مل گئے تھے یعنی غیر مذہبی علوم مذہبی بنگئے تھے اور اسی حیثیت سے انکی تعلیم دیجاتی تھی۔ اس سے کئی نتائج مضر نکلے۔

(۱) تعلیم میں اسقدر زیادہ وقت صرف کیا جاتا تھا کہ ضروری علوم کی طرف کوئی التفات نہ ہو سکتا تھا۔

(۲) مسائل کے اختلافات پر سخت نزاع پیدا ہوتی تھی۔

(۳) عقلی اور صنعتی علوم طب و صنعت بالکل درس میں نہ تھے۔

(۴) علم اخلاق بھی درس میں نہ تھا۔

امام صاحب نے ان تمام غلطیوں کی اصلاح کی۔ اس اصلاحی حیثیت سے آپ کا اثر مدارس پر بہت پڑا تعلیم کے نصاب میں فقہ و کلام کے ساتھ منطق و فلسفہ داخل کیا۔ علوم دنیوی کیساتھ اتنا کافی وقت نکل آیا کہ فقہا اور محدثین بھی ریاضی داں اور حساب داں ہونے لگے۔

تین سے نو سال تک بچہ کے متعلق کہتے ہیں کہ اُس کا دل مثل آئینہ کے ہے جیسا جو نقش چاہئے جمائے برعکس اسکے عیسائیت کا نظریہ یہ رہا ہے کہ بچہ گناہ و عصیاں کو وراثتاً حاصل کرتا ہے۔ چونکہ والدین اول نے نافرمانی کی گناہ کے مرتکب ہوئے یہ سلسلہ اولاد آدم میں منتقل ہوتا چلا آتا ہے۔ ع

ببیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا

بچہ ہر نقش سے پاک ہونیکے سبب بہت ضروری ہو کہ اُسے صحیح ہدایات اور رہنمائی کیجائے۔ بچہ کی ابتدائی زندگی بالکل نقالی پر مبنی ہو تخیل اور فکر میں علم اور زندگی میں اپنے گرد اگرد کے اشخاص کی نقالی کرتا ہو۔ اسکی اس فطرت کا مطالعہ کرکے اسے اچھے عادات کی طرف راغب کیا جائے اور آہستہ آہستہ اسی نقالی کے ذریعہ اُسمیں خیالات و عادات راسخ کر دیے جائیں تاکہ کیرکٹر کی بنیاد اچھی پڑجائے اور نشو و نما احسن ہو۔

امام صاحب کا بھی خیال ہو جیسا کہ جدید سائیکولاجسٹ ثابت کرتے ہیں کہ خاندانی میلان طبع۔ فطری رجحان یکسر مٹایا نہیں جاسکتا، ہاں بچہ کے اردگرد ایسی فضا اور حالات پیدا کر دیے جائیں جس سے وہ متأثر ہوکر اچھے عادات سیکھے اور عمدہ کیرکٹر بنائے۔ تربیت کے معنی یہ ہیں کہ بچے کی ایسے ماحول میں پرورش کیجائے کہ گرد و پیش کے حالات اُسکی فطرت پر غالب آجائیں اور بہتر جذبات اور اطوار کے اختیار کرنے میں معین ہوں۔

ایک مرتبہ قبلہ علامہ سید سلیمان صاحب اساتذہ اور طلباء کو گرانقدر نصائح سے سرفراز فرمارہے تھے کہ دوران تقریر میں فرمایا کاش میں اس دارالعلوم کو ایسی جگہ اُٹھا کر رکھدیتا جہاں زمانۂ حاضرہ کی مسموم فضا نہ پہونچتی تعلیم اور کیرکٹر کے نشو ونما میں دور جدید کی زہریلی ہوائیں بچوں اور طلباء کے دل و دماغ کو نقصان نہ پہونچا سکتیں۔

غرضکہ ماحول کا اثر بچہ پر بہت ہوتا ہے۔ والدین اور معلمین کی اسطرف توجہ خصوصی کی ضرورت ہے۔

۱۲ سے ۱۹ تک بچہ کی عمر کا وہ زمانہ جبکہ وہ بلوغیت کی حد میں قدم رکھتا ہو بہت اہم اور قابل توجہ ہے یہ وہ عمر ہے جبکہ تغیرات بدنی اور ذہنی بڑی سرعت سے پیدا ہوتے ہیں اور لڑکا ایک ایسے تخیلی عالم میں رہتا ہو جو اسکی خود ساختہ ہے۔ وہ "ہم" پہ کاربند ہوتا ہے اور اظہار ظاہری کا دلدادہ ہوتا ہے اپنے جسم کے وجود کا خیال کرتا ہے اور اسے لوگوں کی نظروں میں قابل توجہ اور قابل احترام سمجھتا ہے احساسات صدرجہ تیز ہوجاتے ہیں۔ یہیں پر معلم کا امتحان ہو کہ وہ اسکے ان تغیرات اور احساسات سے کسطرح فائدہ اُٹھا کر صحیح تعلیم دے اور شوق پیدا کرے، ورنہ تعلیم کا حاصل غلط بلکہ نقصان رساں ثابت ہوتا ہے۔

بالغ بچے کے تعلیمی ایام کا ہر لمحہ کام سے مشغول رکھا جائے۔ کام اور کھیل دونوں اسے اسطرح منہمک رکھیں کہ جب وہ بستر پر جائے تو نیند کا ماتا ہو اور فوراً سو جائے بستر پر اختر شماری کا موقع نہ ملے اسکے سامنے اچھائی کا نمونہ ہو تاکہ اچھے عمل کی طرف میلان ہو۔ اُسے محسوس ہو کہ یہ اچھا عمل معقول بھی ہے۔ اُسے عمل کرنے کیلئے تحکمانہ لہجہ سے یا حکماً نہ کہا جائے بلکہ تجویز اور درخواست کے طرز سے۔ اسے کسی صورت سے کسی بُرے فعل کا مرتکب نہ ہونے دیا جائے یہ بات کھیلوں اور جسمانی ورزشوں سے حاصل ہوسکتی ہے۔ ساتھ ہی لڑکے کو آزادی اور ذمہ داری کا بھی احساس کرادیا جائے۔

لڑکا انیس سال کی عمر میں عالم تخیل سے باہر آتا ہے اور بیس سال میں شعور حاصل کرلیتا ہے اچھائی اور برائی نیک و بد کی تمیز آجاتی ہے اور زندگی کے میدان عمل میں قدم رکھتا ہے

امام صاحب نے بچہ کے عمر کی ہر منزل کی تفصیل کی ہے بچپن، لڑکپن اور بلوغ اور شعور کی عمریں کب سے شروع ہوتی ہیں اور اس زمانہ میں تعلیم کیونکر ہونی چاہئے۔

(بقیہ صفحہ ۳۰)

نسخہ صحت کتابت واعراب جودت ونفاست تحریر اور قدیم اعلیٰ خطاطی کا بے مثل نمونہ ہے اور اس وجہ سے کہ اس نسخہ کو مصنف علام کے ملاحظہ ونظر ثانی کا بھی شرف حاصل ہے نسخہ کی عظمت ومزیت میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ کتاب کے اول واخیر صفحوں پر متعدد مہریں اور علماء کرام کے ہاتھ کی تحریریں ہیں جو امتداد زمانہ سے مٹ گئی ہیں اور صاف پڑھی نہیں جاتی۔

افسوس ہے کتاب ناقص ہے یعنی صرف سورۂ نساء سے سورۂ اعراف تک کی تفسیر موجود ہو

ایک نادر قلمی تفسیر

از مولوی محمد انور صاحب ندوی

ندوۃ العلما کا کتبخانہ ہندوستان کے مشہور و وسیع کتبخانوں میں سے ہے اس کتبخانہ کی خصوصیات حسب ذیل ہیں ۔

اکثر علوم و فنون کے متعلق مستند اور بلند پایہ تصانیف موجود ہیں جو اس فن کی بنیاد ہیں اور جس سے اس فن کی تدریجی ترقی کا سراغ لگایا جا سکتا ہے مختلف علوم و فنون کی نادر و نایاب کتابیں موجود ہیں بعض مصنفین کے مطالعہ میں رہ چکی ہیں بعض کتابیں شاہی کتب خانوں میں رہ چکی ہیں متعدد کتابیں مطلا و مذہب ہیں ایک رنگی اصطرلاب ہے جو شاہجہان کی وفات کے سات برس بعد لاہور میں تیار کیا گیا ہے ندوۃ العلما کے کتب خانہ میں نوادر کی تعداد ایک ہزار ہے ان کے علاوہ مطبوعات کا شمار کم و بیش چھتیس ہزار ہے اس عظیم الشان اور گرانقدر ذخیرہ میں جن علوم کا سرمایہ خاص طور پر جمع کیا گیا ہے ان میں سے یہاں تفسیر حدیث تاریخ اور ادب کا ذکر کر دینا کافی ہوگا ہم چاہتے ہیں کہ اسلامی علوم کی وہ قدیم اور نادر تصنیفات جن کے قلمی نسخے ہمارے کتبخانہ میں موجود ہیں اور جو قوم کی بے اتفاقی اور بد مذاقی اور اسلامی حکومت کے فقدان کے باعث ابتک طبع نہیں ہو سکی ہیں یا جنکے نسخے دنیا میں کمیاب ہیں، ہم ان کا تعارف الندوہ کے ذریعہ سے کراتے رہیں اس طرح لذت یاد سے محرومی دیدار کی شاید تلافی ہو جائے ۔ ع ذکر حبیب کم نہیں وصل حبیب سے ۔ چنانچہ آج کی زیر تبصرہ کتاب اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے اس علمی اعانت پر ہم مولانا سید کلیم احمد صاحب ندوی مہتمم کتبخانہ کے ممنون ہیں جو کتبخانہ کی موجودہ ترتیب و تہذیب کے باعث اور اسکی وسعت و ترقی کے ذمہ دار ہیں ۔

حالات مصنف　عبدالرحمن بن عمر البصری ساتویں صدی کے مشہور علما میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ بروز دوشنبہ ۱۲ ربیع الاول ۶۲۴ھ میں بصرہ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے، سات برس کی عمر میں حسن بن دویرہ سے قرآن مجید حفظ کیا، وہاں سے بغداد آئے اور ابو حکیم کے مدرسہ میں قیام کیا اور وہیں ابی الخطاب کی کتاب الہدایہ حفظ کی اسکے بعد آپ مدرسۂ مستنصریہ میں فقہ کے استاذ مقرر ہوئے، ۶۳۸ھ میں جبکہ آپکا سن صرف چودہ برس کا تھا آپ مسند افتا پر متمکن ہوئے، آپنے بغداد میں ابو بکر خازن، محمد بن علی ابن ابی سہل اور

صاحب ابی محمد ابن الجوزی سے سماعت حدیث کی، علی مجد الدین ابن تیمیہ جد شیخ الاسلام تقی الدین ابن تیمیہ سے آپنے کتاب الاحکام اور کتاب المحرر (فقہ) کا استفادہ کیا، یوں تو آپ تفسیر و حدیث میں بھی خاص امتیاز و کمال کے مالک تھے لیکن فقہ میں آپکو ید طولیٰ حاصل تھا، اپنے استاذ ابن مدویہ کی وفات کے بعد مسند درس پر آپ ان کے جانشین ہوئے، بغداد پر تاتاریوں کے حملے کے بعد آپکو مدرسۂ مستنصریہ میں حنابلہ کی طرف سے درس دینے کے لئے بلایا گیا، مگر بعض وجوہ سے آپ وہاں نہ جاسکے، یہ وہ زمانہ تھا جبکہ آپ مدرسۂ بشیریہ میں مدرس تھے۔ اور بالآخر جمال الدین ابن عکبر کی وفات کے بعد ۶۸۱ھ میں مدرسۂ مستنصریہ میں آپکو خدمت درس سپرد ہوئی۔

آپ کی تصانیف حسب ذیل ہیں۔

(۱) جامع العلوم (منتہی العلوم) فی تفسیر کتاب الحی القیوم (۲) الحاوی فی الفقہ (دو جلدوں میں) (۳) الکافی فی الشرح الخرقی (۴) الواضح فی الشرح الخرقی (۵) الشافی فی المذہب (۶) کتاب الشہاب۔

فقہ میں آپکے تلامذہ میں امام صفی الدین ابن مومن ابن عبد الحق مشہور ہیں، علامہ صفی الدین نے آپکے متعلق فرمایا ہے، کان شیخنا من العلماء المجتہدین والفقہاء المتفردین۔ ہمارے شیوخ کی ایک جماعت نے آپ سے اجازت حاصل کی، آپکو قدرت نے غیر معمولی دل و دماغ عطا فرمایا تھا اور آپکی زندہ دلی اور حاضر جوابی ضرب المثل تھی، چنانچہ محمد بن ابراہیم جو آپکے جلوت و خلوت کے ساتھی اور خاص حاشیہ نشینوں میں تھے اور شیخ کی دامادی کا شرف بھی آپکو حاصل تھا۔ ایک لطیفہ کی روایت کرتے ہیں کہ ایک بار مدرسہ مستنصریہ میں حکومت کے مظالم اور سختیوں پر غور و بحث کے لئے ایک اجتماع ہوا، اعیان شہر اور حکومت کے ارباب بست و کشاد کی بھی ایک خاصی تعداد شریک مجلس تھی، اتفاق سے شیخ نور الدین اور بہاء الدین بن الفخر عیسیٰ (کاتب دیوان) کی نشستگاہیں اقرب قریب تھیں، امر خاص پر بحث شروع ہوئی، شیخ نور الدین نے بھی بحث میں حصہ لیا اور انجام کار میدان انھیں کے ہاتھ رہا اور اکثریت کو آپکی رائے کے آگے جھکنا پڑا، ابن فخر عیسیٰ نے تعجب سے پوچھا کہ آپ کہاں کے رہنے والے ہیں، شیخ نے جواب دیا بصرہ، پوچھا، آپکا مذہب، جواب دیا۔ حنبلی!

ابن فخر عیسیٰ نے تسخر آمیز لہجہ میں کہا عجیب بصری اور حنبلی، شیخ نے بجستے ہی کہا کہ لیکن اس سے زیادہ عجیب یہ کہ کردی اور رافضی، ابن فخر عیسیٰ سخت شرمائے حقیقتاً یہ کردی اور رافضی دونوں تھے اور اکراد میں شاذ و نادر ہی رافضی ہوتے ہیں۔

شیخ کی وفات بغداد شنبہ شروع شوال ۵۴۸ھ میں ہوئی، اور ردکۃ القبور میں امام احمد کی قبر کے مقابل میں دفن ہوئے۔

شیخ کی متعدد تصنیفات کا اوپر ذکر ہو چکا ہو آج کی صحبت میں انکی مشہور منتہی العلوم فی تفسیر کتاب الحی القیوم کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جسکا ایک نایاب نسخہ ہمارے ندوہ کے کتبخانہ میں موجود ہے۔

خصوصیات کتب مصنف نے ایجاز و اطناب کو چھوڑ کر تفسیر کی درمیانی راہ اختیار کی ہو نزاعی مواقع پر ان کا مسلک وہی ہوتا ہو جسکی مضبوط دلائل اور قوی ثبوت سے تائید ہوتی ہو، شیخ نے اپنی کتاب میں اس امر کا خاص طور پر التزام کیا ہو کہ آیات کی تفسیر میں سب سے پہلے احادیث لاتے ہیں کہ کلام اللہ کے بعد ہمارے لئے سنت ہی حجت ہو اور بعد ازاں اسکی تائید تقویت میں اقوال صحابہؓ پیش کرتے ہیں کہ یہ موقع کے چشم دید گواہ اور اجتماعی حیثیت سے وہ خود قرآن کی عملی تفسیر تھے اور سب سے آخر میں کلام عرب سے استشہاد کرتے ہیں کہ قرآن انھیں کی زبان اور بول چال میں اُترا تھا، ہماری تفسیر مشکلات خالص عربی زبان سے اجنبیت کا نتیجہ ہو ان کی زبان سے واقفیت اور ان کے اسلوب کلام پر عبور حاصل کئے بغیر قرآن کا مطالعہ چند در چند مسامحات و فسادات کا پیش خیمہ ہو، مفسرین کے نقطۂ نظر کا باہم اختلاف اسکا کھلا ہوا نتیجہ اور روشن ثبوت ہے۔

یہ طرز تفسیر اس کتاب کی ممتاز اور نمایاں خصوصیت ہو جسکی مثال ہمیں متقدمین میں سے کسی کے یہاں نہیں ملتی، اپنی مذکورالصدر خصوصیات کی وجہ سے کتاب مجموعی اعتبار سے نہایت جامع ہو گئی ہے۔

مزیت نسخہ پیش نظر نسخہ ۵۴۴ھ میں یعنی مصنف کی وفات سے چار برس پہلے لکھا گیا ہو، عبداللہ المر مصنف کے تلمیذ رشید نے اسی نسخے سے مصنف سے پڑھا تھا اور ان کے علاوہ علمائے سلف کی ایک کثیر تعداد نے اس سے استفادہ کیا، چنانچہ ان تمام اکابر کے نام عبداللہ المرعی کے قلم سے کتاب کے اخیر صفحہ پر لکھے ہوئے ہیں۔

(بقیہ صفحہ ۲۷ پر ملاحظہ فرمائیے)

حالات ندوہ

ان صفحات میں طلباء دارالعلوم کی انجمن النادی العربی (سوق عکاظ) کا ذکر کئی بار آچکا ہے، اس انجمن کا مقصد یہ ہے کہ عربی زبان کو درس و تدریس ہی کے حلقوں تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ اسے زیادہ سے زیادہ رواج دینے کی کوشش کیجائے، ان مقاصد کے حصول کیلئے خطابت و تحریر کے حلقے ناگزیر ہیں، اس انجمن کے پیش نظر بھی یہی لائحۂ عمل ہے چنانچہ مضمون نویسی اور رسالہ نگاری کے علاوہ ہر ہفتہ خطابت کی مستقل مجلسیں منعقد ہوتی رہتی ہیں جنمیں مختلف عنوانوں کے ماتحت عربی میں تقریریں کیجاتی ہیں۔

عرصہ سے تجویز تھی کہ انجمن کے دائرۂ عمل کو اور وسیع کیا جائے تاکہ عربی زبان اور دینی علوم کی اشاعت و ترقی کی نئی راہیں کھل سکیں، اس سلسلہ میں ایک آل انڈیا عربی ڈبیٹ کا تخیل ذہن میں آیا اور خیال ہوا کہ اس طرح ملک کے اسلامی اداروں کو اس جانب توجہ دلائی جاسکے گی۔ اس خیال نے جلد ہی عمل کا قالب اختیار کیا اور جلسہ کا اعلان ہوگیا، اس تقریب میں شرکت کے لئے ملک کی تمام جدید و قدیم مسلم درسگاہوں کو دعوت دی گئی اور ان سے درخواست کی گئی کہ وہ عربی زبان کی ترویج و اشاعت کی اس کوشش میں اپنے اشتراک عمل سے انجمن کے کارکنوں کی حوصلہ افزائی فرمائیں، اس دعوت کا دارالعلوم دیوبند، فرنگی محل، مدرسۂ اسلامیہ ڈابھیل، مدرسہ رحمانیہ دہلی، مدرسۂ رحمانیہ بنارس، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، معدن العلوم نگرام، مدرسہ بدریہ نگرام اور مظاہر العلوم بنارس نے ہمدردانہ جواب دیا۔ افسوس کہ امتحان سالانہ کی مصروفیتوں کی وجہ سے دارالعلوم دیوبند، مدرسۂ اسلامیہ ڈابھیل اور مدرسۂ رحمانیہ دہلی کے طلبہ تشریف نہ لاسکے مسلم یونیورسٹی کے طلبہ آئے تھے لیکن یونیورسٹی کی بعض ضرورتوں کی بنا پر جلسہ سے پہلے ہی واپس ہونا پڑا۔

حسب اعلان ۱۲ رجب ۱۳۵۹ھ (۱۶ راگست ۴۰ء) کو دار العلوم کے وسیع ہال میں جلسہ منعقد ہوا جسمیں باہر کے مہمانوں کے علاوہ شہر کے تقریباً اکثر معزز اور سرآوردہ اصحاب شریک تھے. تقریری مقابلہ سے پہلے استاذ عربی کی قیادت میں مبداشہ کے ورزشی اور تفریحی مظاہرے ہوئے. طلبہ کی فرضی کشاکش، حریفانہ جدوجہد مصنوعی آویزش، آتش بازی کی آتش باری اور فتح و شکست کے مناظر قابل دید تھے، ولولہ انگیز قومی ترانوں نے ان مناظر کی اثر آفرینی اور بڑھادی تھی. ان مظاہروں کے بعد جناب ڈاکٹر عبد العلی صاحب مدظلہ، ناظم ندوۃ العلماء کی صدارت میں جلسہ شروع ہوا. تلاوت قرآن مجید کے بعد مولانا محمد عمران خاں ندوی نائب مہتمم دار العلوم نے اپنی عربی تقریر میں جلسہ کے اغراض و مقاصد بیان کئے. اسکے بعد محمد صابر متعلم دار العلوم نے مباحثہ کا افتتاح کیا. اسکے بعد دوسرے لوگوں نے تقریریں کیں جنکا سلسلہ کئی گھنٹے تک جاری رہا. تحکیم کے فرائض مولانا سید علی صاحب زینبی، مولانا مصطفیٰ حسن صاحب پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی اور مولانا محمد ناظم ندوی ادیب دار العلوم ندوۃ العلماء کے سپرد تھے. انہوں نے فیصلہ کیا کہ اس مقابلہ میں دار العلوم سب سے ممتاز رہا اور علی احمد متعلم دار العلوم اوّل آئے، لیکن میزبان ہونیکی وجہ سے دار العلوم کے طلبہ نے انعام لینا پسند نہیں کیا، اسلئے مظاہر العلوم بنارس کو ٹرافی ملی جسکا ندوہ کے بعد دوسرا نمبر تھا. حسب ذیل طلبہ کو حسن تقریر پر خاص تمغے دیے گئے.

علی احمد، محمد صابر متعلمان ندوہ، محمد یحییٰ متعلم مدرسہ رحمانیہ بنارس، وحید احمد متعلم مدرسہ بدریہ لکھنؤ عبد التواب متعلم مظاہر العلوم بنارس

اس سلسلہ میں دار العلوم کے چھوٹے بچوں کا بھی باہمی مقابلہ تھا. حسب ذیل طلبہ کو انعام ملا۔

سجاد علی، سلمان خاں، عبد اللہ پھلواروی، بشیر الحق، غلام محمد، حبیب عمران۔

Regd. No A-596.

ملکی اور سیاسی کتابوں کا ذخیرہ

نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت
آتش پارے	[illegible]	[illegible]	۸ر	چند اہم خطوط	۸ر
آزادی	[illegible]	[illegible]	۱۲ر	چیمبرلین	۴ر
آزادی	۳ر	[illegible]	۱۲ر	حالات حسرت	۸ر
آزادی (ناول)	عار	بیداری ہند	عار	حکومت خود اختیاری	۶ر
آخد مشہد	۸ر	پیام عمل	عار	حیات خالدؓ	۸ر
ابن سعود	۸ر	پکار (سیاسی ڈرامہ)	۸ر	حقیقت ہنگامہ ہائے پنجاب ۸ر ساتھی	۸ر
احرار اسلام	۵	تاریخ بغاوت ہند	۸ر	حیات صلاح الدین	عار
اشالن	۱۲ر	تاریخ حریت اسلام	۷ر	خالد بن ولیدؓ (ڈرامہ)	۸ر
اشالن کلاں	۸ر	ترکان احرار	۸ر	خالدہ خانم	۱۲ر
اسلامی ہند پر ایک نظر	۸ر	ترک موالات	۴ر	خطابات کی اصلیت	۴ر
اصلاح قوم وملت	۸ر	ترک موالات	۲ر	خطبات سیاسیہ	۸ر
اعلائے کلمۃ الحق	۲ر	تذکرہ احرار اسلام	۱۲ر	خطبۂ صدارت تحریری	۴ر
افغان بادشاہ	۸ر	ترکی میں مغربی ومشرقی کشمکش	عار	خطبۂ صدارت تقریری	ار
امتحان کامل	عہ	تعمیر نو	۸ر	خطبۂ صدارت مولانا محمد علیؓ	۴ر
انسانی قربانیاں	۸ر	تقاریر گوکھلے	۱۲ر	خطبۂ صدارت مولانا محمود الحسنؒ	۲ر
انسداد [illegible]	۱۰ر	تقاریر محمد علی ۲ جلد	۸ر	خلافت اور مقاطعہ	۲ر
انسداد گداگری	۱۰ر	تلاش حق ۲ جلد	[illegible]	خلافت اور ہندوستان	۸ر
انقلاب افغانستان	۸ر	تلک مہاراج	ار	خواتین انگورہ قسم اول	عہ
انقلاب دہلی	۸ر	تاریخ کانگریس	۸ر	خوشحال ہندوستان	عہ
انقلاب [illegible]	عہ	ٹالسٹائی	۱۲ر	خون کے آنسو حصہ (۱)	۴ر
انقلاب فرانس (از عبدالرزاق)	۸ر	ٹالسٹائی کی کہانی	۸ر	خون ناحق	۸ر
انقلاب فرانس (از عبدالقادر)	۱۲ر	جاپان	عار	خیرالدین پاشا	۸ر
انقلاب روس (از انیس احمد)	۱۰ر	جانباز ترک	۸ر	دختران شمشیر	۸ر
انقلاب روس	عہ	جذبات احرار	۱۲ر	دختر سمرنا	۸ر
انقلاب فرانس (از باری)	۱۲ر	جذبات جوہر	۱۲ر	داستان زوال	۸ر
انقلاب میں کسانوں کا ہاتھ	۸ر	جذبات حریت	۸ر	داستان غدر	عہ
انقلابی افسانے	عہ	جلاوطنی کی داستان	۴ر	درس عمل	۵ر
انگورہ اور ترک	۱۲ر	جمال الدین افغانیؒ	۸ر	دعوت حق	۹ر
آہنگ رزم	۸ر	جمال الدین افغانی (از ظفر علی خاں)	۴ر	دنیا میں دوزخ	عہ
آئینہ جمہوریت	۴ر	جنگ آزادی	۸ر	دو خدائی خدمت گار	۱۲ر
آزادی کی جنگ (ریگ کے نادرہ نگاری)	۸ر	جنگ صلیب وہلال	۸ر	دولت غزنویہ	عار
افسانۂ ترکستان	عہ	جنگ طرابلس	۴ر	دیگر ممالک میں قطع تعلق	۱۰ر
بالشویک شہزادی	۴ر	جنگ نامہ اسلام	۸ر	رپورٹ کانگریس احمد آباد	عہ
بالشوی شہزادی	۴ر	جواب شکوہ	۴ر	روایات اسلام	۱۲ر
بالشویک جنرل	۸ر	جواہرات دستاویز آل انڈیا کانگریس لکھنؤ	۸ر	روح سیاست	۸ر
برطانیہ اور افغانستان کے تعلقات	۹ر	جواہر [illegible]	۳ر	روز ولٹ	۱۲ر
برہمن دیوتا	۸ر	چمن در خزاں	۴ر	روسی افسانے	عہ

ملنے کا پتہ

صدیق بک ڈپو۔ لکھنؤ ——— یا ——— اسکول بک ایجنسی نظیر آباد لکھنؤ

مجلس ندوۃ العلماء کا ماہوار رسالہ

الندوہ

جس کا مقصد

مسلمانوں کی تعلیمی اور تعمیری خدمت ہے

مرتبہ

سید ابوالحسن علی ندوی

استاذ تفسیر وادب

عبدالسلام قدوائی ندوی

استاذ تاریخ واقتصادیات

الندوہ

زیر نگرانی

علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ

جلد ۱ رمضان المبارک ۱۳۵۹ھ مطابق اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ء نمبر ۱۰

قیمت فی پرچہ تین آنے — سالانہ دو روپیے ۲ر

تمام خط و کتابت اور ترسیل زر حامد علی ندوی منیجر رسالہ الندوہ بادشاہ باغ لکھنؤ کے پتہ پر ہونی چاہئے

شذرات

الندوہ کے حلقے میں یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ سنی جائیگی کہ مولانا ابو بکر صاحب شیث ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے طویل علالت کے بعد وفات پائی۔ مولانا ایک عرصے سے علیل تھے۔ پہلے زبان کے ایک گوشہ میں معمولی تکلیف تھی جسنے بڑھتے بڑھتے آکلہ کی صورت اختیار کر لی۔ علاج معالجہ میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا گیا۔ یونانی، ویدک ہومیوپیتھک، ایلوپیتھک، ہر قسم کے طریق علاج کی آزمائش کیگئی۔ پٹنہ اور مدراس کے مخصوص طبی مرکزوں سے رجوع کیا گیا، اور مہینوں ان کے مشورے اور ہدایت کے مطابق علاج ہوتا رہا۔ لیکن "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" کم وبیش ایک سال تک دوا دوش کا یہ سلسلہ جاری رہا، مگر شفا مقدر میں نہ تھی۔ بالآخر ۲۲ ستمبر کو جان جان آفریں کے سپرد کی اور جونپور کے خاندانی قبرستان میں مدفون ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا ہندوستان کے مشہور دینی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ آپکے دادا مولانا سخاوت علی صاحب جونپوری ہندوستان کے مشہور مجاہد اور مصلح عظیم حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفۂ خاص تھے بالاکوٹ کے معرکہ میں سید صاحب اور ان کے رفقاء کی شہادت کے بعد اسلامی ریاست کے قیام کی کوئی قریبی امید باقی نہ رہی تھی مگر متبعین نے سید صاحب کی اصلاحی تحریک کو ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیلایا اپنے خون جگر سے اسکی آبیاری کی اور اسے کامیابی کی منزل تک پہونچایا۔ ان بزرگوں میں مولانا سخاوت علی صاحب کی ذات بہت نمایاں ہے۔ انھیں حضرات کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج ہندوستان کے ہر حصہ میں یہ اصلاحی خیالات نہ صرف پہونچ گئے ہیں بلکہ ان کی نشر اشاعت کیلئے بڑے بڑے مرکز قائم ہوگئے ہیں۔ مولانا ابو بکر صاحب مرحوم کی بچپن سے اسی ماحول میں تربیت ہوئی، اس کا اثر تھا کہ یہ اصلاحی خیالات زندگی کا مقصد بن گئے۔ جونپور کے اطراف وجوانب میں اس سلسلہ میں ان کی متعدد یادگاریں ہیں۔

مولانا کے اخلاق و عادات کے متعلق کچھ لکھنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کون ہے جو ایک مرتبہ بھی انکی خدمت میں حاضر ہوا ہو اور ان کے حسن اخلاق کا غیر معمولی نقش لیکر نہ اٹھا ہو، راقم الحروف کو بارہا حاضری کی سعادت حاصل ہوئی۔ اور ہمیشہ دلپر مولانا کی محبت و شفقت کے غیر فانی نقوش ثبت ہوئے۔ مرحوم کی زندگی کیا تھی علم و عمل، ایمان و اخلاص، زہد و تقویٰ، عصمت، پاکیزگی، خلق، مروت، رافت و رحمت، ایثار و ہمدردی اور انکسار و فروتنی کی مجسم تصویر تھی۔ سخاوت فیاضی اور دوست نوازی و اعزہ پروری کے قصے سنے تھے لیکن مولانا کی ذات میں اسکی زندہ مثال نظر آئی، آپکا گھر ہر شخص کے لئے خانۂ بے تکلف تھا، جو آتا اپنا گھر سمجھکر آتا، اور اپنا گھر سمجھکر رہتا۔ اکثر مہمان مہینوں بلکہ شاید برسوں قیام کرتے لیکن مولانا کا حسن خلق اور انکی کرم فرمائیاں انھیں کبھی اجنبیت محسوس نہ ہونے دیتیں۔ جس سے ملتے اس بشاشت اور خندہ جبینی سے ملتے کہ وہ ان کا گرویدہ ہو جاتا۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنی رحمتوں سے سرفراز فرمائے۔

ان صفحات میں مجلس ترقی عربی کا ذکر ہو چکا ہے۔ عربی زبان کی نشر و اشاعت اس انجمن کا خاص مقصد ہے ستمبر کے آخری عشرہ میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی صدارت میں اس مجلس کا ایک مشورتی جلسہ دارالعلوم کی عمارت میں منعقد ہوا۔ اس موقع پر درس قرآنی کے حلقوں کی مفید تجویز منظور ہوئی۔ اُمید ہے کہ انجمن کے ارکان اپنے اپنے حلقوں میں اس تجویز پر عمل کریں گے۔ انجمن کے پرجوش ناظم مولوی محفوظ الرحمٰن صاحب اسکے کاموں کو آگے بڑھانے کی جد و جہد کر رہے ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ اسلامی علوم و فنون سے تعلق رکھنے والے حضرات موصوف کا ہاتھ بٹائیں گے۔

تصحیح

ستمبر کے الندوہ میں انعامی مقابلہ کے سلسلہ میں "وحید احمد" کا نام غلطی سے چھپ گیا ہے اسکے بجائے "فضل الرحمٰن سیوانی متعلم مدرسۂ عربیہ نگرام ضلع لکھنؤ" ہونا چاہیئے۔

میری محسن کتابیں

از جناب نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی

روز مرہ کا مشاہدہ ہے کہ باغبان تخم بونے سے پہلے اُسکے مناسب زمین کا انتخاب کرتا ہے. انتخاب کے بعد زمین کو تیار کرتا ہے خس و خاشاک سے پاک و صاف۔ جب اصل زمین تیار ہو لیتی ہے تو اسمیں عمدہ تخم تلاش کرکے ڈالتا ہے پھر تخم کی زمین میں حفاظت کرتا ہے. اُسکے ماحول کو ناروا خس و خاشاک سے پاک صاف رکھتا ہے سیرابی سے اُسکی نشو و نما کو مدد پہونچاتا ہے اس اہتمام سے وہ پودا تناور درخت ہو جاتا ہے جو اپنے سایہ اور پھل سے ایک عالم کو فیض پہونچاتا ہے۔

بعینہٖ یہی مثال ایک طالب علم اور اسکے ذوق و استعداد علمی کے نشو و نما کا ہے. سب سے مقدم اُسکے باطن کا رذیل خصلتوں سے اور بداخلاقیوں سے پاک صاف ہونا ہے. باطن کی صفائی علمی اثرات کے قبول و بارآور ہونے کی ضامن ہے طالب علم کی صفات پر سب سے اول اثر گھر کے ماحول کا ہوتا ہے. اسکے بعد استاد کی صحبت کا جسمیں تعلیم و تربیت اخلاق دونوں شامل ہیں. بالآخر خود طالب علم کی اُس جد و جہد کا جو وہ خود اپنی تربیت میں کرے۔

یہ تمام اہتمام گویا زمین علم کی تیاری کا تھا. پھر مناسب طبیعت علم کا انتخاب گویا تخم کا انتخاب ہے. درس و تعلیم اس تخم کی نشو و نما اور بارآور ہونے کی سعی ہے۔

اس ضروری تمہید کے بعد عرض ہے کہ خودستائی نہیں اظہار واقعہ ہے کہ میں نے جس فضا میں آنکھ کھولی وہ فضا الحمد علمی دینی و ادبی تھی. میرے عم محترم مولوی عبدالشکور خاں صاحب مرحوم نے (جو میرے مُربّی تھے اللہ کی رحمتیں ہوں اُن پر) علوم عربیہ کی تحصیل ملا حسن تک کی تھی. مولانا سید عالم علی صاحب محدث مرادآبادی ہفتوں بعض اوقات مہینوں بھیکن پور میں قیام فرما رہتے تھے. وجہ قیام زیادہ تر معالجہ امراض ہوتا. عم محترم حدیث میں ان کے شاگرد بھی تھے اور سنا ہے کہ مُرید بھی. مولانا محمد لطف اللہ صاحبؒ بھی اکثر تشریف فرما ہوتے. مولانا فیض الحسن صاحب

سہانپوری بھی کرم فرماتے۔ علیٰ ہذا القیاس۔

دوسرا سلسلہ مولوی عبدالغفور خاں صاحب نقشبندی مجددی کا گھر بھر مرید تھا۔ ذکر کے حلقے اندر باہر برابر ہوتے۔ مولوی سید حضور احمد صاحب سہوانی مرحوم کے مواعظ میں مثنوی مولانا روم کی گرمی تاثیر اسقدر تھی کہ قرن گذر جانے پر بھی طبیعت اب تک اس کا احساس رکھتی ہے ایک بڑی سعادت یہ تھی کہ میرے جد امجد محمد خان زمان خاں صاحب نے (جنکو شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھی) میاں امین الدین صاحب پیرزادہ کے ذریعہ شاہ اسحٰق صاحب مرحوم محدث دہلوی سے شادی وغمی کی رسموں کے متعلق فتویٰ حاصل کیا تھا جو مسائل اربعین کے نام سے مشہور ہے اسکے مطابق اپنے برادر معظم حاجی محمد داؤد خاں صاحب مرحوم کی سرپرستی میں رسوم خاندان کی اصلاح فرمائی تھی جو بفضلہ تعالیٰ بہت کچھ اب تک جاری ہے۔ اس طرح ہمارا گھر فضول رسوم سے پاک صاف تھا اور کسی رسم کا اہتمام میں نے اپنے گھر میں نہیں دیکھا۔

میرے والد مرحوم کو ادب اردو اور تاریخ فارسی کا ذوق تھا۔ ایک انتخاب سراپا سخن کے نام سے شائع کیا تھا جسمیں سراپا کے متعلق اردو شعرا کے کلام کا انتخاب تھا۔ تاریخ میں تاریخ فرشتہ، سیر المتاخرین، تزک جہانگیری، روضۃ الصفا، زیر مطالعہ رہیں۔ شب کے کھانے سے پہلے اور دوپہر کو سوتے وقت لیٹ کر کتاب دیکھتے۔ فرماتے تھے روضۃ الصفا کے وزن سے سینہ دکھنے لگتا تھا۔ اپنی صحبتوں میں تاریخی واقعات بیان فرماتے۔

یہ تھی وہ فضا جسمیں میں نے آنکھ کھولی اور جو آج تک بحمد اللہ آنکھوں کے سامنے ہے اور جس کے سامنے کوئی دوسری فضا فروغ نہیں پا سکی۔

آمدم برسر مطلب۔ سب سے اول جس کتاب کو خود پڑھا وہ مرزا غالب کی اردوئے معلی تھی۔ والد مرحوم نے دیکھنے کو عنایت فرمائی تھی۔ یہ سمجھئے کہ کتاب دیکھنے کے شوق کی یہی بنیاد تھی۔ محض ابتدائی عمر تھی۔ پوری طرح سمجھتا بھی نہ تھا تاہم دیکھے جاتا تھا۔ اس سے ایک ادبی ذوق کا پیدا ہونا یقینی احساس تھا۔

عم محترم کی صحبت میں فقہ اور دینی مسائل کی تحقیق و بحث رہتی تھی، رسمی مناظروں سے اور انکے انداز سے ہمیشہ احتراز رہا۔ اس کا اثر بھی میری طبیعت قبول کرتی تھی۔

استاد بھیں حسب ذیل ہیں:۔

قرآن کریم۔ (حدیث) کنز العمال (اسکی جامعیت نے اثر ڈالا) مقالات الاسلامیین امام ابو الحسن اشعری (عقائد) رجال میں ابتداءً بستان المحدثین شاہ عبد العزیز صاحب دہلویؒ دیکھی۔ ازالۃ الخلفاء شاہ ولی اللہ صاحبؒ، ابن خلکان، تذکرۃ الحفاظ امام ذہبی طبقات ابن سعد (تصوف) معارف ابن قتیبہ، مقدمہ شرح البخاری امام ابن حجر عسقلانی۔ حالات مرزا مظہرؒ از شاہ غلام علیؒ۔ حالات شاہ غلام علیؒ از شاہ عبد الغنی صاحب مجددیؒ فوائد الفواد خواجہ حسن دہلویؒ سلسلۃ العارفین ملفوظات خواجہ عبید اللہ احرارؒ، فتوح الغیب حضرت غوث اعظمؒ۔ الانتباہ فی سلاسل اولیا اللہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ، ملفوظات حضرت پیر و مرشد مولانا فضل رحمٰن قدس سرہٗ (از مولانا سید محمد علی صاحب و مولوی سید نور الحسن خاں) زبدۃ المقامات خواجہ محمد ہاشمؒ، مدارج السالکین شرح منازل السائرین از حافظ ابن القیمؒ۔ کتاب الروح ایضاً، اعلام الموقعین ایضاً۔

اردو۔ اردوئے معلی، عود ہندی مرزا غالب۔ تذکرۂ آبحیات، دربار اکبری میر محمد حسین آزاد دہلوی مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم، المامون، شعر العجم مولانا شبلی۔

تاریخ فارسی۔ واقعات بابری، تاریخ فرشتہ، تزک جہانگیری۔

یہ امر قابل اظہار ہے کہ مذکورۂ بالا کتابوں میں بعض ایسی بھی ہیں جنکا کوئی حصہ بوقت ضرورت دیکھا اور پڑھا تاہم اُس کا اثر دل و دماغ پر گہرا ہوا۔

رمضان المبارک

از ابوالحسن علی ندوی

(یہ تقریر مولانا موصوف نے لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے دیہاتی پروگرام کے تحت نشر کی تھی اور ڈائرکٹر صاحب آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ کی اجازت سے شائع کی جاتی ہے)

جیسے پہلے بتایا گیا کہ جیٹھ، اساڑھ وغیرہ ہندی مہینوں کے نام ہوتے ہیں اسی طرح رمضان ایک اسلامی مہینہ کا نام ہے، اس مہینہ میں روزہ رکھنے کا حکم ہے۔

"تم میں سے جو شخص اس مہینہ کو پائے اسکو روزہ رکھنا چاہئے" (قرآن مجید)

نیز "جو بیمار ہو یا سفر میں ہو اس کو چاہئے کہ بیماری اور سفر ختم ہو جانے پر اپنے روزے پورے کرلے" (قرآن مجید)

روزہ کیا ہے؟ اپنے آپ پر قابو رکھنے کی مشق! تاکہ ہم میں برائی سے بچنے کی طاقت پیدا ہو اور نیکی کرنے کی عادت پڑے۔ یہ مشق اس طرح کیجاتی ہے کہ صبح سویرے سے لیکر شام کے سورج ڈوبنے تک کھانا پینا چھوڑ دیتے ہیں، یہ اسلئے کہ دن بھر اپنے کام کاج، لین دین، ملنے جلنے اور دنیا و دین کی باتوں کے کرنے میں بھوک کی تکلیف ہم کو یہ یاد دلاتی رہے کہ یہ دن اور یہ مہینہ ہمارے دل کی صفائی، خیال کی پاکیزگی اور نیک عمل کی عادت ڈالنے کا مہینہ ہے اس میں کوئی ایسی بات نہ ہو جس سے ہمارے روزہ میں فرق پڑ جائے۔ جب تھوڑی سی سوجھ بوجھ اور چند دن کی مشق کے بعد ہم ہل چلانا اور کھیت جوتنا سیکھ لیتے ہیں اور عمر بھر کے لئے ہم کو یہ کام آجاتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک مہینہ کی لگاتار محنت کے بعد ہم اپنے آپکو اللہ میاں کے بتلائے ہوئے راستہ پر نہ چلا سکیں۔

پھر اپنے دل کو قابو میں رکھنے کیلئے دوسری مشق یہ کیجاتی ہے کہ اُن چیزوں کو بھی اپنے بس میں رکھیں جو دل کو بہکانیوالی ہیں، انمیں آنکھ، کان، منھ، زبان اور ہاتھ پیر سب شامل ہیں۔ بہت سی برائیاں ایسی ہوتی ہیں جو آنکھوں کے

راستے دل میں اُتر جاتی ہیں بہت سی ایسی ہیں جو کانوں کے راستے دماغ میں پہونچکر ہماری عقل کو بیکار کردیتی ہیں بہت سی ایسی ہیں جو ہماری زبان کی پیداوار ہوتی ہیں، کچھ ایسی بھی ہیں جو ہمارے ہاتھوں جنم لیتی ہیں اور ہم خود اپنے پیروں چل کر ان تک پہونچتے اور ان کو اپنے سر لے لیتے ہیں۔ اسی لئے کھانے پینے کو چھوڑ دینے کے بعد روزہ کا دوسرا کام ان راستوں کی حفاظت اور ان سب پر ایمان کو سپاہی بنا کر بٹھانے کی مشق ہے تاکہ برائیاں ہمارے دل تک نہ پہونچیں۔

تم نے یہ تو سن لیا کہ روزہ ہو کیا! اب یہ بھی سن لو کہ روزہ رکھا کیسے جاتا ہے؟ روزہ رکھنے کی ترکیب یہ ہے کہ پچھلے پہر اُٹھکر تھوڑا بہت کھا پی لینا چاہئے پھر زبان یا دل سے سویرا ہونے پر نیت کرنی چاہئے کہ میں اللہ کے حکم پر رمضان شریف کے اس دن کا روزہ رکھتا ہوں نیت کر لینے کے بعد پو پھٹنے سے لیکر سورج ڈوبنے تک نہ کچھ کھانا پینا چاہئے نہ عورت کے پاس جانا چاہئے۔ جھوٹ بولنے، غیبت کرنے، غصہ کرنے، گالی بکنے، بری نظر سے کسی کو دیکھنے اور بری باتوں کے سننے سے روزہ مکروہ ہو جاتا ہے ان باتوں سے بچنا چاہئے جب سورج ڈوب جائے تو یہ کہکر کہ "یا اللہ میں نے تیرے لئے روزہ رکھا ہے تجھپر ایمان لایا ہوں، تجھپر بھروسہ رکھتا ہوں، تیری دی ہوئی چیز (روزی) سے روزہ کھولتا ہوں شیطان سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں اور اللہ کے نام سے کھانا شروع کرتا ہوں" کچھ کھا پی لینا چاہئے۔ اب روزہ پورا ہو گیا اسوقت سے لیکر صبح پو پھٹنے تک کھانے پینے اور عورت کے پاس جانے کی اجازت ہے۔ رات کا وقت جہانتک ہوسکے نماز پڑھنے قرآن پڑھنے یا سننے اور اللہ کا نام لینے میں گذارنا چاہئے۔ صبح سے پھر اسی طرح جیسا کہ ابھی بتلایا ہے دوسرا روزہ شروع کرنا چاہئے۔ رمضان بھر اسی طرح روزے رکھے جاتے ہیں اور برائی سے بچنے اور نیک کام کرنے کی مشق کیجاتی ہے بہت سے لوگ اسی مہینہ میں اپنی اپنی زکوٰۃ بھی نکال دیتے ہیں۔

روزہ رکھنے کی ترکیب تو ہم نے بتلا دی، اب ہم یہ بھی بتلائے دیتے ہیں کہ کن باتوں سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے آدمی بھولے سے کچھ کھا پی لے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا ہاں (۱) رات کے دھوکے میں دن نکل آنے پر سحری کھانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور اسکے بدلے دوسرا روزہ رکھنا پڑتا ہے (۲) سورج ڈوب جانے کے دھوکے میں دن رہے کچھ کھا پی لینے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور اسکے بدلے دوسرا روزہ رکھنا پڑتا ہے (۳) حلق کے نیچے دھوکے سے پانی اُتر جانے

ناک کے ذریعہ پی لینے، حقہ یا سگریٹ کا دھواں نگل لینے سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور اسکے بدلے دوسرا روزہ رکھنا پڑتا ہے
ہم بستر ہو جانے سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور اس کے بدلے دوسرا روزہ رکھنا پڑتا ہے۔

روزہ کیا ہے، کیوں رکھا جاتا ہے اور کیسے رکھا جاتا ہے؟ یہ باتیں تو ہم نے بتلا دیں، اب ہم یہ بات
اور بتلانا چاہتے ہیں کہ روزہ رکھنے یعنی رمضان کا مہینہ خرچ کرنے کا مطلب کیا ہے؟ ہر سال یہ بات دیکھنے میں آتی
ہے کہ جب ایک فصل ختم ہو کر دوسری فصل شروع ہوتی ہے تو ہم سب اپنے اپنے کھیت کی تیاری میں لگ جاتے ہیں کوئی ہل
چلاتا ہے کوئی پانی بھرتا ہے، کوئی بیج ڈالتا ہے، کوئی پانی دیتا ہے پھر یہ بات بھی ہم جانتے ہیں کہ کھیت جتنا اچھا تیار
کیا جائے گا فصل اتنی ہی اچھی ہوتی ہے کہاوت بھی ہے کہ جتنا گڑ ڈالو گے اتنا میٹھا پاؤ گے جیسا بوؤ گے ویسا کاٹو گے
رمضان کا مہینہ ہماری ایمانی تیاری کا مہینہ ہے اس مہینہ میں ہم سب روزے رکھتے ہیں تاکہ ہمارے دل صاف
ہو جائیں، ہماری آنکھیں کھلی ہوں، ہماری برائیوں سے ہٹ کر نیکیوں کی طرف جھک جائے پھر اس حالت میں کہ ہم
دن بھر اپنے کھانے پینے پر قابو رکھ کر نفس اور پیٹ کو قابو میں کر چکے ہیں شام کو محلے ٹولے کے سب لوگ ایک جگہ اکٹھا ہوتے ہیں
اور ایک آدمی کو اپنا امام بنا کر خدا کے دربار میں حاضری دیتے ہیں پھر صف باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اسکی بڑائی کا
اقرار کرتے ہیں اسکی اطاعت و فرمانبرداری کا حلف اٹھاتے ہیں اور نیکی کے راستہ پر چلنے کی دعا مانگتے ہیں اسکے بعد
خدا کے حکموں کو سنتے ہیں اور یہ معلوم کرتے ہیں کہ اس نے کن باتوں کے کرنیکا حکم دیا ہے، کن باتوں سے روکا ہے اور کن
باتوں کو ہماری مرضی پر چھوڑ دیا ہے چاہے تو ہم ان کو کریں اور چاہے تو نہ کریں۔ اسمیں ایسی باتیں بھی بتلائی
جاتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ کی بات ماننے والوں اور اللہ کے بندوں کے ساتھ نیک سلوک کرنیوالوں کو کیا انعام
ملا اور اللہ کی نافرمانی کرنیوالوں اور اپنے سکھ کی خاطر اللہ کے بندوں کو دکھ دینے اور ان پر ظلم کرنیوالوں کا کیا حشر ہوا
اس سے یہ ہوتا ہے کہ نیکی کی محبت اور برائی سے نفرت کے ساتھ ہی ہمیں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ آنیوالے برس میں ہم کو کون کون سے
کام کرنے چاہئیں اور کن کن باتوں سے بچنا چاہئے۔ ہم دن بھر روزہ رکھتے ہیں کھانے پینے کی طرح جھوٹ،
چغلخوری، دغابازی، مارپیٹ، گالی گلوچ اور ساری بری باتوں کو چھوڑ دیتے ہیں اور رات کو نمازیں پڑھتے ہیں

(بقیہ صفحہ ۱۴ پر)

عربی مدارس
واجبات و فرائض

از سید ابوالحسن علی ندوی

مقصد کا تعین اور نصب العین کی بلندی

ذہنی تشکیل اور سیرت سازی کے سلسلہ میں ایک نہایت اہم اور مؤثر چیز مقصد کا تعین اور وضاحت اور نصب العین کی بلندی ہے۔ متعین اور واضح مقصد اور بلند نصب العین ہی وہ چیز ہے جو چستی اور نشاط اور زندگی کی حرارت پیدا کرتا ہے۔ قرآن حکیم نے اسی لئے جابجا مسلمانوں کو مخاطب کرکے ان کے ظہور کے بلند ترین مقاصد اور اعلیٰ نصب العین کو بار بار یاد دلایا ہے کنتم خیر امۃ (الآیہ) وکذلک جعلنکم امۃ وسطا لتکونوا شہداء علی الناس اور اسی لئے ان کے درخشاں مستقبل اور ان کی آیندہ کامرانیوں کا ذکر کیا ہے تاکہ انکی افسردگی مردہ دلی اور نا امیدی دور ہو کہ یہ جماعت کی زندگی کے لئے سم قاتل ہے ولا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین (آل عمران) وعد اللہ الذین امنوا منکم وعملوا الصلحت لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم (سورۂ نور) سورۂ یوسف سورۂ قصص اور سورۂ روم و سورۂ فتح کو غور سے پڑھئے اور جن صبر آزما، یاس انگیز اور بظاہر تاریک حالات میں یہ سورتیں نازل ہوئیں ان کو پیش نظر رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سورتوں میں بھی مسلمانوں کے درخشاں مستقبل کی طرف اشارات ہیں تفصیل و تشریح کا یہ موقع نہیں۔

علامہ اقبال مرحوم نے اسرار خودی میں مقصد کی تابندگی اور بلندی اور اسکے نفسیاتی اور اجتماعی اثرات سے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ قوموں کی زندگی کے عمیق مطالعہ پر مبنی ہے۔

عربی مدارس کے طلبہ کے متعلق عام شکایت ہے کہ انمیں غیر معمولی افسردگی اور زندگی کی ایک خاص بے کیفی نظر آتی ہے۔ اسکا جواب مختلف طریقوں پر دیا جاتا ہے کبھی خاص ماحول طریق رہائش اور نصاب طرز تعلیم کی خشکی کا عذر کیا جاتا ہے، ممکن ہے کہ بعض معترضین اس جواب سے مطمئن ہو جاتے ہوں اور ممکن ہے کہ اس افسردگی میں ان چیزوں کو

بھی مثال ہوسکتی ہے، دیکھا اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ان طلبہ کے سامنے کوئی متعین اور واضح پروگرام
کوئی مقصد اور روشن راستہ، ترقی پسند حوصلہ افزا مستقبل اور کوئی بلند نصب العین نہیں، وہ نظر اٹھاتے ہیں تو
ان کو سامنے اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے جس سے بجز مایوسی، شک اور ارادوں میں شدید تذبذب اور ذہن
میں سخت الجھاؤ ہوتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کوئی امنگ، بلند نظری اور ولولہ کا سامان نہیں پیدا کرسکتا۔
دینی مدرسہ کا وہ ذہین اور باصلاحیت طالب علم جو اپنے متعلق زیادہ سے زیادہ یہ سوچ سکتا ہے کہ وہ فراغت کے بعد کسی مطب
یا مطب کسی قصبہ یا شہر میں قسمت آزمائی کرے گا، یا کسی سرکاری اسکول میں مدرس عربی یا فارسی (مولوی) کی جگہ حاصل
کرنے کے لئے دوڑ دھوپ کرے گا اور اس کا علمی ذوق، مطالعہ، علوم و معارف سب اسی مدرسہ کے حدود تک ہیں اس کے بعد
وہ اس کی کشمکش، زندگی کی تنگ اور بے کیف زندگیاں ہیں، غیر علمی اور غیر دینی ماحول ہے۔ اس سے سرگرمی اور
حوصلہ اور خود اعتمادی کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے؟ اپنی حقارت کا اندرونی احساس اپنے خاندان یا ہم عمر انگریزی
تعلیم یافتہ نوجوانوں سے (جن کا مستقبل بھی کچھ زیادہ روشن نہیں) تقابل اور ذہنی و اخلاقی مرعوبیت جو سراسر ناواقفیت
کی بنا پر ہے انہیں مزید افسردگی اور بے اعتمادی پیدا کرتی رہتی ہے۔

اس کا ایک ہی علاج ہے اور وہ یہ کہ ان کو ان کی قیمت بتائی جائے، ان کو بتایا جائے کہ وہ کس اہم اور مقدس
کام کے لئے تیار ہو رہے ہیں، ان کی زندگی کا نصب العین کس قدر بلند اور ان کا مطمح نظر کتنا اعلیٰ ہے، دنیا کی تاریخ میں
صحابہ کرام اور مجددین امت کے علاوہ کسی جماعت کا جو بلند سے بلند نصب العین رہا ہے ان کا نصب العین اس سے کہیں
بلند ہے اور آج بھی دنیا کے مختلف ممالک میں جتنی جماعتیں خواہ وہ سیاسی ہوں یا اصلاحی و معاشرتی کام کر رہی ہیں
اور بلند مقاصد رکھتی ہیں ان کے مقاصد بھی ان کے مقاصد کے مقابلہ میں کہیں فروتر اور پست ہیں۔

کیا خدا کے نام لیوا بندوں کو خدا کا پیغام پہنچانا، پیغمبر خاتم کے احکام کی تبلیغ، کیا تہذیب اخلاق اور تزکیہ نفوس کی
خدمت ان سیاسی انجمنوں کے مقاصد سے فروتر ہے جو حشرات الارض کی طرح زمین کے گوشہ گوشہ میں پھیلی ہوئی ہیں، اور
جن کے کارکنوں میں زیادہ جوش اور زندگی ہے؟ کیا اخلاق و اجتماع و سیاست کے آسمانی نظام کے قیام و تاسیس کا

پیغمبرانہ فریضہ اور انسانی زندگی کی وحی الٰہی کے مطابق تشکیل، کسی اشتراکی، قومی، سیاسی تحریک سے کم درجہ کا کام ہے! اور کیا اسلام اور مسلمانوں کی نشات ثانیہ کی عظیم الشان اور مجددانہ تحریک کسی تحریک اصلاح مذہب اور "ریفارم" سے پست تر ہے! پس اگر حقیقت طلبہ کے یہی مقاصد ہیں (اور حقیقتاً ان کے یہی مقاصد ہونے چاہئیں) اور وہ انھیں کاموں کے لئے تیار ہو رہے ہیں تو ان کو اپنی قسمت پر ناز ہونا چاہیئے۔ ان کا سر اونچا، ان کا دل ولولوں سے معمور، ان کو جوش و مستی سے مخمور اور افسردگی اور دل مردہ دلی کو ان سے دور ہونا چاہیئے۔ ان کو اپنے علوم کی شرافت اور ان معارف کی عظمت پر غور کرنا چاہیئے جنکی دولت سے اللہ نے ان کو مالا مال کیا ہے وہ اگرچہ دنیا کی دولت سے تہی دامن ہیں لیکن علم کی دولت سے تہی سینہ نہیں ؎

برخود نظر کشا زتہی دامنی مرنج — در سینۂ تو ماہ تمامے نہادہ اند

اور اگر ان کے یہ مقاصد اور ان کے سامنے کام کا یہ نقشہ نہیں تو ہم کو ان کے حال پر رحم آتا ہے اور ان کی زندگی کی بربادی اور ناکامی پر تعزیت کا موقع ہے کہ اس سے بڑھکر خسر الدنیا والآخرۃ ذٰلک ھو الخسران المبین کا مصداق کوئی نہیں، وہ اپنی تعلیم کے جس مرحلہ پر بھی ہیں ان کو اپنی جگہ بدل دینی چاہئے، عربی مدارس کے بجائے انگریزی اسکولوں اور کالجوں کا رُخ کرنا چاہیئے کہ ان کے لئے زندگی کے اس پست نصب العین کے ساتھ عربی مدارس میں نامرادی و ناکامی حسرت و یاس اور نوحہ و ماتم کے سوا کچھ نہیں۔ ہم صفائی کے ساتھ کہدینا چاہتے ہیں کہ عربی مدارس کا ہرگز یہ کام نہیں کہ وہ کسی خاص زبان یا علوم کی تعلیم دیں، یا زمانہ کی چلتی ہوئی مشنری میں فٹ ہونے کیلئے پرزے ڈھالیں، یہ کام جن فیکٹریوں میں ہوتا ہے ان کو وہاں کا رُخ کرنا چاہیئے۔

عربی مدارس کے طلبہ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ان کے سامنے بہت بڑا کام ہے، دین اسوقت سخت کسمپرسی اور غربت کی حالت میں ہے ملک کی تمام غیر مذہبی تربیت یافتہ جماعتوں نے مذہب کی تحریف و تخریب پر کمر باندھ لی ہے علماء اور ان جماعتوں کے خلاف جو مذہب کے اصلی نظام کے محافظ ہیں ہر جگہ بغض و عداوت کی آگ روشن ہے اور اس بارہ میں عوام اور انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں میں عجیب نادر الوقوع اتحاد ہو گیا ہے۔ قد بدت البغضاء

یہ افوا جمة ما تخفی صدورهم اکبر ان کہ ان اشخاص اور جماعتوں کی مرضی کے خلاف زندہ رہنا ہو اور شریعت کو زندہ رکھنا ہے انسانوں کی خواہشات اور زمانے کے رجحانات کے برخلاف اور خود اہل مذہب کی سرد مہری بلکہ مخالفت کے باوجود کسی مذہبی اخلاقی روحانی اور تعمیری نظام کو قائم کرنا یا اسکی حفاظت کرنا آسان کام نہیں، انہیں افسردگی اور پژمردگی کا کیا گزر، اسکے لئے فرہاد کا جگر اور قیس کا جنون چاہیے!

لیکن ان ہمت شکن حالات سے ان کو قطعاً مایوس نہیں ہونا چاہیے ظہور اسلام کی محیر العقول تاریخ کے علاوہ جسکا انھوں نے مطالعہ کیا ہے بیسویں صدی کی اس پہلی تہائی کی تاریخ ان کی ہمت افزائی کے لئے کافی ہے اس عرصہ میں دنیا میں متعدد غیر معقول اور بظاہر ناممکن العمل تحریکیں شروع ہوئیں لیکن اپنے کارکنوں کی انتھک کوششوں اور قربانیوں سے وہ حیرت انگیز طریقہ پر کامیاب ہوئیں اور انھوں نے بڑے بڑے وسیع نظام اور عظیم سلطنتیں قائم کرلیں۔ کیا اسلام کی تحریک کسی انقلابی سیاسی یا اقتصادی تحریک سے زیادہ ناممکن العمل ہے؟ ہم اسکو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں!

(بقیہ صفحہ ۱)

خدا کا کلام سنتے ہیں اور دعائیں کرتے ہیں کہ ہم سے کسی کو دکھ نہ پہونچے، ہم برائی کے پاس نہ جائیں اور کوئی ایسا کام نہ کر بیٹھیں جس سے ہم کو شرم معلوم ہو یا پڑوس کے رہنے والوں کو شکایت ہو اور اللہ میاں ناراض ہو جائیں یہ سارا مہینہ اسی طرح گذرتا ہے اور ہم رات دن دل کی صفائی اور روح کی طاقت بڑھانے میں لگے رہتے ہیں، جو لوگ اس وقت کو سمجھ بوجھ کر گذارتے ہیں اور ایک محنتی کسان کی طرح اپنے من کی کھیتی میں عبادت کا ہل چلا کر نیکی کا بیج بو دیتے ہیں ان کی کھیتی سال بھر تک خوب پھلتی پھولتی ہے اور وہ بہت سا ثواب پاتے ہیں۔

دیکھنا یہ ہے کہ ہم میں سے کس کی تیاری اچھی ہوتی ہے اور کون اللہ کے حکم پر چل کر اس سنسار کو جہاں ہر طرف دکھ ہی دکھ دکھائی پڑتا ہے سکھ کا سندیسہ دیتا ہے اور لوگوں کو سکھی بنانے کی کوشش کرکے اللہ کی مرضی کو پورا کرتا ہے۔

محدثین کا حیرت انگیز حافظہ

از مولانا احمد اللہ صاحب مددی دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن

منکرین حدیث کی جانب سے حدیث کی صحت و وثوق پر جو شبہات پیش کئے جاتے ہیں اسکی سب سے بڑی وجہ یہ ہو کہ وہ اپنے حافظہ پر پچھلے بزرگوں کے حافظوں کو قیاس کرتے ہیں حالانکہ انکے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اس مضمون میں اسی شبہ کا جواب دیا گیا ہے اور تاریخ کے مستند واقعات سے محدثین کی غیر معمولی قوت حفظ و ضبط کو ثابت کیا گیا ہے۔ امید ہو کہ قارئین الندوہ کے حلقے میں یہ مضمون دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ آئندہ اشاعت میں حدیث کے تحریری سرمایہ کا ذکر کیا جائے گا تاکہ اس غلط فہمی کا بھی ازالہ ہو جائے کہ حدیثیں تیسری صدی میں تحریری شکل میں مرتب کی گئی ہیں۔ (ادارہ)

اسلام کے علاوہ دوسری شریعتوں کے حاملین نے اپنی مذہبی کتابوں کی حفاظت کے لئے صرف تحریر پر اعتماد کیا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مرور ایام کے بعد وہ کتابیں اپنی ابتدائی اصلی حالت پر باقی نہیں رہیں، لیکن امت اسلامیہ نے کتاب الٰہی اور حدیث نبوی کو تحریف اور لفظی اختلاف سے محفوظ رکھنے کے لئے صرف ظاہری تحریر پر اکتفا نہ کی بلکہ حافظے کے ذریعے اُن کو اپنے دلوں میں نقش کالحجر بنایا جسکی وجہ سے قرآن شریف اور احادیث نبویؐ جو شریعت اسلامیہ کا ماخذ ہیں کسی تحریف اور تغیر کے بغیر ابتک اپنی اصلی حالت پر باقی ہیں۔

امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے حفاظ حدیث کے حالات میں ایک مبسوط کتاب تذکرۃ الحفاظ تصنیف کی ہے۔ خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں اور ابن جوزی نے المنتظم میں حفاظ حدیث کے جستہ جستہ حالات قلمبند کئے ہیں دوسرے اکابر تراجم نگار نے بھی اس جماعت کے حالات اور سوانح پر کافی روشنی ڈالی ہے، انھیں کتابوں سے یہ مضمون مرتب کیا گیا ہے۔

صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں بعض صحابی حدیث شریف کو قلمبند فرمایا کرتے تھے۔ جیسے عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہما جن کا مجموعۂ احادیث صادقہ کے نام سے مشہور ہے مگر ان تحریری کوششوں کے ساتھ حفظ وضبط کا بھی بہت زیادہ رواج تھا صحابۂ کرامؓ اور ان کے شاگردوں کو ہزاروں حدیثیں یاد تھیں۔

ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب تلقیح فہوم الاثر میں ہر ایک صحابی کی روایات کی تعداد تفصیل سے لکھی ہے ذیل کے اعداد سے اس کا ایک سرسری اندازہ ہو سکتا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے	۵۳۷۴
حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے	۲۶۳۰
حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے	۲۲۸۶
ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے	۲۲۱۰
حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے	۲۶۶۰
حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے	۱۵۴۰
حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے	۱۱۷۰

احادیث مروی ہیں۔

ان کے علاوہ باقی صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے جو احادیث مروی ہیں ان کی تعداد ایک ایک ہزار سے کم ہے۔ یہ روایات جس طرح ان کے حافظوں میں محفوظ تھیں اسکا اندازہ ذیل کے واقعات سے کیا جاسکتا ہے

۱۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حافظہ مشہور ہے۔ ایک دفعہ مروان حاکم مدینۂ منورہ نے آپکے حافظہ کا امتحان لینے کے لئے پس پردہ ایک زودنویس شخص کو بٹھا دیا اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمائش کی کہ وہ حدیثیں سنائیں چنانچہ وہ حدیثیں سنانے لگے اور پردہ کے پیچھے بیٹھنے والے شخص نے لکھنا شروع کیا جب کافی تعداد میں حدیثیں سنا چکے تو مجلس برخاست ہوئی۔ کچھ مدت کے بعد مروان نے پھر مجلس

منعقد کی اور حضرت ابوہریرہؓ سے فرمائش کی کہ پہلی مجلس میں جو حدیثیں سنا چکے ہیں ان کو دوبارہ دُہرائیں آپ حدیثیں سنانے لگے اور پردہ کی اوٹ میں بیٹھنے والے کاتب نے مکتوبہ حدیثوں سے مقابلہ شروع کیا، مقابلہ میں ایک حرف کا بھی فرق نہ پایا۔

۳۔ حضرت امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ متوفی ۲۵۶ھ کو ایک لاکھ صحیح اور دو لاکھ غیر صحیح حدیثیں زبانی یاد تھیں، انھوں نے اپنی کتاب صحیح بخاری کو چھ لاکھ سے زیادہ حدیثوں سے تخریج کیا ہے، اسمیں کل ۷۲۷۵ حدیثیں ہیں اور اگر مکرر حدیثوں کا لحاظ نہ کیا جائے تو ان کی تعداد ۴۰۰۰ رہجاتی ہے۔ آپنے اپنی صحیح کو سولہ سال کی مدت میں تصنیف فرمایا اور جب ایک حدیث کتاب میں لکھتے تھے تو دو رکعت نماز ادا فرماتے تھے۔

آپکے حافظہ کے متعلق حاشد بن اسمٰعیل اور ایک شخص کا بیان ہے کہ امام بخاری اپنی کم سنی کے زمانے میں حدیث کی سماعت کے لئے ہمارے ساتھ جایا کرتے تھے۔ ہم حدیثیں لکھتے تھے مگر وہ کچھ نہ لکھتے۔ اس پر ہم انھیں ٹوکا کرتے تھے، کچھدن اسی طرح گذر گئے۔ ایک روز ہم دونوں کے ٹوکنے پر امام بخاری نے فرمایا آپ دونوں بہت کچھ مجھے کہہ چکے اچھا آپنے جو کچھ لکھا ہے مجھے دکھلائیے، ان کے کہنے پر ہمارے پاس جس قدر حدیثیں لکھی ہوئی تھیں اُن کے سامنے پیش کر دیں، امام صاحب نے ان کو دیکھکر پندرہ ہزار مزید حدیثیں، جو دوران سماعت میں لکھنے سے رہگئی تھیں پڑھکر سنائیں اور کہا کہ آپکا خیال ہے کہ حدیث کی سماعت کے لئے میں فضول جایا کرتا اور اپنے دن گنواتا ہوں۔

ان دونوں بزرگوں کا بیان ہے کہ اس روز ہمیں معلوم ہوا کہ امام صاحب پر کوئی سبقت نہیں لے جاسکتا ہے۔

صاحب اکمال نے امام صاحب کے حافظہ کے متعلق ایک دوسرا اہم واقعہ بیان کیا ہے وہ لکھتے ہیں ایک دفعہ امام بخاریؒ بغداد تشریف لائے، اصحاب حدیث کو اسکی اطلاع ہوئی، ان حضرات نے آپکے حافظہ کا امتحان لینے کے لئے سو حدیثوں کے متن اور اسناد کو الٹ پلٹ کرکے ہر ایک حدیث کا متن دوسری حدیث کی اسناد

نے ماتھ وصل کیا اور دس آدمیوں کو دس دس حدیثیں دیں اور یہ ہدایت کی کہ جب اصحاب حدیث مجلس میں پہونچ جائیں تو وہ ان حدیثوں کو ایک ایک کرکے امام بخاری کے سامنے پیش کریں۔ چنانچہ جب اصحاب حدیث مجلس میں مجتمع ہوئے اور سکون طاری ہو گیا تو ان مخصوص دس آدمیوں میں سے ایک شخص نے امام صاحب کی خدمت میں ایک حدیث پیش کی، امام صاحب نے فرمایا میں اس حدیث کو نہیں جانتا، پھر اس نے دوسری اور تیسری یہاں تک کہ دس حدیثیں جو اسکے پاس تھیں پیش کیں اور امام صاحب نے ہر حدیث کے متعلق فرمایا کہ میں اس حدیث کو نہیں جانتا۔ آپکے اس انکار کی حقیقت کو علماء سمجھ گئے، مگر عوام نہ سمجھے۔ بعدازاں دوسرے شخص نے اپنی دس حدیثیں ایک ایک کرکے پیش کیں اسی طرح دس آدمیوں نے سو حدیثیں جو اس مجلس کے لئے تیار کی گئی تھیں سنائیں اور امام بخاری نے سب کے جواب میں یہی کہا کہ میں اس حدیث کو نہیں جانتا اور اسکے سوا کچھ نہ بولے۔ جب سب کے سوالات ختم ہو چکے تو امام صاحب پہلے شخص کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ تمہاری پہلی حدیث اس طرح ہے اور دوسری اس طرح واقع ہوئی ہے اور پھر بقیہ حدیثوں کی صحت فرمائی اور متن کو اصل اسناد سے وصل کرکے واضح فرمایا۔ بعدازاں باقی نو آدمیوں کی حدیثوں کی صحت فرمائی۔ یہ ماجرا دیکھکر سبھوں نے آپکے سامنے آپکے حفظ اور فضل کا اعتراف کیا۔

۴۔ شیخ الاسلام ابن الانباری متوفی ۳۲۸ھ قوت حافظہ میں یکتائے روزگار تھے۔ ابوعلی قالی فرماتے ہیں کہ ابن الانباری کو تین لاکھ اشعار قرآن پاک کے شواہد میں بزبان یاد تھے۔ ابوعلی تنوخی کہتے ہیں کہ ابن الانباری برابر زبانی املا کراتے تھے اور کتاب دیکھ کے کبھی املا نہ کرایا۔ محمد بن جعفر تمیمی کا قول ہے کہ میں نے ابن الانباری سے زیادہ کسی کو قوت حافظہ کا مالک نہیں دیکھا۔ ابن الانباری کہا کرتے تھے کہ مجھے تیرہ صندوق کتابیں زبانی یاد ہیں ان کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انھیں تفسیر کی ایک سو بیس کتابیں مع اسناد زبانی یاد تھیں۔ ابن الانباری نے بکثرت کتابیں تصنیف کیں اور اپنی تمام تصانیف کو اسناد کے ساتھ زبانی املا کرایا۔ یہ بہت بڑے نحوی بھی تھے امام ذہبی نے اپنی کتاب تذکرۃ الحفاظ میں حفاظ حدیث کے سلسلے میں ان کا نام شمار کیا ہے۔

۵۔ ابو زرعۃ رازی رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۲۶۴ھ فرماتے ہیں، مجھے دو لاکھ حدیثیں اسطرح زبانی یاد ہیں جس طرح کوئی شخص قل ہو اللہ احد کی سورۃ یاد رکھتا ہے، اور وقت مذاکرہ تین لاکھ حدیثیں مجھے زبانی یاد رہتی ہیں۔ ابو زرعۃ رازی فرماتے ہیں کہ پچاس برس میں جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ سب میرے گھر میں محفوظ ہے اور لکھنے کے بعد میں نے ان کا دوبارہ مطالعہ نہیں کیا ہے تاہم مجھے معلوم ہے کہ وہ سب کس کتاب، کس ورق کس صفحہ اور کس سطر میں، مرقوم ہیں اور جو کچھ علمی باتیں میں اپنے کانوں سے سنتا ہوں میرا دل اُن کو یاد کرلیتا ہے اور جب میں بغداد کے بازار میں چلتا ہوں اور جھروکوں سے گانیوالیوں کی آوازیں سنتا ہوں تو فوراً کانوں میں انگلیاں ڈال لیتا ہوں اس ڈر سے کہ میرا قلب ان گانوں کو یاد نہ کرلے۔

ابو زرعۃ رازی کے حافظہ کی ستائش میں حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صحیح حدیثیں سات لاکھ ہیں جنمیں سے اس نوجوان یعنی ابو زرعۃ رازی کو چھ لاکھ حدیثیں زبان یاد ہیں۔

محدث ابو بکر ابن شیبہ فرماتے ہیں کہ میں نے قوت حافظہ میں ابو زرعۃ سے برتر کسی کو نہیں دیکھا۔

مشہور محدث راہویہ کا قول ہے کہ جس حدیث کو ابو زرعۃ نہ جانتے ہوں اسکی کوئی اصلیت نہیں ہے۔

۶۔ ابو الحسن دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۳۸۵ھ "حافظ زماں" کے وصف سے یاد کئے جاتے ہیں۔ مشہور محدث حاکم کا قول ہے کہ دارقطنی قوت حفظ میں یکتائے زمانہ ہیں۔ ایک دفعہ دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ اپنی نوعمری میں اسمٰعیل صفار کی مجلس میں حاضر ہوئے اسوقت صفار حدیث کا املا کرا رہے تھے، یہ بھی بیٹھ گئے اور ایک جزو لکھنے لگے کسی نے انھیں ٹوکا اور کہا۔ میاں! اس نوعمری میں آپکی سماعت تو درست نہیں آپ کیسے لکھ رہے ہیں، دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا کہ املا کے لئے میری سمجھ آپکی سمجھ سے مخالف ہے، کیا آپ زبانی بتا سکتے ہیں کہ شیخ نے کتنی حدیثیں املا کرائی ہیں؟ معترض نے کہا میں نہیں بتا سکتا، آپنے فرمایا کہ اسوقت شیخ نے اٹھارہ حدیثیں املا کرائی ہیں پہلی حدیث یہ ہے اور دوسری یہ، اسی طرح تمام حدیثوں کو مشرح زبانی بیان فرمایا، یہ سن کر سب کو تعجب ہوا۔

خطیب بغدادی تاریخ بغداد میں دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں بیان فرماتے ہیں کہ میں نے برقانی سے پوچھا کہ دارقطنی نے علل حدیث کو تمہیں زبانی لکھوایا تھا؟ برقانی نے جواب دیا ہاں! میں نے دارقطنی کی علل حدیث کو جمع کیا ہے اور لوگوں نے میرے ہی نسخہ سے پڑھا ہے۔

۔ ابونعیم جرجانی متوفی ۳۲۳ھ حافظ حدیث تھے۔ انھیں موقوف اور مرسل حدیثیں اس طرح زبانی یاد تھیں جس طرح حفاظ حدیث کو مسند حدیثیں یاد ہوتی ہیں۔ (المنتظم)

۸۔ ابن السقا متوفی ۳۷۱ھ حافظ حدیث تھے۔ دارقطنی اور ابن مظفر فرماتے ہیں کہ ہم نے ابن السقا کے پاس کوئی کتاب نہیں دیکھی بلکہ وہ ہم سے زبانی حدیثیں بیان کرتے تھے۔

۹۔ ابن عقدہ متوفی ۳۳۲ھ حافظ حدیث تھے۔ انھیں ایک لاکھ حدیثیں اسناد کے ساتھ زبانی یاد تھیں۔

۱۰۔ ابوحامد ابن الشرقی متوفی ۳۲۵ھ امام مسلم کے شاگرد تھے، قوت حافظہ میں اپنے زمانہ میں فرد مانے جاتے تھے۔ ابن عدی کہتے ہیں کہ میں نے ابوحامد ابن الشرقی سے زیادہ قوت حافظہ رکھنے والا کسی کو نہیں دیکھا۔ نیز وہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایوب سختیانی کی احادیث کا مجموعہ جسے ابن الشرقی نے جمع کیا تھا ان کے سامنے پڑھنا شروع کیا۔ میں کتاب دیکھ کے پڑھتا تھا اور ابن الشرقی میرے ساتھ ساتھ اول سے آخر تک زبانی پڑھتے چلے گئے۔

۱۱۔ امام ابوجعفر عقیلی متوفی ۳۲۲ھ حافظ حدیث تھے۔ مسلمہ بن قاسم کا بیان ہے کہ عقیلی جلیل القدر اور عظیم المرتبت شخص تھے، ان کی مانند میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ محدثین میں سے جو عقیلی کے پاس آتا وہ فرماتے کہ اپنی کتاب پڑھو لیکن وہ خود اپنی اصل نہیں نکالتے تھے، اس بات پر ہم لوگوں میں گفتگوئیں ہوئیں اور ہم کہنے لگے کہ عقیلی یا تو سب سے زیادہ حافظہ کے مالک ہیں اور یا وہ سب سے زیادہ جھوٹے ہیں۔ ایک روز ہم سب انکی مجلس میں شریک ہوئے اور میں کتاب پڑھنے لگا، جس وقت حدیث میں کمی یا بیشی کے الفاظ میں پڑھتا وہ

لکھ جاتا اور مجھ سے کتاب اور قلم لیکے اپنے حافظہ سے اسکی اصلاح فرمادیتے، جب ہم ان کے پاس سے واپس ہوتے تو ہمارے دل مسرور تھے اور اسوقت ہمیں معلوم ہوا کہ وہ حافظ میں سب سے بڑھے ہوئے ہیں (تذکرہ)

۱۲۔ ابوبکر ابن ابوداؤد سجستانی متوفی ســـہ حافظ حدیث تھے۔ ان کی قوت حفظ کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ایک دفعہ وہ عمرو بن الیث کے عہد میں سجستان پہونچے، ان کے گرد اصحاب حدیث کا مجمع ہوا اور ان سے درخواست کی گئی کہ حدیث بیان فرمائیں انھوں نے انکار کیا اور فرمایا کہ میرے پاس کتاب نہیں ہے، مجمع نے ازراہِ تعجب کہا۔ ابن ابوداؤد اور کتاب؟ وہ فرماتے ہیں کہ ان لوگوں نے مجھے اسقدر ابھارا کہ بالآخر تیس ہزار حدیثیں انھیں زبانی لکھوادیں۔ (المنتظم جلد ۶)

۱۳۔ ابونعیم متوفی [illegible]ھ حافظ حدیث تھے، ابوعلی فرماتے ہیں کہ ابونعیم اماموں میں ایک امام تھے میں نے ابن خزیمہ کے بعد خراسان میں ان کی مانند کسی کو نہیں دیکھا انھیں موقوف اور مرسل حدیثیں اسی طرح ازبر تھیں جس طرح ہم مسند احادیث دل میں یاد رکھتے ہیں۔ (تذکرہ)

۱۴۔ ابوبکر ابن زیاد متوفی [illegible]ھ حافظ حدیث تھے۔ حاکم ان کی شان میں لکھتے ہیں کہ فقہیات اور اختلاف صحابہ تمام لوگوں سے زیادہ انھیں یاد ہیں، دارقطنی فرماتے ہیں کہ میں نے ابوبکر ابن زیاد سے بڑھکر کسی کو حافظ حدیث نہیں دیکھا، انھیں متون حدیث میں الفاظ کی زیادتی کا علم تھا۔ جب یہ حدیث بیان کرنے بیٹھتے تھے تو اہل مجلس کہتے حدث یعنی آپ حدیث بیان فرمائیے مگر ابوبکر ابن زیاد فرماتے بل سلوا انتم یعنے تم خود پوچھو، لوگ ان سے احادیث کے متعلق سوالات کرتے، یہ جواب دیتے اور املا کرادیتے تھے۔

۱۵۔ ابوالحسن القطان متوفی [illegible]ھ حافظ حدیث تھے۔ ان کا بیان ہے کہ مجھے ایک لاکھ حدیثیں زبانی یاد ہیں۔

۱۶۔ الختلی، حافظ حدیث تھے۔ خطیب بغدادی کا بیان ہے کہ انھیں پچاس ہزار حدیثیں یاد ہیں۔ اور یہ اپنے حافظہ سے حدیث کا املا کراتے تھے۔

۱۷۔ ابوعمر الزاہد متوفی [illegible] یہ لغت میں زیادہ درک رکھتے تھے اسلئے یہ لغوی کہے جاتے ہیں۔ حافظ حدیث بھی تھے۔ ان کے حافظہ کی یہ حالت تھی کہ لغت میں تیس ہزار ورق کا املا زبانی کرایا۔ حافظہ کی اس وسعت کی وجہ سے لوگوں نے انھیں متہم بھی کیا۔

۱۸۔ اسحاق بن راہویہ حافظ حدیث تھے۔ ایک دفعہ انھوں نے امام بخاریؒ کے سامنے اپنے حافظہ کی تعریف میں کہا "گویا میں اپنی کتاب کی ستر ہزار حدیثیں اپنے دل میں دیکھ رہا ہوں"۔ امام بخاریؒ نے برجستہ جواب دیا "شاید تمہیں اتنی سی بات پر تعجب ہو۔ اس زمانے میں ایک ایسا شخص موجود ہے جو اپنی کتاب کی دو لاکھ حدیثیں یاد رکھتا ہے۔" امام بخاریؒ کی مراد اس سے اپنی ذات تھی۔

۱۹۔ ابواحمد العسال متوفی ۳۴۹ھ حافظ حدیث تھے۔ ابن مردویہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ابواحمد العسال کو کہتے ہوئے سنا کہ مجھے قرات کے متعلق پچاس ہزار حدیثیں یاد ہیں۔ العسال کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ایک بہت بڑی تفسیر اپنے حافظہ سے املا کرائی ہے۔ ایک دفعہ انھوں نے اردستان میں چالیس ہزار حدیثیں املا کرائیں۔ جب وہ اپنے شہر واپس ہوئے اور املا شدہ حدیثوں کا مقابلہ کیا تو اصل کے مطابق پایا۔

۲۰۔ ابن طاہر الاصبہانی متوفی [illegible] حافظ حدیث تھے۔ قوت حافظہ میں یہ نشانی سمجھے جاتے تھے۔ پہلے انھوں نے تمام مسند حدیثوں کو یاد کیا۔ پھر موقوف حدیثیں یاد کیں۔

۲۱۔ شیخ الاسلام ابواسمٰعیل ہروی متوفی ۴۸۱ھ حافظ حدیث تھے۔ انھیں بارہ ہزار حدیثیں زبانی یاد تھیں۔

۲۲۔ ابوسعد ابن البغدادی متوفی [illegible] کو پوری صحیح مسلم زبانی یاد تھی۔ اور احادیث کا املا اپنے حافظہ سے کراتے تھے۔

۲۳۔ ابن النحاس مصری متوفی ۴۱۶ھ حافظ حدیث تھے جب انکی حدیث کی کتابیں ضائع ہوگئیں تو یہ برسوں اپنے حافظہ کی مدد سے حدیث بیان کرتے رہے۔ ان کے حفظ، صدق، اور تحدث کی تصدیق حاکم نے کی ہے

---

۲۴. ابن بکر متوفی [illegible]ھ حافظ حدیث تھے، الازہر کا بیان ہو کہ میں ابن بکر کے پاس رہا کرتا تھا انکے پاس احادیث کے کچھ اجزا تھے میں ان کو دیکھا کرتا تھا ایک دن انھوں نے مجھ سے فرمایا، دو باتوں میں سے کونسی بات تمھیں پسند ہو؟ تم ان اجزا، کے متن مجھ سے بیان کرو میں ان کی اسناد بیان کروں اور یا اسنا دسناؤں میں متن بتاؤں۔ الازہر کہتے ہیں میں احادیث کے متن ان سے بیان کرتا اور وہ اسناد از برسناتے اور اس طرح کئی بار میں نے عمل کیا.

۲۵. ابو بکر الاسفراینی متوفی [illegible]ھ ان کے متعلق حاکم شہادت دیتے ہیں کہ امام مالک رح، امام ثوری رح شعبہ اور مسعر کی بیس ہزار سے زیادہ حدیثیں زبانی یاد تھیں.

۲۶. امام احمد بن حنبل رض متوفی ۲۴۱ھ کے متعلق ابو زرعۃ فرماتے ہیں کہ انھیں دس لاکھ حدیثیں حفظ تھیں

۲۷. حضرت مسلم بن الحجاج متوفی ۲۶۱ھ اپنی کتاب صحیح مسلم کی بابت ارشاد فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی صحیح کو تین لاکھ سنی ہوئی حدیثوں سے تصنیف کیا ہے.

آپکے اس ارشاد سے یہ معلوم نہ ہوسکا کہ آپ کو کس قدر حدیثیں زبانی یاد تھیں، قیاس غالب یہی ہو کہ یہ سب تین لاکھ حدیثیں آپکو زبانی یاد ہوں گی کیونکہ آپکا حافظہ بہت مشہور ہو، آپکی صحیح مسلم میں چار ہزار حدیثیں ہیں جنمیں مکرر کا شمار نہیں ہے.

جامعہ ازہر

(۶)

از حافظ محمد عمران خاں صاحب ندوی متخصص جامعہ ازہر

گذشتہ نمبروں میں ازہر کا نصاب تعلیم و نظام اداری تفصیل پیش کیا جا چکا ہے جس سے ہر معہد اور کلیہ کے متعلق ضروری معلومات معلوم ہو جاتی ہیں۔ اب ہم ازہر کی بالائی تنظیم یعنی "ہائی کمانڈ" کے متعلق تفصیل پیش کریں گے اسکو تین نمبروں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے

۱ شیخ الازہر

۲ جماعت کبار العلماء

۳ مجلس الاعلیٰ

ذیل میں ہم ہر ایک کے اختیارات بیان کریں گے۔

(۱) شیخ الازہر

شیخ الازہر کی شخصیت نہ صرف ازہر کی سب سے بڑی صاحب اختیار شخصیت ہو بلکہ پوری سلطنت مصر میں سب اعلیٰ دینی عہدہ ہے اور اس حیثیت سے تمام علما اور رجال دین اس سے درجہ میں کم ہیں۔ وہ تمام علما کی شخصی سیرت کا ناظر اعلیٰ ہو خواہ وہ علما ازہر کے ملازم ہوں یا نہوں۔

ازہر کے تمام قوانین شاہی فرمان اور حکومت قراردادوں کے اجرا کے تمام اختیارات صرف شیخ الازہر کو ہیں ازہر کے تمام علما و ملازمین اسکے احکام کے بجالانیوالے اور اسکے اوامر کے پابند ہیں۔

قانون ۲۶ برائے ۱۹۳۶ء میں شیخ الازہر کے اختیارات کا تذکرہ دفعہ ۱۰ میں اسطرح ہو۔

شیخ الجامع الازہر ھو الامام الاکبر لجمیع رجال الدین و المشرف الاعلیٰ علی السیرۃ الشخصیۃ الملائمۃ لشرف العلم و الدین بالنسبۃ الی اھل العلم و حملتہ

القرآن الشریف سواء کانوا منتمین الی الازھر ام غیر منتمین الیہ وھو المنفذ الفعلی العام لجمیع القوانین والمراسیم والاوامر الملکیۃ واللوائح والقرارات المختص بالجامع الازھر والموظفون تابعون لہ بھذہ الصفۃ وخاضعون لاوامرہ۔

شیخ الازہر کا انتخاب "جماعت کبار علماء" میں سے ہوتا ہے اور اس کا تعین شاہی فرمان سے ہوتا ہے۔

شیخ الازہر کا ایک نائب ہوتا ہے جس کو وکیل شیخ الازہر کہتے ہیں۔ اسکا تقرر بھی شاہی فرمان سے ہوتا ہے۔

وکیل شیخ الازہر، شیخ الازہر کی موجودگی میں اسکے کاموں میں بحیثیت نائب کے اسکی امداد کرتا ہے اور شیخ کی عدم موجودگی میں وہ اسکی قائم مقامی کرتا ہے۔

شیخ الازہر کی پوزیشن اپنے یہاں یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی طرح سمجھنا چاہئے، لیکن اس حیثیت سے وہ ممتاز ہے کہ اسکی پوزیشن سرکاری طور پر پوری سلطنت مصریہ میں بلند و بالا ہوتی ہے، بخلاف ہماری یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر کے کہ اسکی پوزیشن قانونی صرف حدود یونیورسٹی کے اندر ہوتی ہے۔

شیخ الازہر کا تعین کسی خاص مقررہ مدت کے لئے نہیں ہوتا ہوسکتا ہے کہ وہ برسہا برس شیخ الازہر رہے اور ہوسکتا ہے کہ کسی اختلاف کی بنا پر جو اسکے اور بادشاہ کے درمیان میں رونما ہو مستعفی ہو جائے۔ یہ چیز بھی قابل لحاظ ہے کہ ازہر حکومت مصریہ کے ماتحت نہیں ہے۔ بخلاف جامعہ مصریہ اور دوسری تعلیم گاہوں کے کہ وہ وزارت تعلیم کے ماتحت ہوتی ہیں۔

حکومت مصر ایک مقررہ امداد سالانہ ازہر کو دیتی ہے لیکن شیخ الازہر وزیر تعلیم کے سامنے جواب دہ اور اسکے احکام کا پابند نہیں ہے، بلکہ ازہر خود ایک مستقل حکومت کے مثل ہے۔ شیخ الازہر براہ راست بادشاہ مصر کا ماتحت ہوتا ہے اس لحاظ سے شاہ مصر ازہر کے چانسلر یا رکٹر ہیں، یہ وہ فخر ہے کہ جو خود مصر میں دوسری بڑی سے بڑی تعلیم گاہوں کو بھی حاصل نہیں ہے، اور یہی سبب ہے کہ ازہر کے اعلیٰ درجہ کی سندوں پر (جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے) شاہ مصر کے دستخط ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں غالباً نامناسب نہ ہوگا اگر ازہر کے موجودہ شیخ الازہر کا مختصر تذکرہ اس جگہ کر دیا جائے۔

موجودہ شیخ الازہر

اس وقت شیخ الازہر صاحب الفضیلۃ الامام الاستاذ الاکبر الشیخ مصطفیٰ المراغی ہیں۔

جامع ازہر کے قیام سے لیکر اس وقت تک جو جو علماء شیخ الازہر ہوئے ہیں ان کے اسماء مع سنہ وفات یا معزولی یا استعفیٰ درج کئے جاتے ہیں۔ تاریخی حیثیت سے غالباً یہ بہت دلچسپ معلومات ہوں گے

سب سے پہلے شیخ الازہر شیخ ابو عبداللہ محمد الخرشی متوفی سنہ ۱۱۰۱ھ (۲) شیخ محمد ابراہیم بن محمد البرماوی متوفی سنہ ۱۱۰۶ھ

(۳) شیخ محمد النشرتی سنہ ۱۱۲۰ھ　　(۴) شیخ عبدالباقی القلینی (تاریخ وفات کا پتہ نہ چل سکا)

(۵) شیخ محمد شنن سنہ ۱۱۳۳ھ　　(۶) ابراہیم بن موسیٰ الفیومی سنہ ۱۱۳۷ھ

(۷) شیخ عبداللہ بن محمد بن عامر الشبراوی سنہ ۱۱۷۱ھ　　(۸) شیخ محمد بن سالم الحفنی سنہ ۱۱۸۱ھ

(۹) شیخ عبدالرؤف السجینی سنہ ۱۱۸۲ھ　　(۱۰) شیخ احمد بن عبدالمنعم الدمنہوری سنہ ۱۱۹۰ھ

(۱۱) شیخ احمد العروسی سنہ ۱۲۰۸ھ　　(۱۲) شیخ عبداللہ بن حجازی الشرقاوی سنہ ۱۲۲۷ھ

(۱۳) شیخ محمد الشنوانی سنہ ۱۲۳۳ھ　　(۱۴) شیخ محمد بن احمد العروسی سنہ ۱۲۴۵ھ

(۱۵) شیخ احمد بن علی الدمہوجی سنہ ۱۲۴۶ھ　　(۱۶) شیخ حسن بن محمد العطار سنہ ۱۲۵۰ھ

(۱۷) شیخ حسن القویسنی سنہ ۱۲۵۵ھ　　(۱۸) شیخ احمد بن عبدالجواد سنہ ۱۲۶۳ھ

(۱۹) شیخ ابراہیم الباجوری سنہ ۱۲۷۷ھ　　(۲۰) شیخ مصطفیٰ بن احمد العروسی سنہ ۱۲۸۷ھ معزول

(۲۱) شیخ محمد المہدی العباسی معزول سنہ ۱۲۹۹ھ　　(۲۲) محمد بن محمد بن حسن الانبابی معزول سنہ ۱۲۹۹ھ

(۲۳) شیخ محمد المہدی العباسی مستعفی سنہ ۱۳۰۴ھ　　(۲۴) شیخ محمد بن محمد بن حسن الانبابی مستعفی سنہ ۱۳۱۲ھ

(۲۵) شیخ حسونہ النواوی مستعفی سنہ ۱۳۱۷ھ　　(۲۶) شیخ عبدالرحمٰن القطب النواوی ایک ماہ سنہ ۱۳۱۷ھ

(۲۷) شیخ سلیم البشری مستعفی سنہ ۱۳۲۰ھ　　(۲۸) شیخ علی بن محمد الببلاوی مستعفی سنہ ۱۳۲۳ھ

(۲۹) شیخ عبدالرحمٰن الشربینی مستعفی سنہ ۱۳۲۴ھ　　(۳۰) شیخ حسونہ النواوی (دوبارہ) مستعفی سنہ ۱۳۲۷ھ

(۳۱) شیخ سلیم البشری (دوبارہ) سنہ ۱۳۳۵ھ　　(۳۲) شیخ محمد ابوالفضل الجیزاوی متوفی سنہ ۱۳۴۶ھ

(۳۳) صاحب الفضیلۃ الشیخ مصطفیٰ المراغی مستعفی سنہ ۱۳۴۸ھ　　(۳۴) شیخ محمد الاحمدی الظواہری مستعفی سنہ ۱۳۵۴ھ

(۳۵) صاحب الفضیلۃ الاستاذ الامام مصطفیٰ المراغی موجودہ شیخ الجامع الازہر متع اللہ المسلمین بطول بقائہ

شیخ مراغی قصبہ مراغہ ضلع جرجا میں ۱۸۸۱ء میں پیدا ہوئے۔ سن شعور کے بعد ازہر میں داخل ہوئے اور ۱۹۰۴ء میں شہادۃ العالمیۃ ازہر سے حاصل کی، اسوقت شیخ کی عمر ۲۳ سال تھی، ازہر کے سب سے پہلے مصلح مفتی عبدہ امتحانات ازہر کی کمیٹی کے صدر تھے۔ شیخ مراغی کی غیر معمولی ذہانت اور قابلیت نے مفتی عبدہ کو مسحور کر لیا۔ مفتی عبدہ کو مردم شناسی میں بڑا ملکہ تھا، خصوصیت سے شیخ مراغی کی طرف توجہ کی اور خاص شاگرد بنا لیا۔ سوڈان میں قضاء شرعی کے لئے چند قاضیوں کی ضرورت تھی، اسمیں مفتی عبدہ نے شیخ مراغی کا انتخاب کیا اور دنقلہ میں اور اسکے بعد خرطوم میں قاضی ہو گئے۔ شیخ مراغی کی فراست، ہوشمندی، ذکاوت کے جوہر اس جگہ خوب کھلے، ان کے انصاف و معاملہ فہمی نے افسروں کو مجبور کیا کہ ان کو پورے سوڈان کا قاضی القضاۃ بنا دیا جائے۔

۱۹۰۸ء سر ایم کارڈ کی معیت میں (جو محکمۂ عدل و انصاف کے سکریٹری سوڈان میں تھے) شیخ کے ذمہ یہ کام کیا گیا کہ نئی بنیادوں پر شرعی عدالتوں کا نظام اور شرعی قانون بنائیں۔ اس زمانہ کی بات لوگوں کو یاد رہ گئی کہ قانون کی ایک دفعہ پر شیخ اور سکریٹری کا اختلاف ہوا اور ۱۲ مہینہ تک جاری رہا، شیخ برابر اپنی رائے پر مُصر رہے آخر کار جب معاملہ اوپر بڑھا تو شیخ کی رائے کو صحیح و قابل عمل تسلیم کیا گیا۔ کسی مسئلہ کو حق سمجھ لینے کے بعد اُس پر سختی کے ساتھ قائم رہنے کی یہ مثال پہلی نہ تھی، شیخ کا یہی وہ کیرکٹر ہے جسکی بنا پر سمجھدار اور قدر جاننے والے انگریز اب تک شیخ کی اصابت و استقلال رائے کے معترف ہیں، اسکے بعد سوڈان سے پنشن لیکر واپس آ گئے۔ مصر میں جماعۃ کبار علماء کے ممبر ہوئے، اسکے بعد خود مصر میں شرعی عدالتوں کے قاضی القضاۃ مقرر ہوئے اور شرعی عدالتوں کی اصلاح و تہذیب میں بیش قیمت خدمتیں انجام دیں۔ بالآخر ۱۹۲۸ء میں شیخ الازہر ہوئے اور اصلاح ازہر کی طرف متوجہ ہوئے۔

یہ بات ازہر کے حلقہ میں بالکل نئی تھی کہ شیخ نے قیام سوڈان کے زمانہ میں انگریزی بھی سیکھی اور یہ وہ پہلے شیخ الازہر تھے جو عربی کے سوا کوئی دوسری زبان خصوصاً یورپین زبان جانتے تھے۔ ۱۹۲۹ء میں ازہر کے ایک قانون کے سلسلہ میں شیخ مراغی اور شاہ فواد مرحوم کا اختلاف پیدا ہوا، شیخ چونکہ یہ سمجھتے تھے کہ وہ حق پر

ہیں اسلئے انھوں نے استعفا دیدیا۔

اسکے بعد ۲۰ اپریل ۱۹۶۷ء کو دوبارہ ازہر کی شہور اسٹرائک اور شیخ احمدی ظواہری کے استعفے کے بعد شیخ الازہر مقرر کئے گئے۔ اسوقت سے آجتک ازہر کی اصلاح کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جسمیں ازہر نے محسوس ترقی نہ کی ہو۔

جو لوگ جنھوں نے ازہر کو ... سال پہلے دیکھا ہے یا اسکی حالت سے واقف ہیں اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ ازہر کی موجودہ حالت کئی گونہ اچھی اور بلند ہے شیخ نے ازہر کو اتنے بلند مرتبہ پر پہونچا دیا ہے جس کا تخیل کوئی دوسرا ازہری نہیں کرسکتا۔

ازہر کی یہ تمام ترقیاں شیخ مراغی کی ذہانت وذکاوت عقل وتدبر اور اصابت رائے کی مرہون منت ہیں

(۲) جماعت کبار العلماء

ازہر کے اکابر علماء کی جماعت کا نام ہے جسکی تعداد ۳۰ ہوتی ہے۔ اس جماعت میں داخلہ مجلس کے تین ربع ارکان کی اکثریت کے انتخاب کرنے اور شاہ مصر کی منظوری کے بعد ہوتا ہے۔ اس مجلس کا رئیس (صدر) شیخ الازہر ہوتا ہے۔ علماء جن کا انتخاب ہوتا ہے، ضروری ہے کہ ازہر میں پروفیسر کا درجہ رکھتے ہوں۔ اسکے ساتھ ساتھ ذیل کے شرائط بھی اسکے لئے ضروری ہیں جو عالم اس جماعت کی ممبری کے لئے منتخب ہوتا ہے ضروری ہے کہ:۔

(ا) کم سے کم اسکی عمر ۴۵ برس کی ہو۔

(ب) زہد وتقوی امانت ودیانت میں مشہور ہو اور کسی قابل اعتراض حرکت کا صدور اسکی گذشتہ زندگی میں نہ ہوا ہو

(ج) یہ کہ ازہر کی تخصص کی سند اس کے پاس ہو۔

(د) کسی کلیہ میں کم سے کم دس برس تعلیم دی ہو یا کم سے کم ۵ برس افتاء، قضاء شرعی یا کسی دوسرے علمی عہدے پر ازہر میں کام کیا ہو۔

(ہ) کسی کلیہ کے مقررہ نصاب میں سے کسی فن پر کوئی قیمتی کتاب لکھی ہو جس کو مصنف کے بحث

مناقشہ کے بعد، امبروں کی کمیٹی نے (جسے جماعت کبار علما، نامزد کرتی ہے) پاس کیا ہو۔

(و) جماعت کبار علما، کے تین ربع ارکان کی اکثریت اسپر متفق ہو

جماعت کے ہر ممبر کو ۳۰ پونڈ مصری (قریبًا ۴۲۰ روپیہ) ماہانہ تنخواہ ملتی ہے۔

ازہر کے اندرونی نظام میں اس جماعت کو کوئی دخل نہیں ہے البتہ شعبہ دعوت والارشاد کا سارا عملی نظام و پروگرام اسی جماعت کے ہاتھ میں ہو۔ پوری سلطنت مصر میں اسوقت جید اور قابل علما، اس کام کو انجام دے رہے ہیں۔ اور اشاعت اسلام سب سے بڑھکر حفاظت اسلام کی مضبوط بنیادیں اس نظام پر قائم ہیں اگر ازہر کی خدمات میں اس دعوت والارشاد کے سوا کوئی دوسرا کارنامہ نہ ہوتا تب بھی میں سمجھتا ہوں کہ ازہر اپنے دینی فریضہ سے عہدہ برآ تھا۔ مصر میں اس نظام کے پھیلانے سے جتنی دینی، معاشی، سیاسی، اصلاحات ہوئی ہیں ان کا تذکرہ تفصیلی طور پر کسی آیندہ صحبت میں ہوگا۔

دوسرا اہم کام اس جماعت کا مصر کے "نیاز فتچوریوں" اور "درباطن ہیچ علم کے دعویداروں" کی نگرانی اور سرکوبی ہے۔ قانون یہ ہو کہ اگر کسی عالم سے (غیر عالم کا سوال ہی نہیں ہو) کوئی ایسا عمل یا حرکت سرزد ہو جو علم و دین کے شایان شان نہو: مثلاً دین اسلام پر رکیک اور "دوسروں سے سنے سنائے" حملے کرے یا دین میں کسی ایسی بات کا انکار کرے جو بداہتہً مسلمان کے لئے ثابت ہو، یا کسی دوسری حرکات کے صدور کا مرتکب ہو تو شیخ الازہر کی صدارت میں جماعت کے ممبروں کے سامنے محاکمہ کے لئے پیش ہوگا بصورت ثبوت علما، کے زمرہ سے نکال دیا جائے گا اور اسکے تمام حقوق سوخت ہو جائیں گے اور اس امر کا اعلان کر دیا جائے گا کہ دینی اور دنیاوی کسی قسم کی کوئی ملازمت کوئی عہدہ کوئی خدمت اس کو نہیں دیجا سکتی۔ اگر وہ فعلاً ملازم ہے تو ملازمت سے علیحدہ کر دیا جائے گا، اور دفتری سزا اس کو پنشن کا حق سلب کر کے یا انعام کے حقوق سلب کر کے دیجائے گی اور اسکا اعلان سرکاری گزٹ میں کر دیا جائے گا۔ اور مصر کی کسی شرعی یا غیر شرعی عدالت میں۔

اس جگہ کی اپیل نہیں کی جا سکتی ۔

ایسے دینی سزا یافتہ مجرمین اس مدت کے دس سال گذرنے کے بعد اپنے معافی کی جماعت کے سامنے دوبارہ اس صورت میں پیش کرسکتے ہیں کہ جب وہ اپنے جرائم سے تائب ہو چکے ہوں اور اس کا ثبوت جماعت کو مل جائے تو وہ اس سزا کو ختم کرسکتی ہے اور ایسے عادی مجرمین جو اپنی توبہ کے بعد پھر مرتد ہو جائیں تو پھر دائمی طور پر مذکورہ بالا سزا کے مستحق ہیں اور ان کے معاملہ پر کبھی غور نہیں کیا جا سکتا ۔ یہ احترام دین اس مصر کا ہے جسے ہندوستان میں وہ دینی اعتبار سے کمتر سمجھا جاتا ہے

برخلاف اسکے ہمارا ملک جو یہاں پر جاہل ہر بدزبان ہر مرتد جو کچھ چاہے پوری آزادی کے ساتھ صرف دین و مذہب کے معاملہ میں ۔۔۔ یعنی پالٹکس، انجینئرنگ، ڈاکٹری وغیرہ کے جاہل کو اس فن سے متعلق کبھی اظہار رائے اور رائے بھی مجتہدانہ اظہار کرتے آپنے دیکھا ہے ؟ ———

کرسکتا ہے ۔ لکھ سکتا ہے اور اپنے ادبی رسالہ کے صفحات کو اپنے نامۂ اعمال کی طرح سیاہ کرسکتا ہے ۔ اور مسلمان ہیں کہ ایسے عادی مجرمین کے لئے بھی غیر مشروط طور پر عفو و تسامح اور چشم پوشی کا مطالبہ کرتے ہیں ۔ سبحان اللہ کیا دین ہے ۔ اور کیا حمیت دینی ؟

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است   باقی

حالاتِ ندوہ

انگریزی مدارس میں عموماً گرمیوں سے پہلے امتحانات ہوتے ہیں اور جولائی سے نئے سال کا آغاز ہوتا ہے لیکن عربی مدرسوں میں سالانہ امتحان شعبان کے مہینہ سے ہوتا ہے پھر رمضان کے بعد شوال سے نئے تعلیمی سال کا آغاز ہوتا ہے، دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بھی یہی اصول رائج ہے، چنانچہ امسال بھی ۱۲ شعبان سے امتحان شروع ہوا. اور ۲۶ کو بخیر و خوبی ختم ہوگیا. پانچویں جماعت تک کا نتیجہ اسی دن شائع کر دیا گیا، لیکن اوپر کی جماعتوں کا امتحان چونکہ باہر کے مشہور علماء کے سپرد ہوتا ہے اسلئے ان کا نتیجہ مرتب کرنے میں کسی قدر تاخیر لازمی ہے، انشاء اللہ وسط رمضان تک یہ نتیجہ بھی مرتب ہو جائیگا، اور تعطیل ختم ہونے سے پہلے طلبہ کو اطلاع مل جائے گی.

رسم ہے کہ آخری درجہ کے طلبہ کو امتحان کے بعددعوت دیجاتی ہے جسمیں موجودہ طلبہ اپنے فارغ ہونیوالے بھائیوں سے الوداعی ملاقات کرتے ہیں، امسال بھی یہ رسم ادا کی گئی. طلبہ کی مؤثر وداعی تقریروں کے علاوہ قاضی مسعود شاہ اور عبدالحفیظ قدوائی متعلم دارالعلوم نے دو پر اثر نظمیں پڑھیں، آخر میں جناب مولانا محمد عمران خاں صاحب نائب مہتمم د رالعلوم نے طلبہ کو بیش قیمت نصیحتیں فرمائیں.

جناب چودھری خلیق الزماں صاحب کے ندوہ اور ندویوں سے دیرینہ روابط ہیں، اس تعلق خاطر کی بنا پر کبھی کبھی آپ دارالعلوم تشریف لاتے رہتے ہیں. چنانچہ ۲۴ ستمبر کو خاص طور سے کرم فرمایا، طلبائے دارالعلوم کی انجمن الاصلاح کے زیر اہتمام ایک جلسہ ہوا جسمیں اسلام اور سوشلزم کے عنوان سے ایک تقریر فرمائی، ہمیں امید ہے کہ چودھری صاحب کی نوازشوں کا سلسلہ اسی طرح جاری رہیگا، اور وہ وقتاً فوقتاً طلبائے دارالعلوم کو اپنے خیالات سے مستفید فرماتے رہیں گے.

ستمبر کے آخری ہفتہ میں طلبائے قدیم کی مجلس منتظمہ کے جلسے ہوئے۔ سالانہ جلسہ کے متعلق طے پایا کہ دسمبر میں ہوگا۔ اس سلسلہ میں ضروری انتظامات کی اطلاع آئندہ دی جاسکے گی۔

ان صفحات میں وقتاً فوقتاً جناب شیخ محمد العربی کا ذکر آتا رہا ہے، موصوف کئی برس سے دارالعلوم میں عربی زبان کے استاد تھے، بچوں کی تعلیم و تربیت خصوصیت کے ساتھ ان کے سپرد تھی، پچھلے دنوں آل انڈیا ریڈیو لاہور نے آپکی خدمات حاصل کرلیں، چنانچہ آپ لاہور روانہ ہوگئے۔ دارالعلوم میں آپکی جدائی پر کافی تاسف محسوس کیا جارہا ہے، امید ہے کہ عرب صاحب اپنے دوستوں اور شاگردوں کو ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ اور مسافت کی دوری ان دونوں کی محبت میں حائل نہ ہوگی۔

آجکل کتبخانہ کا جائزہ ہو رہا ہے۔ مولانا سید ظہیر احمد ندوی اور ان کے نائب مولوی محمد انور ندوی روزانہ کئی گھنٹے ملازمین کتبخانہ کے ساتھ اس کام میں مصروف رہتے ہیں۔ امید ہے کہ وسط رمضان تک جائزہ ختم ہوجائے گا۔ جدید کتابوں کی خریداری کی سخت ضرورت محسوس کیجارہی ہے، لیکن مالی دشواریاں پریشان کن ہیں۔ امید ہے کہ ندوہ کے ہمدرد اپنی عنایت و توجہ سے ان دشواریوں کو دور فرمائیں گے۔

مبتدی طالبعلموں، کم پڑھے لکھے لوگوں، بچوں اور عورتوں کے لئے سیرۃ نبوی صلعم کی ایک ایسی مختصر سادہ اور آسان کتاب کی ضرورت تھی جسکے بیان میں کوئی الجھاؤ اور عبارت میں کوئی دقت نہو، پھر بیان مستند اور واقعات صحیح ہوں، اسی ضرورت کو سامنے رکھکر علامہ سید سلیمان ندوی نے **رحمت عالم** کے نام سے ایک مختصر سیرت لکھکر شائع کی اور اسکا سارا منافع دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں چھوٹے بچوں کا دارالاقامہ بنانے کیلئے وقف کردیا ہے۔ اہل خیر کو اسکی خریداری سے ان شاء اللہ تعالیٰ دوہرا ثواب حاصل ہوگا۔ قیمت فی نسخہ۔ بلا جلد ۶؎ مجلد ۸؎ علاوہ محصول

دارالمصنفین اعظم گڑھ یا جمعیۃ التعاون (کوآپریٹو سوسائٹی) دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے ملسکتی

رحمتِ عالم

مبتدی طالبعلموں، کم پڑھے لکھے لوگوں، بچوں اور عورتوں کے لئے سیرۃ نبوی صلعم کی ایک ایسی مختصر سادہ اور آسان کتاب کی ضرورت تھی جسکے بیان میں کوئی اُلجھاؤ اور عبارت میں کوئی دقت نہو، پھر بھی بیان مستند اور واقعات صحیح ہوں، اسی ضرورت کو سامنے رکھکر سیرت نگار نبوی سید سلیمان ندوی نے یہ مختصر سیرت لکھکر شائع کی اور اس کا سارا منافع دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں چھوٹے بچوں کے دار الاقامہ بنانے کے لئے وقف کر دیا ہے۔ یہ کتاب پانچ ہزار کی تعداد میں چھپی ہے، ضرورت ہے کہ ہر مسلمان بچہ کے ہاتھ میں اس کا ایک نسخہ ہو، اہل خیر کو اسکی خریداری سے انشاء اللہ تعالیٰ دوہرا ثواب حاصل ہوگا۔

قیمت فی نسخہ علاوہ محصول ڈاک۔ ایک روپیہ چار آنہ عہ ہے

لیکن ۲۰ نسخوں کے خریدار سے ایک روپیہ فی نسخہ کے حساب سے لیا جائے گا

مجلد کی قیمت ۲ ر فی نسخہ زائد ہوگی۔ علاوہ محصول

دار المصنفین اعظم گڈھ

جمعیۃ التعاون (کوآپریٹیو سوسائٹی)

دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے مل سکتی ہے ——

مجلس ندوۃ العلماء کا ماہوار رسالہ

الندوہ

جس کا مقصد

مسلمانوں کی تعلیمی اور تعمیری خدمت ہے

مرتبہ
سید ابوالحسن علی ندوی
استاذ تفسیر و ادب
عبدالسلام قدوائی ندوی
استاذ تاریخ و اقتصادیات

الندوہ

زیرِ نگرانی

علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ

جلد ۱　　شوال المکرم ۱۳۵۹ھ مطابق نومبر ۱۹۴۰ء　　نمبر ۱۱

قیمت فی پرچہ تین آنے　　　　سالانہ دو روپیہ ۲/-

تمام خط و کتابت اور ترسیل زر منیجر رسالۂ الندوہ بادشاہ باغ لکھنؤ کے پتہ پر ہونی چاہئے

شذرات

اس وقت جبکہ مسلمانوں میں ... کا احساس عام ہے، ضرورت ہے کہ تعلیم کی بنیادیں بھی استوار کی جائیں تاکہ ... کی دیواریں ... نئی دہلی کی آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس مستحق مبارکباد ہے کہ اس نے اس راہ میں عملی قدم بڑھایا ہے اور مسلمانوں کے تعلیمی مسائل کی تحقیق و تفتیش اور آئندہ لائحہ عمل کی ترتیب و تشکیل کی غرض سے ایک کمیٹی مقرر کی ہے، کمیٹی کے ارکان ملک کے مختلف تعلیمی مرکزوں کا دورہ کر رہے ہیں تاکہ مسلمانوں کے موجودہ تعلیمی حالات اور ان کی آئندہ ضروریات سے پوری واقفیت حاصل کر سکیں اور ان حقائق کی روشنی میں مستقبل کا لائحہ عمل مرتب کر سکیں۔

اس سلسلہ میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تعلیمی کمیٹی کے معزز ارکان کی خدمت میں یہ گزارش کی جائے کہ

خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

اسلام محض چند عقائد و خیالات یا چند عبادات کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایسا جامع اور ہمہ گیر مذہب ہے جو زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے اور دین و دنیا کا کوئی گوشہ اس کے دائرۂ اثر سے باہر نہیں۔ اسلام مذہب و اسٹیٹ کی تفریق سے ناآشنا ہے اور اسکی اسپرٹ اس ثنویت کو انگیز نہیں کر سکتی کہ

دوئی چشم دیں کے لئے نامرادی — دوئی چشم تہذیب کی نابصیری

اس کے نزدیک تو۔

اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی — کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

اسلام کی اس جامعیت کا تقاضا ہے کہ مسلمانوں کا تعلیمی نظام بھی دین و دنیا کی ہم آمیزی سے خالی نہ ہو کیونکہ تعلیم ہی سے ذہنیت کی تشکیل ہوتی ہے جو عقائد و اعمال کا مدار ہے، اگر مسلمانوں کی ترقی و سربلندی مقصود ہے تو ان کی

تعلیم گاہوں کے سانچے بدلنے پڑیں گے اور ان حقائق کی روشنی میں ان کے نصاب و نظام تعلیم پر تنقیحی نظر ڈالنی پڑے گی تاکہ دین و دنیا کی نبرد آزمائی کا خاتمہ ہو اور ملت کے منتشر عناصر میں پھر یکرنگی و ہم آہنگی پیدا ہو سکے۔

مسلم درسگاہوں کے صرف نصاب و نظام تعلیم ہی میں تغیر کافی نہیں، بلکہ ضرورت ہے کہ ان کا مطمح نظر، مرکز فکر اور دائرۂ عمل بدلنے کی کوشش کی جائے تاکہ ان کی پست نگاہی اور دون ہمتی دور ہو، عزم و حوصلہ کی دبی ہوئی طاقتیں ابھریں، قوم کی مردہ رگوں میں زندگی کا خون دوڑنے لگے اور "خاکستر افسردہ" پھر "ہمرنگ شرار" ہو جائے، طلبہ میں کچھ ایسی روح پھونکی جائے کہ آئینۂ سیم و زر کے چند ٹکڑے ہی انکی زندگی کا مقصد نہ بن سکیں بلکہ دین و ملت کی خدمت ان کا مقصود اور اس راہ میں جانکاہی و جانبازی اور ایثار و سرفروشی ان کا شعار ہو، طبیعتیں جوش و ولولے سے معمور رہیں اور دل اقدام عمل کے جذبے سے سرشار رہیں۔

الندوہ کی گذشتہ اشاعت میں مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ کی تازہ تصنیف "رحمت عالم" کا ذکر ہو چکا ہے مولانا نے چھوٹے لڑکوں، عورتوں اور کم پڑھے لکھے لوگوں کے لئے سیرۃ کی یہ کتاب مرتب فرمائی ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ اس کتاب میں سیرۃ کے تمام اہم واقعات اختصار مگر جامعیت کیساتھ آجائیں، زبان اتنا صاف، طرز ادا اتنی واضح اور الفاظ اتنے آسان ہوں کہ کم سے کم علمی استعداد کے لوگوں کو بھی اسکے سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہو، ان خصوصیات کیساتھ واقعات کی صحت و استناد کا بھی خاص خیال رکھا گیا ہے، تاکہ درس و تدریس کے حلقوں میں بھی کام آسکے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ چند دنوں میں اس کتاب نے ملک میں خاصی مقبولیت حاصل کر لی ہے ابتک بہت کافی نسخے فروخت ہو چکے ہیں اور ہنوز طلب کا سلسلہ بدستور جاری ہے جناب نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی نے قدر افزائی کے طور پر پانچ روپیہ فی نسخہ کے حساب سے پانچ سو روپیہ کی سو جلدیں خرید فرمائی ہیں ہمیں امید ہے کہ نواب صاحب موصوف کی یہ مثال نیک ہمارے دوسرے مسلمان امراء اور اصحاب ثروت کیلئے مشعل راہ کا کام دیگی کتاب کی عام قیمت ایک روپیہ ہے اسکا سارا منافع دار العلوم میں چھوٹے بچوں کے دار الاقامہ کی تعمیر کیلئے وقف ہے، اسطرح اہل خیر کو دوہرا ثواب حاصل ہوگا

میری محسن کتابیں

(از علامہ سید سلیمان ندوی)

میرے بڑے بھائی مرحوم مولوی حکیم سید ابو حبیب صاحب غزنوی مجددی مولانا عبداللہ صاحب غازیپوری اور دہلی کے شاگرد مولانا شاہ علی نعمت صاحب پھلواروی کے شاگرد تھے، اسکا اثر یہ تھا کہ وہ توحید و سنت کے شیفتہ اور دلدادہ تھے اور تمام عمر کامل اتباع سنت اور زہد و تقویٰ میں گذاری۔

میں وہ جب ذہانت پاکر آئے تو میں بچہ تھا، وہ مجھ سے عمر میں ۱۸ برس بڑے تھے، میں نے انہیں کے دامن شفقت میں پرورش پائی۔ مسلمانوں میں بدعات کا رواج زیادہ تر عورتوں کے سبب سے ہے اسلئے اُن کو اپنے رشتہ کی بیبیوں اور خاندان کی دوسری مسلمان بیبیوں کو سمجھانے اور اسلام کی صحیح تعلیم سے آشنا کرنے کی دھن تھی۔ انھوں نے ہفتہ میں ایک دن ان بیبیوں میں وعظ و تلقین کے لئے مخصوص فرمایا۔ چونکہ میں بچہ تھا، فارسی ختم ہو کر میزان منشعب شروع تھی۔ قرآن پاک کے بعد مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تقویۃ الایمان میرے ہاتھ میں دین کی پہلی کتاب دیگئی۔ میں ان بیبیوں کے بیچ میں بیٹھکر تقویۃ الایمان کی ایک ایک بات پڑھتا تھا اور بھائی صاحب مرحوم پردہ کے پیچھے سے اسکے ایک ایک مسئلہ کی تشریح و تفسیر فرماتے اور جو وہ فرماتے وہ میرے دل میں بیٹھتا جاتا۔

یہ پہلی کتاب تھی جسنے مجھے دین حق کی باتیں سکھائیں، اور ایسی سکھائیں کہ اثنائے تعلیم و مطالعہ میں بیسیوں آندھیاں آئیں کتنی دفعہ خیالات کے طوفان اُٹھے، مگر اسوقت جو باتیں جڑ پکڑ چکی تھیں اُنمیں سے ایک بھی اپنی جگہ سے ہل نہ سکی علم کلام کے مسائل اشاعرہ و معتزلہ کے نزاعات، غزالیؒ و رازیؒ و ابن رشد کے دلائل یکے بعد دیگرے نگاہوں سے گذرے مگر اسمٰعیل شہیدؒ کی تلقین بہرحال اپنی جگہ پر قائم رہی۔

سنہ [illegible] میں دارالعلوم آیا، اور دوسرے درجہ میں داخل ہوا۔ گھر سے کچھ رسالے ساتھ لایا تھا، اُنمیں اُصول حدیث میں شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کا رسالہ عجالۂ نافعہ بھی تھا، اصول حدیث کے اس مختصر

فارسی رسالہ کو پڑھنے سے مجھے علم حدیث سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ ندوہ کے کتبخانہ سے شاہ صاحبؒ کی دوسری کتاب بستان المحدثین ہاتھ آئی، بڑے شوق سے اس کا مطالعہ کیا، اور بالآخر محدثین کی شخصیتوں میں سے امام مالکؒ نے میرے دل پر قبضہ کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ موطا امام مالکؒ سے بیحد گرویدگی پیدا ہوئی۔

ان دونوں دارالعلوم کے طلبہ کے مطالعہ کے لئے اُن کے دارالمعلومات میں کچھ کتابیں الگ رکھوا دی گئی تھیں۔ جنکو میں دیکھا کرتا تھا، انھیں کتابوں میں حافظ ذہبی کی تذکرۃ الحفاظ تھی، اُسکے مطالعہ نے محدثین کے کارناموں سے آگاہ کیا۔

اوپر کی سطروں سے ظاہر ہے کہ کیونکر میرے دل میں رفتہ رفتہ علم حدیث اور امام مالکؒ کی موطا کا شوق ہوا۔ اسی شوق کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۰۵ء میں میرا سب سے پہلا مضمون الندوہ میں علم حدیث پر نکلا جسکی تعریف بزرگوں نے فرماکر میرا حوصلہ بڑھایا اور میری سب سے پہلی کتاب حیات مالکؒ وجود میں آئی۔

اس شوق نے ایک قدم آگے بڑھایا، آخری سال تھا صحیح بخاری کا آغاز تھا، ہمدرس ساتھیوں میں کچھ غالی حنفی تھے اور کچھ مائل الی الحدیث، آخری لقب کا اطلاق خود مجھپر تھا درجہ میں یہ دونوں قسم کے لڑکے ہر روز اسباق میں اُلجھتے اور سوال وجواب کرتے تھے اور آخر درسگاہ سے اُٹھکر اپنے اپنے ثبوت کے لئے کتابوں کی طرف دوڑتے تھے جو دوسرے اشخاص امام طحاوی اور حافظ عینی کا سہارا ڈھونڈھتے تھے اور میں حافظ ابن حجر کی فتح الباری کی پناہ، اسی سلسلہ میں فتح الباری کے مقدمہ کے مطالعہ کی توفیق ملی اور اسکا نتیجہ امام بخاری پر وہ میرا مضمون ہے جو الندوہ ۱۹۰۶ء میں نکلا ہے۔

حدیث کے شوق نے رجال کی طرف اور رجال نے تاریخ کی طرف بڑھایا، اور اس سلسلہ سے ابن ندیم کی کتاب الفہرست، حاجی خلیفہ کی کشف الظنون اور ابن خلکان کی وفیات کے مطالعہ پر آمادہ کیا، میں نے ابن خلکان کی کتاب اتنی دفعہ بار بار پڑھی کہ اسکے حواشی اور حوالوں سے اُسکے اول تا آخر کے صفحے بھر گئے۔ مولانا شبلی نے ۱۹۰۵ء میں حیدرآباد کے ایک سفر سے واپس آکر مجھے اُسکے انگریزی یا فرنچ مترجم کا جب ایک تبصرہ دیا اور تعریف فرمائی کہ دیکھو

بہرحال کسی وقت ان کے کسی کتاب کو دیکھتے ہیں تو میرے دل میں ایک ٹیس لگی اور میں نے ابن خلکان پر اس کے مترجم پر تبصرہ لکھا، نہیں کیا جو الندوہ میں چھپا۔

اس زمانہ میں ایک بات یہ ہوئی کہ میرے وطن دیسنہ کے قریب ایک دوسرے مشہور قصبہ استھانواں سے مولانا عبدالرحمن صاحب (استاد خسر مولانا محمد سجاد صاحب نائب امیر شریعت بہار) کی ایک چھوٹی سی کتاب مفتی الصبیان نامی آئی جس میں مختلف ضرورتوں کے عربی الفاظ اور ان کے معنی لکھے ہیں۔ یہ نسخہ بڑی اصول چیز ہاتھ آئی، میں نے اپنے ہاتھ سے اسکا نقل کیا اور یاد کیا، یہ ادب عربی کی طرف میری توجہ کا پہلا قدم تھا، اسی کا نتیجہ تھا جب مجھے لوب عربی سب سے پہلے لکھنے کا خیال آیا تو اسی طرز پر دروس الادب کی بنیاد ڈالی۔

ادب عربی کی تعلیم مولانا فاروق اور مولانا سید عبدالحی صاحب مرحوم کے زیر سایہ ہوئی، مگر یہ دونوں بزرگ متاخرین کے طرز کے ذوق رکھتے تھے، مولانا شبلی مرحوم کے حسن توجہ سے جب دلائل الاعجاز جرجانی درس میں پڑھنے کو ملی تو سب سے پہلے متقدمین کا طرز انشاء دیکھنے کو ملا، شوق سے پڑھی اور اسکی نقالی کی، اور کچھ عربی لکھنے اور بولنے کی شد بد پیدا ہوئی، اور نقد الشعر نے اس ذوق پر جلا دی اور انکی پیروی نے نظم کا کچھ انداز پیدا کیا۔

علم کلام و ذوق تمامتر مولانا شبلی کی صحبت کا نتیجہ ہے اُن کی تصنیفات پڑھیں، ان کی جو الماری میں پڑی کتابیں ملل و نحل شہرستانی اور الفصل فی الملل والنحل ابن حزم نگاہوں میں رہی، ابن رشد کی کشف الادلہ اور شاہ ولی اللہ صاحب کی حجۃ اللہ البالغہ نے یکے بعد دیگرے اپنا رنگ دکھایا، بالآخر علامہ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کی تصنیفات نے ہر نقش کو مٹا ڈالا اور ہر رنگ کو بے رنگ کر دیا۔

سب سے آخری جلوہ قرآن پاک کا نظر آیا، مولانا شبلی مرحوم نے اسکا آغاز کیا، اور مولانا حمید الدین مرحوم کی دلچسپ و مفید صحبتوں میں یہ چسکا اور آگے بڑھتا گیا اور اسی کا یہ اثر ہوا کہ سیرۃ نبوی کی ہر بحث میں قرآن پاک میری عمارت کی بنیاد ہے اور حدیث نبوی اُس کے نقش و نگار ہیں۔ اور اب یہی دونوں میرا سرمایہ اور یہی دونوں میرا زادِ راہ ہیں۔ ایک اصل ہو دوسرا ظل، ایک وحی جلی ہو دوسرا وحی خفی، ایک دلیل ہو دوسرا نتیجہ، جس کو یہ ایک دو نظر آتے ہیں وہ احول ہے۔ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ

جامعہ ازہر

از مولانا حافظ محمد عمران خاں ندوی متخصص ازہر انچارج مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء

(۷)

۴۔ مجلس اعلیٰ

یہ مجلس ازہر کی حل وعقد کی مجلس جو اور ازہر کے سلسلہ میں بادشاہ سے قبل سب سے زیادہ با اختیار جماعت جو اپنی اِن کی اصطلاح میں یونیورسٹی کورٹ، یا مجلس منتظمہ سمجھنا چاہئے، اسکے ارکان حسب ذیل ہوتے ہیں۔

۱۔ شیخ الجامع الازہر

۲۔ وکیل الجامع الازہر[1]

۳۔ مفتی الدیار المصریہ

۴۔ شیخ کلیہ اصول الدین

۵۔ شیخ کلیہ اللغۃ العربیہ

۶۔ شیخ کلیہ الشریعہ

۷۔ وکیل وزارۃ الحقانیہ (وزارۃ عدل کا سکریٹری)

۸۔ وکیل وزارۃ الاوقاف (وزارۂ اوقاف کا سکریٹری)

۹۔ وکیل وزارۃ المعارف العمومیہ (وزارۂ تعلیم کا سکریٹری)

---

[1] وکیل کی اصطلاح عربی میں نائب کے طور پر مستعمل ہوتی ہے۔ ہر محکمہ کا نائب وکیل کہلائے گا وزیر محکمہ کے بعد جو سب سے بڑا مستقل عہدہ ہوتا ہے جسے ہماری اصطلاح میں سکریٹری کہا جاتا ہو اسکے لئے بھی وکیل وزارۃ کا اطلاق ہوتا ہو لفظ نائب کا استعمال انچارج یا قائم مقام حکمہ کے لئے بولا جاتا ہے، عربی میں اصل معنی بھی اسکے یہی ہیں۔ "ع"

۱۰۔ وکیل وزارۃ المالیہ　　　(فنانس کا سکریٹری)

(۱) ۲ بنات (یا) زعلماء کے ممبر جن کا تعین ۲ سال کے لئے ہوگا

(۲) ۲ تعلیم کے ماہرین جن کا تعین ۲ سال کے لئے ہوگا۔

اس مجلس کو ازہر کے متعلق پورے اور کامل اختیارات ہیں۔ بجٹ کی ابتدائی منظوری جدید کلیات و معاہد کا افتتاح، نئیشن پر ریٹائر کرنا، انعام دینا، اساتذہ کا تقرر، تنزل و تعطیل، غرضکہ تمام اہم امور اسکے اختیار میں ہیں۔

اس مجلس کا صدر شیخ الازہر خود ہوتا ہے اور اسکی عدم موجودگی میں وکیل الازہر اس کی قائم مقامی کرتا ہے

ازہر کا بجٹ

ہندوستان کے دینی مدارس کی طرح ازہر تنہا چندوں کا محتاج نہیں ہو، اسکے اوقاف اور حکومت کی امدادیں اتنی ہوتی ہے کہ ہندوستان کی اکثر خاصی مشہور ریاستیں اسکے مقابلہ پر نہیں لائی جاسکتیں۔ ہم ۳۹-۱۹۳۸ء کے بجٹ کے بعض اعداد و شمار پیش کرینگے جس سے اسکی آمدنی اور مختصر مصارف کا اندازہ ہوسکے۔

ذرائع آمدنی

ازہر کے خاص ذرائع آمدنی حسب ذیل ہیں۔

اوقاف سالانہ　　　۲۱۱۰ ۲ پونڈ مصری[1]

امداد وزارۃ الاوقاف کی طرف سے　۲۰۶۵۰ پونڈ مصری

امداد وزارۃ مال کی طرف سے　　　۱۳۰۰۰　　　"

"　　　"　　　۲۰۰۵　　　"

---

[1] مصری ایک پونڈ تقریباً ۱۳ روپیہ کے برابر ہے۔

امداد وزارۃ اوقاف کی طرف سے اسلامی ثقافۃ وتہذیب کے لئے ۲۰۰۰ پونڈ مصری

سنہ کے ازہر کا مجموعی بجٹ ۳۲۶۳۰۰ پونڈ مصری تھا یعنی سینتالیس لاکھ آٹھ ہزار دو سو روپیہ۔

آمدنی چونکہ وافر ہوتی ہے، مصر کا معیار معیشت اونچا ہے اسلئے اسی حساب سے مصارف ہوتے ہیں ہندوستان میں علماء جس درجہ مفلوک الحال و درماندہ ہوتے ہیں مصر میں ایسا نہیں ہے۔ ہمارے یہاں جس عالم کی ۱۰۰ روپیہ سے لیکر ۲۰۰ تک تنخواہ ہو وہ بہت بڑا مالدار سمجھا جاتا ہے، بخلاف ازہر کے وہاں عموماً ۲۰۰ روپیہ تنخواہ ابتدائی درجہ میں پڑھانیوالے مدرس کی ہوتی ہے۔ کلیات (کالج) کے اساتذہ کی تنخواہیں عموماً ۴۰۰ سے لیکر ۶۔۷ سو تک ہوتی ہیں، یہ تنخواہ ہفتہ میں ایک فن کے صرف چند سبق پڑھانے کی ہوتی ہے۔ مصر کا عالم کلیات میں کسی ایک فن پر مشکل سے ۱۲۔۱۴ گھنٹہ ہر ہفتہ میں درس دیتا ہے اور اس کا معاوضہ ۶۰۰ روپیہ ماہانہ لیتا ہے، اسکا تخیل وہ نہیں کرسکتے کہ صبح سے شام تک ۶۔۶۔۷۔۷ اسباق مختلف علوم وفنون کے ایک مدرس دیسکتا ہے یہ ان کے نزدیک ناممکن العمل اور انسانی طاقت سے ماوراء چیز سمجھی جاتی ہے۔

اس دولت کی فراوانی کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مصر کے علماء علم ودین کی خدمت کے لئے وہ ایثار و قربانی نہیں کرسکتے جو ہندوستان کے علماء کا طرۂ امتیاز ہے۔

ازہر کا طریق رہائش

ازہر کے طلبہ کے لئے رہنے کے واسطے دار الاقامہ ہیں جنکو مصر کی اصطلاح میں رُواق کہتے ہیں ہر ہر ملک کے لئے علٰحدہ علٰحدہ رہنے کے مکانات ہیں خود مصر کے طلبہ کیلئے بھی ان کے ضلعوں کی تقسیم کے اعتبار سے رہنے کی جگہیں ہیں۔

ہوسٹل کا وہ نظام جو ہندوستان کی اعلی تعلیم گاہوں میں ہے ازہر میں نہیں ہے۔ ہر وہ طالبعلم جو ازہر میں داخل ہوتا ہے اسکو اسی ملک کی رواق میں صرف رہنے کی اجازت دیدی جاتی ہے ضروری سامان

سامان رہائش مثلاً چارپائی وغیرہ وہ خود خریدتا ہو کھانے وغیرہ کا بھی انتظام وہ اپنی حسب منشا ہوٹل میں یا کہیں اور کرتا ہو ازہر کی طرف سے اسکا کوئی انتظام نہیں، نادار طلبہ کو بھی اب وظائف نقد دیے جاتے ہیں چند برس پہلے روٹیاں وغیرہ پکوا کر تقسیم کیجاتی تھیں۔

ہندوستان کے اکثر کالجوں یونیورسٹیوں، خود ہمارے یہاں دار العلوم ندوہ میں جو دار الاقامہ کا انتظام ہے اور اس سے جو فوائد پہونچتے ہیں وہ ازہر میں مفقود ہیں۔ مختلف خیال مختلف عقائد مختلف ابنیہ طلبہ کے رہنے سے جو فوائد طلبہ کو یہاں پہونچتے ہیں وہ ازہر میں نہیں پہونچتے اور اسکا سبب یہی ہو کہ ہر ملک کا باشندہ اپنے ہی ملک کی رواق میں رہ سکتا ہو۔ ہمارا مشاہدہ ہو کہ ہماری بورڈنگ کے ایک کمرہ میں اگر چار لڑکوں کی رہائش ہو تو ان میں ایک تونسی، ایک ساڑی، ایک عربی، ایک ہندی ہوگا جس سے ایک دوسرے کے اخلاق و عادات وغیرہ سیکھنے میں بڑی مدد ملتی ہو خصوصیت کے ساتھ ملک کی زبان سیکھنے میں بڑی سہولت ہوتی ہو اور یہ تو یہ ہو کہ اردو سیکھنے میں ہندوستانی طالب علم کی وہ بہت بڑی سہولت ہوتی ہو مصر عموماً جو لوگ جاتے ہیں ان کا اصل مقصد عربی بول چال سیکھنا ہوتا ہو۔ اور عجیب تجربات یہ ہو کہ اسی کے سیکھنے میں سخت دقت ہوتی ہو، اسکے کئی وجوہ ہیں۔ اول تو زبان بولنے کی دارجہ (عامی) ہے جو کتابی زبان سے مختلف ہو اور وہ محض کتابیں پڑھنے سے ہرگز نہیں آسکتی دوسری وجہ ہر ملک کے طلبہ کا اپنے ہی ملک کے ساتھیوں کے ساتھ بودوباش کا طریقہ ہے وہ سب کے سب اپنی زبان میں باتیں کرتے ہیں، اور انھیں اس کا موقع نہیں ملتا کہ اہل زبان سے اختلاط باہمی سیل جول کر سکیں یہ بڑی کمی ہو اور باہر سے آنیوالوں کو انمیں بڑی دقت ہوتی ہو، اس کا تجربہ مجھے خود ہے اسکی شدید ضرورت مجھے تھی کہ مصر کی عامی زبان سیکھوں، اس سلسلہ میں مجھے اپنی جائے سکونت بدلنی پڑی اور ایک خاندان کے ساتھ رہنا پڑا اور وہ چیز جو ۱½ سال تک مجھے حاصل نہو سکی قیام مصر کے آخری ۶ ماہ کی مدت میں حاصل ہو گئی۔ ہر ہر رواق کے مخصوص اوقاف ہیں اور اسکی آمدنی اسی رواق کے باشندوں پر صرف ہوتی ہے۔ ان رواقوں میں سب سے اچھی حالت رواق الاتراک کی ہے یعنی ترکوں کی رواق کی اسپر کافی

اوقاف ہیں اور اسکے رہنے والے ہر طالب علم کو اس رواق کے خاص اوقاف سے قریباً ۲ ½ پونڈ (مصری) ماہانہ ملتے ہیں، اسکے علاوہ سالانہ مصارف لباس وغیرہ کے لئے ۸-۱۰ پونڈ (مالعہ) ملتے ہیں، اس رواق میں قریباً ۱۵۰ لڑکے ہیں۔ بلقانی ریاستوں کے طالب علم اسی رواق میں داخل کئے جاتے ہیں۔

سب سے بدتر حالت رواق الہنود کی ہے اسمیں رہنے والے طلبہ کو عام معمولی خیراتی وظائف کے سوا (جو تمام طلبہ کو ملتے ہیں) خاص ہندوستانی اوقاف سے کچھ نہیں ملتا۔ دو ایک بہت معمولی جائدادیں ہیں جنکی مجموعی آمدنی اتنی ہوتی ہو کہ اسکے رہنے والے طلبہ کو دوسرے تیسرے سال عہ، عہ فی کس مل جاتا ہے درانحالیکہ اس رواق میں رہنے والے طلبہ کی تعداد ۱۲، ۱۳ سے زائد نہیں ہو۔ یہ رواق ہندوستانیوں کے لئے حد درجہ شرمناک ذلت کا باعث ہو، ہر ملک کے امیروں اور مالداروں نے اپنے اپنے ملک کی رواق پر کافی جائدادیں خرید کر وقف کی ہیں لیکن یہ شرف ہندوستان ہی کے لئے ہے کہ یہاں کے امیروں مالداروں، نوابوں نے (جو حشرات الارض کی طرح ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں) ہندوستانیوں کے لئے کچھ وقف نہیں کیا، ہر رواق کا ایک ناظر ہوتا ہو جسکو شیخ الرواق کہتے ہیں۔ اسکا تقرر شیخ الازہر کرتا ہو اور عام حالات میں اسکو اس کام کا معاوضہ ۳ پونڈ (عللعہ) عموماً ملتا ہو، ہر ملک کے باشندوں کا داخلہ اسوقت تک ازہر میں نہیں ہوتا جبتک کہ اس ملک کا شیخ الرواق اسکے متعلق تصدیق نہ کرے۔ اس سلسلہ میں یہ نادر بات بھی یاد رکھنے والی ہو کہ ہندوستانیوں کی رواق کا کوئی شیخ آجکل نہیں ہو جس کا باعث آپس کا شدید اختلاف ہو ہر شخص اپنے ہی لئے اس عہدہ کو موزوں سمجھتا ہو۔ اس رواق میں کل ۱۳ لڑکے تھے۔ درانحالیکہ افغانستان کی رواق میں شیخ الرواق موجود ہو جسمیں صرف تین طالب العلم ہیں۔

ازہر کا کتبخانہ

قدیم زمانہ میں ازہر کی رواقوں میں علٰحدہ علٰحدہ کتبخانے موجود تھے ۱۳۱۴ھ (۱۸۹۶ء) میں ان سب کو ایک جگہ جمع کرکے عام کتبخانہ بنایا گیا جس کا نام دارالکتب الازہریہ ہے۔ اسمیں اسوقت ساٹھ ہزار سے زیادہ کتابیں ہیں جسمیں نیدرہ ہزار قلمی ہیں اور اکثر انہیں سے نادر ہیں، کتبخانہ کا نظام جدید طرز پر ہے اس سلسلہ میں ازہر نے

بعض خاص خاص اس فن کے جاننے والے اس کلیہ کے لئے متعین کئے ہیں اس عام کتبخانہ کے علاوہ ہر کلیہ میں ایک ایک کتبخانہ موجود ہے جس میں اس کلیہ سے متعلق ضروری کتابیں موجود ہیں۔ ہر کلیہ کا کتبخانہ قریباً پانچ پانچ ہزار کتابوں پر مشتمل ہے۔ بعض خاص خاص رواقوں میں، وہاں کے طلبہ کے استفادہ کی غرض سے اب بھی چھوٹے چھوٹے کتبخانے موجود ہیں

زیر نظر مضمون کی یہ آخری قسط ہے، امید ہے کہ ازہر اور اسکے نظام تعلیم وغیرہ کا ایک مختصر خاکہ اس سے ذہن میں آ گیا ہوگا۔ انشاء اللہ آئندہ فرصت میں مصر سے متعلق بعض اور اہم باتیں ہدیہ ناظرین کیجائیں گی۔

ابن خلدون کا نظریۂ تعلیم

از جناب محمد سمیع صاحب صدیقی ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی صدر شعبۂ انگریزی دارالعلوم ندوۃ العلماء

حالات ابن خلدون (۷۳۲ھ/۱۳۳۲ء سے ۸۰۸ھ/۱۴۰۶ء) مشہور مؤرخ مفکر اور فلاسفر ٹیونس میں یکم رمضان ۷۳۲ھ کو پیدا ہوئے۔ پورا نام ابو زید عبدالرحمٰن تھا۔ ابن خلدون ایک خاندانی نام خلدون ابن عثمان پر رکھا گیا جو ایک جنگجو گروہ کو لیکر اسپین میں چلے گئے تھے۔ بعدازاں یہ خاندان سویلی (SEVILLE) کے مقام پر متوطن ہوا، لیکن فرڈیننڈ سوم کے حملہ آور ہونے سے پھر ٹیونس واپس چلا آیا۔

ابن خلدون نے ابتدائے عمر سے مختلف عربی علوم کے حاصل کرنے میں وقت صرف کیا اور اکیس سال کی عمر میں شاہ ابن عبدون کے یہاں باریاب ہوئے۔ لیکن پھر وہاں سے ضرورت محسوس کرکے فاس کے سلطان ابو عنان مرینی کے یہاں پناہ لی اور ملازمت اختیار کرلی۔ بدقسمتی نے ساتھ نہ چھوڑا ۱۳۵۶ء کے دوران میں اُن پر کچھ شبہ کیا گیا اور قید میں ڈالدیے گئے۔ جہاں وہ سلطان کی وفات تک ۱۳۵۹ء تک مقید رہے وزیر الحسن ابن عمر نے آزادی دی اور دوبارہ اپنے عہدہ پر مامور ہوئے اور بڑے بڑے خدمات انجام دیے لیکن پھر کچھ ناخوشی ہوگئی اسلئے اس دربار میں زندگی خوشگوار نہ پائی اور اسپین جانیکے لئے اجازت چاہی۔ جب غرناطہ پہونچے، وہاں بہت خیر مقدم کیا گیا اور ابن الاحمر نے بڑی آؤ بھگت کی اور ان خدمات کا اچھا صلہ دیا جو انھوں نے دربار شاہی میں رہکر انجام دی تھیں، بڑے اعزاز واکرام کے ساتھ ان کے ساتھ معاملہ کیا پھر یہ افریقہ واپس آئے ہسلطان ابو عبداللہ صاحب بجایہ ان کے ساتھ بہت خوشدلی سے پیش آئے، لیکن زمانے کی شورشوں نے چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ وہاں سے پھر سرگرداں پھرتے پھراتے امیروں کے درباروں کو دیکھتے سلطان عبدالعزیز کی درخواست پر ان کے یہاں عزت سے قیام کیا اور سلطان کی مدد کے لئے کام کئے لیکن عبداللہ نے چڑھائی کرکے سلطان کو شکست دی اور تخت پر خود بیٹھ گیا۔

بجوایا۔ امیر عبدالعزیز کے مرتبے ... میں کاٹے۔ اس طرح زمانہ کی نیرنگیوں کو دیکھتے، گرم و سرد حالات میں پڑتے پڑاتے پھر اپنے وطن تیونس آئے اور صرف مطالعۂ کتب میں مصروف ہو گئے۔ بعد ازاں حج بیت اللہ کی اجازت لی، ... روانہ ہو کر قاہرہ پہونچے جہاں ان کی شہرت پیش قدمی کر چکی تھی۔ سلطان کی حضوری میں پیش کئے گئے سلطان الملک برقوق نے ان کا بڑا اعزاز کیا اور ۱۳۸۴ء میں قاضی القضاۃ کی جگہ مرحمت کی۔ اور قاہرہ میں مالکی فقہ کے قاضی رہے۔ اس عہدہ پر فائز رہ کر خرابیاں اور مصری عدالت میں جو برائیاں پیدا ہو گئی تھیں ان کو دور کیا۔ خوشنودی ... ہی تھی کہ دکھ اور خبر ملی کہ وہ جہاز جس میں بیوی و خاندان و سامان آ رہا تھا ٹکرا کر غرق ہو گیا اور کوئی زندہ نہ بچا۔ اس سانحہ عظیم نے علمی ذوق اور بڑھا دیا۔ تاریخی کام کی تکمیل میں مصروف ہو گئے قاضی کے عہدے سے بھی علیحدگی ہو گئی۔ انہیں اور موقع کتاب کے مکمل کرنے کا دیا۔ تین سال بعد حج بیت اللہ ادا کیا اور واپس ایک گاؤں میں تنہائی کی زندگی گذارنے لگے۔ ۱۳۹۹ء میں پھر قاضی کے عہدہ پر بلائے گئے۔ ۱۴۰۱ء میں (ربیع الاول ۸۰۳ھ) دمشق بھیجے گئے تاکہ تیمور کے حملہ کا مقابلہ کیا جائے۔ ابن خلدون شہر پناہ سے ایک رسی کے ذریعے نیچے اترے اور تیمور کے پاس حاضر ہوئے۔ تیمور نے ظاہری وجاہت و وقار اور علمی مباحث سے متاثر ہو کر انہیں اجازت دے دی کہ مصر واپس ہوں۔

۲۸ رمضان ۸۰۸ھ (۱۶ مارچ ۱۴۰۶ء) کو چوہتر برس کی عمر میں انتقال کیا۔

نظریۂ تعلیم علامہ ابن خلدون نے علوم کی تقسیم دو کی ہے۔ نقلیہ و عقلیہ

نقلیہ میں کتاب و سنت اور جو علوم کہ کتاب و سنت کے متعلق ہیں مثلاً علم تفسیر، قرأت، حدیث، فقہ۔ اسکے توابع از قبیل فرائض، تصوف، مناظرہ، علم الکلام، لغت و نحو و ادب۔

اور لکھتے ہیں:-

"جو علوم نقلیہ ابھی ابھی ہم نے بیان کئے مسلمانوں میں اُن کا بیحد رواج ہوا اور مسلمانوں نے استفادہ، غور و تدبر کیا ہو کہ اُس سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ ہر ایک علم کے لئے اصطلاحیں وضع

کیں اور ہر علم کی شاخ کو الگ کر دیا اور ہر علم کو خاص خاص لوگوں نے اپنا فن قرار دیکر
خوب خوب اسمیں موشگافیاں کیں اور ایسی باتیں نکالیں جو استفادہ و تعلیم کیلئے نہایت مناسب ہیں"
اپنے زمانہ میں ممالک اسلامی غربی و شرقی میں علوم کی حالت کا یوں اظہار کرتے ہیں۔

"لیکن اس زمانہ میں مغرب میں عام بربادی پھیل جانیکی وجہ سے وہ مخصوص علوم مفقود
ہوگئے۔ مشرق میں جہانتک مجھے معلوم ہوا ابھی اُن علوم کا رواج ہے اور ہر قسم کے علوم
فنون کی تعلیم و تلقین پائی جاتی ہو اسلئے کہ آبادی کثرت اور تمدن زوروں پر ہے،
اور طلبا کو وظیفے ملتے ہیں اور مدرسوں کے لئے بڑی بڑی جاگیریں وقف ہیں۔"

علوم عقلیہ۔

"انسان چونکہ صاحب فکر و رائے ہو اسلئے علوم عقلیہ اسکے لئے طبعی ہیں، یہی وجہ ہو کہ وہ کسی
خاص قوم و ملت سے مخصوص نہیں بلکہ ہر قوم و ملت میں انکے جاننے والے موجود ہیں۔ یہ علوم
دنیا میں اسوقت سے پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے جبکہ انسان کا وجود ہوا، تمام
علوم عقلیہ کو فلسفہ و حکمت کہتے ہیں۔

اسکی چار قسمیں کی ہیں۔

(۱) منطق (۲) علم طبعی (۳) علم الٰہی (۴) علم التعالیم جس کا موضوع مقدار ہے۔

اسکی چار قسمیں ہیں۔

(۱) ہندسہ (۲) ارتماطیقی (ارتھمیٹک) (۳) موسیقی (۴) علم ہیئت

تعلیم کیلئے یہ اصول لکھے۔

(۱) تحصیل علوم میں جن چیزوں نے لوگوں کو نقصان پہونچایا اُنمیں ایک تالیفات کی کثرت اور
طالب علم کو اس بات پر مجبور کرنا ہو کہ وہ اُن تمام چیزوں کو ازبر یاد کرلے، اسطرح پر اسکی تمام عمر بھی ایک فن کی

تکمیل کے لئے کافی نہیں ہوتی۔ مثلاً تمام شروح و حواشی یاد کرنے پر مجبور ہوتا ہے اور مختلف طریقوں کو جاننے پر مجبور ہوتا ہے۔

(۲) علم میں تالیفات کا اختصار بھی مخل تعلیم ہے۔

آج علمی تالیفات میں اس قدر اختصار اور ایجاز برتا گیا ہے کہ مختصر فہرست ہوگئی ہے جس میں مسائل کے دلائل لکھ دیئے جاتے ہیں تھوڑے لفظوں میں بہت سے معنی بھر جاتے ہیں جس سے بلاغت میں فتور آتا ہے اور سمجھنے میں دقت ہوتی ہے۔

(۳) ابتدا میں مشکل تفہیم اور مخل تعلیم ہے۔ کیونکہ ایسے مسائل بحث کیلئے پیش کئے جاتے ہیں جنکے سمجھنے کی متعلم میں استعداد نہیں ہوتی۔ یہ طریقۂ تعلیم نہایت خراب ہے۔ علاوہ اسکے ان مشکل اور دقیق الفاظ میں غور کرنا اور ان سے مسائل نکالنا بجائے خود دشوار ہے اور طالب علم کو اس الجھن میں اپنا سارا وقت ضائع کرنا پڑتا ہے اور جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ ناقص ہوتا ہے۔

تعلیم کا صحیح اور اچھا طریقہ

"تعلیم صرف اسی حالت میں مفید پڑتی ہے جبکہ وہ تدریجی اور تھوڑی تھوڑی ہو، پہلے ایک فن کے ہر باب کے مسائل طالب علم کو پڑھائے جائیں اور تھوڑی تھوڑی انکی تشریح کیجائے اس بارے میں متعلم کی عقل اور استعداد کا پورا خیال رکھا جائے۔ ہمارے موجودہ مدارس میں کسقدر اس اصول کو نظر انداز کر دیا گیا ہے، جدید نظریہ سے بھی یہ منطبق ہے جس کا تذکرہ آئندہ کیا جائے گا۔

آگے لکھتے ہیں۔

"ہم نے اس زمانہ کے اکثر معلموں کو دیکھا ہے کہ وہ طریقۂ تعلیم سے بالکل نابلد ہیں تعلیم کے ابتدائی دور ہی میں علم کے دقیق اور مشکل مسائل طالب علم کے سامنے لے بیٹھتے ہیں اور ان کے حل کرنے پر ان بے استعدادوں کو مجبور کرتے ہیں اور اپنے اس طریقہ کو ذریعۂ مشق و تمرین اور تعلیم کا صحیح طریقہ سمجھتے ہیں۔ ان کی تعلیم میں جو کچھ

ابتدا ہی میں انتہائی مسائل ہوتے ہیں اسلئے مبتدی اُن کے بیان کو نہیں سمجھ سکتے کیونکہ سمجھنے کی استعداد تدریجاً ترقی کرتی ہے۔ معلم کو چاہئے کہ جو کتاب طالب علم پڑھ رہا ہو اُس سے بالاتر کتاب کے مسائل اُس کے سامنے ہرگز بیان نہ کرے معلم کو یہ بھی خیال رکھنا چاہئے کہ متعلم کو دیر تک یا متعدد جلسوں میں ایک ہی فن نہ پڑھائے کیونکہ ایسا کرنے سے نسیان ذہن پر غالب آجاتا ہے اور ملکہ حاصل ہونا مشکل ہو جاتا ہے طریقہ تعلیم میں یہ بات بھی نہایت ضروری ہے کہ متعلم کے سامنے دو علم خلط ملط نہ کئے جائیں ایسی حالت میں دونوں علم فوت ہو جاتے ہیں کیونکہ دونوں علم ذہن کو اپنی اپنی طرف کھینچتے ہیں اور فکر منتشر ہو کر ایک کی بھی تہ تک نہیں پہونچتی جدید طریقہ تعلیم میں بھی طالب علم کی توجہ کو منتشر کرنے کو بہت بُرا سمجھا جاتا ہے۔

بچوں کی تعلیم اور ممالک اسلام میں ان کی تعلیم کے طریقے یہ لکھتے ہیں۔

"تمام ممالک اسلام میں بچوں کی تعلیم قرآن سے شروع کیجاتی ہے تاکہ ان کی سادہ طبیعت پر عقائد ایمانیہ راسخ ہو جائیں۔ اکثر قرآن مجید کے ساتھ ہی احادیث کے مختصر متن بھی تعلیم میں داخل ہیں تاکہ تحصیل علوم کے بعد جو ملکہ حاصل ہو اسکی بنیاد قرآن و حدیث ہی پر ہو۔ البتہ قرآن مجید کی تعلیم کے طریقے مختلف ممالک میں مختلف ہیں اہل مغرب ابتدا میں صرف قرآن مجید پڑھاتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ کتابت کی بھی تعلیم دیتے جاتے ہیں اس اثنا میں مغاربہ طالب علم کو نہ حدیث پڑھاتے ہیں نہ فقہ نہ شعر اور نہ کلام۔ قرآن مجید اور اسکے لوازمات سے فارغ ہونے پر طالب علم کو دیگر علوم پڑھاتے ہیں، تمام مغرب کے بڑے بڑے شہروں میں تعلیم کا یہی دستور ہے۔ اور بربری قومیں بجا اسی طریق کی تقلید ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل مغرب نسبتاً اور جگہ کے مسلمانوں کے زیادہ حافظ قرآن اور رسم القرآن سے واقف ہیں۔"

اندلس کے متعلق لکھتے ہیں۔

"اندلس میں قرآنی و کتابی تعلیم ساتھ ساتھ شروع ہوتی ہے۔ علمائے اندلس قرآن کی تعلیم کے ساتھ ہی عربی شعر اور اسکے ماخذ کی تعلیم بھی دیتے جاتے ہیں۔ فن شعر کے اصول و قوانین، کتابت، خطاطی بھی ساتھ ہی سکھاتے

جاتے ہیں۔ افسوس یہ انحطاط کا زمانہ تھا۔ یونیورسٹی کی تعلیم باقی نہ رہی تھی۔"

اہل افریقہ کا طریقہ تعلیم بھی اندلسی طریقہ سے ملتا جلتا تھا۔ افریقہ میں تعلیم علمائے اندلس کے ذریعہ پہنچی

ہے جب یہ وہ عیسائیوں سے مغلوب ہوکر اور وطن چھوڑ کر تونس گئے اہل تونس نے اُن کے سامنے زانوئے شاگردی

تہ کیا۔

اہل مشرق کے متعلق لکھتے ہیں۔

اہل مشرق قرآن و دیگر علوم کی تعلیم ایک ساتھ شروع کرتے ہیں۔ تعلیم جوان ہونے پر دیجاتی ہے۔

اور کتابت مدارس تعلیم میں بالکل نہیں ہوتی۔ البتہ علیحدہ خوشنویس سے سیکھتے ہیں۔ مدرسہ میں جبتک رہتے ہیں

ان کا خط نہایت خراب رہتا ہے وہ طلباء اسکی اصلاح نہیں کیجاتی۔ مدرسہ سے نکلنے کے بعد خطاطی شوق ہونے پر

سیکھتے ہیں۔

مغرب پر یوں تنقید کرتے ہیں

"یہ چونکہ تعلیم قرآنی پر اکتفا کرتے ہیں اسلئے تعلیم سے انھیں ملکہ تام نصیب نہیں ہوتا کیونکہ قرآن کی تعلیم سے

ملکہ پیدا ہوتا ہی نہیں متعلم لاکھ کوشش کرے کہ اسلوب قرآنیہ پر لکھے نہیں لکھ سکتا اسلئے کہ قرآن معجزہ ہے۔ پھر

بھلا اسکی نقل میں کامیابی ہو تو کیونکر۔ اور چونکہ قرآن کے ما سوا کلام عرب سے عربیت کی تعلیم ہوتی نہیں، اس لئے

باقی تعلیم سے بھی عربیت کا ملکہ حاصل نہیں ہوتا اور اس سے محروم ہی رہجاتے ہیں اسی لئے عبارت لکھنے میں سست

ہوتے ہیں۔"

اندلس والے چونکہ ہر علم پڑھاتے ہیں اور شعر و انشا اور عربیت کی تعلیم خصوصیت کے ساتھ ان کے یہاں

اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہے اسلئے متعلم عربی کے ماہر ہوکر نکلتے ہیں لیکن قرآن و حدیث کے شدید ہی رہتے ہیں۔

قاضی ابو بکر بن العربی کی کتاب الرحلت سے انکے تعلیم کے طریقے پر زور دیا ہے اور ترجیح دی ہے۔

عربیت کی تعلیم کو تمام علوم پر مقدم کیا ہے چونکہ شعراء عرب کی تاریخ اور ادب کا خزانہ ہے اس لئے عربی

لغت کی حفاظت کے لئے سب سے پہلے شعر ہی کی تعلیم ہونی چاہئے، اسکے بعد حساب، پھر قرآن، تاکہ دو مرحلے طے کرنے کے بعد قرآن کو متعلم اچھی طرح سمجھ سکے۔ قاضی صاحب کی رائے میں یہ بڑی غلطی ہے کہ بے سمجھے بچوں کو پہلے قرآن شروع کرادیا جائے۔ تعلیم قرآن کے بعد اصول دین پڑھائے جائیں، پھر اصول فقہ، پھر جدل پھر حدیث اور تمام متعلقات۔

سزا کے متعلق رائے ہے کہ تشدد متعلموں کے حق میں مضر ثابت ہوتی ہے، لکھتے ہیں۔

"نوعمر متعلموں پر سخت گیری اور تشدد کا اثر برا پڑتا ہے۔ یہ متعلموں کے لئے مضر ہے جنکی تربیت قہر و سختی کے ساتھ کیجاتی ہے۔ طالب علم ہو یا غلام یا خدمتگار، اس کی طبیعت بجھ جاتی ہے اور خوشی کی جگہ کسالت اپنا رنگ لاتی ہے اور نفس خباثت اور دروغگوئی کا عادی ہوجاتا ہے اور بات بات میں مکر و فریب کرنے لگتا ہے تاکہ کسی طرح سزا سے بچے آخر یہی رذائل طبیعت ثانیہ بنکر مقہور کی انسانیت کو کھو دیتے ہیں، نہ اسمیں حمیت رہتی ہے نہ مدافعت کا حوصلہ، ہر بات میں دوسروں کا آسرا پکڑتا ہے اور رفتہ رفتہ دائرۂ انسانیت سے خارج ہوجاتا ہے۔ اسلئے استاد و والدین کا فرض ہے کہ تادیب و تربیت میں بیجا سختی نہ کریں، مودب معلم کو اگر سزائے جسمانی کی ضرورت پیش آئے تین کوڑوں سے زیادہ ہرگز نہ مارے۔ تعلیم و تادیب کے متعلق ہارون رشید کا واقعہ ذکر کرتے ہیں جبکہ امین کو استاد کے سپرد کیا تو کہا کہ جہاں تک ہوسکے نرمی و سہولت سے کام لے اور بری باتوں سے روکے اگر کہنے سے نہ مانے تو پھر سختی کا تجھے اختیار رہے اور اگر جبر کی کو بھی خیال میں نہ لائے تو بے تامل سزائے جسمانی دے۔

سزا طالب علم کی اپنی طبیعت اور مناسبت حالت کے مطابق دینی چاہئے بعض صرف آنکھ دکھلا کر بعض ڈانٹ کھا کر بعض دھمکی سے بعض جماعت کے سامنے شرمندگی سے بعض سزائے جسمانی سے درست ہوتے ہیں۔ ان کا مطالعہ کرنا معلم پر فرض ہے ورنہ نتیجہ برا نکلتا ہے تعلیم ناکام رہتی ہے۔ طالب علم یا مقہور مرتبۂ انسانیت سے گرجاتا ہے۔

ابن حجر ہیتمی اور انکی تالیفات

سے متعلق

کچھ نئی معلومات

مولانا مسعود عالم ندوی کیٹلاگر اورینٹل لائبریری پٹنہ

ابن حجر ہیتمی مشہور محدث اور فقیہ کی سیرت اور تصنیفات پر تفصیلی گفتگو اسوقت پیش نظر نہیں[1]۔ اس تحریر کا مقصد صرف ابن حجر کی زندگی کے بعض دھندلے گوشوں کو اجاگر کرنا اور بعض کمنام کتابوں یا تصنیفات پر نئی روشنی ڈالنا ہے۔

ہمارے ہاں (خدا بخش اورنیٹل پبلک لائبریری پٹنہ) ابن حجر کی سیرت و تالیفات پر موصوف کے ایک شاگرد ابو بکر بن محمد بن عبداللہ باعمرو کا لکھا ہوا ایک مختصر رسالہ ہے (۱۲/ ۲۶۳۲)۔ رسالہ کے مصنف ابو بکر باعمرو کا حال تذکروں میں نہیں ملتا۔ بہرحال یہ اپنے کو ابن حجر کا شاگرد بتاتے ہیں اور ایسا شاگرد، جو ایام وفات تک استاد سے وابستہ رہا۔

" وقد دخلت علیہ فی مرض موتہ قبل وفاتہ بثلاثۃ ایام فرأیتہ یکتب فی المؤلف الذی اسبہ السؤال (ورق ۱۰/ ب) اسلئے اتنا متیقن ہے کہ یہ دسویں صدی ہجری کے عالم تھے، اور دسویں صدی کے اواخر یا گیارھویں صدی کے اوائل میں وفات پائی۔ ابن حجر کی وفات مکہ مکرمہ میں ہوئی، اسلئے ابو بکر باعمرو بھی جوار کعبہ ہی کے رہنے والے تھے یا وہاں رہ پڑے تھے۔ باعمرو سے ان کے حضرمی الاصل ہونیکا پتہ چلتا ہے۔ خلاصۃ الاثر (۳: ۱۷۸) میں ایک علی الفقاری ابن باعمرو (م ۱۰۳۱ھ) کا ذکر ہے۔

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو:- خلاصۃ الاثر جلد ۲ ص ۲۲۷، شذرات الذہب ج ۸ ص ۳۷۰-۳۷۲، النور السافر (مخطوطہ) ص ۲۹۰-۲۹۲، البدر الطالع ج ۱ ص ۱۰۹، فہرست شروح خدا بخش لائبریری ج ۵ ص ۲۰۲، بروکلمن ج ۲ ص ۳۸۸، ذیل ۲: ۵۲۷، الخزائن

رسالہ کے مصنف کی گمنامی قلمی کی حالت اچھی ہے، صاف، صحیح، اور عربی نسخ میں لکھا ہوا ہے، سنہ کتابت درج نہیں، صرف:- "وکان الفراغ من زبرہ عصر یوم الاربعاء، ۲۹ شہر صفر الخیر بجدۃ حرسہا اللہ......" مذکور ہو۔ کاتب علی بن محمد المکی کا زمانہ بھی معلوم نہیں۔ یہ مجموعہ (۲۶۳۲ ع) کا بارھواں رسالہ ہو اور ورق ۲۹۵ (ب) سے ورق ۳۰۲ (ب) تک پھیلا ہوا ہے۔ رسالہ کا آغاز ان جملوں سے ہوتا ہے:

"یقول الفقیر الی فضل اللہ تعالیٰ ابو بکر بن محمد بن عبد اللہ باعمرو...... الحمد للہ رب العلمین ... اما بعد فھذہ الورقات تتضمن ترجمۃ شیخنا المجدد شہاب الدین ومعرفۃ مولدہ ووفاتہ ومصنفاتہ وشیٔ من مناقبہ مما شاہدتہ او سمعتہ منہ او من جماعتہ فاقول مستعینا باللہ الخ"

اور خاتمہ ان جملوں پر:-

"ہذا اٰخر ما اردت جمعہ ویسر اللہ بمنہ وضعہ علی ان مناقب شیخنا واستیفاء الکلام علی ذکر مشائخہ وتعداد محاسن مؤلفاتہ وتفاصیل اسبابہا وشرح باقی احوالہ ...... یحتمل مجلدا فکفت القلم اولی ...."

اس رسالہ یا اسکے مصنف کا ذکر، تلاش کے باوجود ہمیں کہیں نہیں ملا، البتہ ابن حجر کی مشہور کتاب تحفۃ المحتاج (مطبوعۂ وہبیہ مصر ۱۲۸۲ھ) کے آغاز (۱: ص ۳-۵) میں اسکا خلاصہ دیا گیا ہے، جس کا خاتمہ ان جملوں پر ہوتا ہے:

"انتہی ملخصا من ترجمۃ تلمیذہ الشیخ ابی بکر بن محمد بن عبد اللہ باعمرو رحمہ اللہ"

اس سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ مصر میں موجود تھا، لیکن اسکے بیانات کو واجبی اہمیت نہیں دی گئی، اور نہ تحفۃ المحتاج کے چھاپنے والوں نے اسطرف توجہ مبذول کرائی۔

حاصل کلام یہ کہ عاجز کی رائے میں یہ رسالہ، ابن حجر ہیثمی اور ان کی تالیفات کی حد تک بہت قیمتی اور قابل قدر ہو اور مترجم کے سال وفات وغیرہ کے متعلق اسکا بیان فیصلہ کن اور قابل قبول ہو اور اسلئے ہم اس تحریر میں ان تمام نقاط کو الگ الگ بیان کرنا چاہتے ہیں جن پر اس رسالہ سے خاص روشنی پڑتی ہے۔

سنہ ولادت | ابوبکر بن محمد بن عبداللہ باعمرو، مندرجہ ذیل عبارت میں لکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنے استاذ کے دست خاص کی لکھی ہوئی تحریر میں دیکھا کہ وہ سنہ ۹۰۹ھ[1] (۱۵۰۴ء) کے اواخر میں پیدا ہوئے تھے:

"ولد رحمہ اللہ تعالیٰ ورضی عنہ کما شاہدتہ بخط المجلۃ ابی الہیثم لعبد اللہ تعالیٰ الراجی عن عبدہم الاصلیۃ سنۃ اواخر سنۃ تسع وتسعمائۃ" (ورق ۲۶۹ الف)

سنہ وفات | مترجم کے سال وفات میں بہت اختلاف ہے، مندرجہ ذیل بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی وفات دوشنبہ کے دن چاشت کے وقت ۲۳ رجب ۹۷۴ھ کو ہوئی (۳ فروری ۱۵۶۷ء)۔

"وکان ابتداء مرضہ الذی انتقل فیہ فی شہر رجب فترک التدریس بعد عشرین یوما ووصی ثم اشتد الحال ولم تزل من سبب المذکور وتوفی ضحوۃ الاثنین الثالث والعشرین من شہرہ المذکور سنۃ اربع وسبعین وتسعمائۃ" (ورق ۲۷۱ ب و ۲۷۲ الف)

اسمیں ابتداء مرض، وصیت اور وفات کی ٹھیک ٹھیک تاریخیں اس تفصیل سے بیان کی گئی ہیں کہ غلطی کا گمان نہیں پیدا ہوتا اور یہ سب کچھ اس شاگرد کے قلم سے ہے جو مرض الموت میں استاذ سے جدا نہیں ہوا۔

عام طور پر ابن حجر ہیتمی کی تاریخ وفات ۹۷۳ھ (۱۵۶۵ء) لکھی جاتی ہے جو صحیح نہیں، بروکلمن (۲: ۳۸۸) نے بھی اسمیں غلطی کی، ذیل (۲: ۵۲۷) میں تصحیح بھی کی، تو مشکوک طریقہ پر، فہرست مشروح خدا بخش لائبریری (ج ۵ ص ۲۰۳) میں اسی رسالہ کے استناد پر بروکلمن کی تغلیط کی گئی اور صحیح تاریخ ۹۷۴ھ دی گئی ہے، لیکن سنہ عیسوی کی مطابقت میں ذرا تسامح ہو گیا ہے یعنی ۱۵۶۷ء کی جگہ ۱۵۶۶ء درج ہے)

تصنیفات | ولادت ووفات کی تاریخوں کے علاوہ اس رسالہ میں مترجم کی تالیفات کی مکمل فہرست دی گئی ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل عبارت سے عیاں ہوتا ہے:

"ہذا ما وقفت علیہ من مؤلفاتہ بل لیس لہ غیر ما ذکرتہ" (ورق ۲۷۱ ب)

---

[1] سال ولادت عام طور پر ۹۰۹ھ (۱۵۰۳ء) لکھا جاتا ہے لیکن ۹۰۹ھ کا آغاز ۲۶ جون ۱۵۰۳ء سے ہوتا ہے اس لئے ۹۰۹ھ کا آخری حصہ ۱۵۰۴ء کے مطابق ہوگا۔

ان تصنیفات[1] کے علاوہ، جن کا ذکر بروکلمن کی تاریخ ادب عربی[2] اور اسکے ذیل میں آگیا ہے اس رسالہ سے ابن حجر کی حسب ذیل تصنیفات کا سراغ ملتا ہو (ورق ۶۷ الف۔ ۷۱ الف) رسالہ میں کہیں کہیں توضیحی نوٹ بھی دیے گئے ہیں۔

(الف) حدیث

(۱) سعادۃ الدارین فی صلح الاخوین

(۲) اربعون حدیثا فی الجہاد

(۳) تحبیر الغضا لمن تولی القضا

(۴) ارشاد ذوی الغنا

(۵) الصاق عوار الہوس بمن لم یفہم الاضطراب فی حدیث انس

اس کا ایک نسخہ ہمارے ہاں ہے (۱/۳۲۶۲) بروکلمن (ذیل: ۲، ۷۵) نے غلطی سے یہ رسالہ ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) کی طرف منسوب کر دیا ہے۔

(ب) فقہ

(۶) الامداد[3] شرح الارشاد

---

[1] بروکلمن (ذیل، ۲، ۹-۵۲۷) نے ابن حجر کی ۷۵ کتابوں کا ذکر کیا ہے۔

[2] بروکلمن کی تاریخ ادب عربی (جرمن زبان میں) (.ESCHICHLE DER ARABISCHEN LITTEATUR) کی دو جلدیں ۱۸۹۸ء میں چھپی تھیں، اب ۱۹۳۷ء میں ذیل کے طور پر .... دو ضخیم جلدوں کا اضافہ ہوا ہو، جو اصل سے دو گنی ہیں، اور عربی زبان میں آغاز سے آج تک جو کچھ لکھا گیا ہو اُس پر یہ کتاب حاوی ہے، غلطیوں سے بچنا تو انسان کیلئے نا ممکن ہو لیکن جہاں تک علمی چھان بین اور کوشش کا تعلق ہو، یہ کتاب عربی تالیفات (مخطوطات و مطبوعات) پر بے مثال ہے، آج تک دنیا کی کسی زبان میں عربی مصنفین اور تصنیفات سے متعلق ایسی جامع کتاب نہیں لکھی گئی۔

[3] ایک ایک مجموعہ (۲۱۲۵، خدا بخش لائبریری) میں امیر عبد العزیز بن سعود اول (۱۱۷۹ھ/۱۷۶۵ء - ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء) کا ایک رسالہ نظر سے گذرا جس میں الامداد کا حسب ذیل الفاظ میں ذکر ہے: وقال ابن حجر رحمہ اللہ فی الامداد المہوم بشرح الارشاد منیوی الزائر المتقرب بالسفر الخ (ورق ۵۴ الف) ممکن ہو دوسری کتابوں میں بھی اسکے حوالے ہوں اور کسی کتاب خانہ میں یہ کتاب محفوظ بھی ہو۔

ابن المقری الیمنی (م ۸۳۷ھ / ۱۴۳۳ء) کی الارشاد (جو اصل میں نجم الدین عبدالغفار خاں بن عبدالکریم قزوینی کی الحاوی الصغیر کا خلاصہ ہو، بروکلمن، ۲۹۴۰۲) کی مفصل شرح، جس کا مختصر فتح الجواد خود ابن حجر ہیتمی کے قلم سے مشہور ہوا اور بارہا چھپ چکا ہو (سرکیس: ۸۴)

(۷) شرح مختصر فی الفقہ لابی الحسن البکری۔

مترجم کے استاذ اور مشہور صوفی عالم ابو الحسن البکری الصدیقی الاشعری سبط آل الحسن (م ۹۵۲ھ / ۱۵۴۵ء) کی مختصر فی الفقہ کی شرح۔ غالباً شرح کی طرح یہ مختصر بھی نایاب ہے۔

(۸) المستعذب فی حکم بیع الماء۔

(۹) کشف العین

مترجم اور ابن زیاد الوجیہ الزبیدی (م ۹۷۵ھ / ۱۵۶۸ء) کے درمیان بعض مسائل پر رسالہ بازی ہوئی تھی، یہ بھی اسی سلسلہ کی تالیف ہو۔ اصل میں یہ ایک دوسرے رسالہ قرۃ العین بان التبرع لا یبطلہ الدین (بروکلمن: ۲۸۹۰۲) کا ذیل ہے۔

(۱۰) مؤلف فی بطلان الدور

(۱۱) مؤلف فی اصل مفہوم الوقف

(۱۲) مؤلف فی الوصیۃ

(۱۳) اصابۃ الاغراض فی سقوط الخیار بالاعراض

(۱۴) شن الغارۃ علی من ابدی تقولہ فی الحناء وعوارہ

اس نادر رسالہ کا بھی ایک نسخہ ہمارے ہاں ہے۔ (۱۵/۳۲/۲۶۴۲)

(۱۵) کشف الغین عن احکام الطاعون واذا لا یدخل البلدین

(۱۶) مؤلف فی احکام الخاتم

(۱۷) الایضاح والبیان لماجاء فی لیلتی الرغائب والنصف من شعبان

(۱۸) مؤلف فی عمارۃ الکعبہ

(۱۹) مؤلف فی احکام الامامۃ

(۲۰) مؤلف فی شروط الوضوء

(۲۱) رفع الشبہ والریب عن حکم الاقرار باخوۃ الزوجۃ المعروفۃ النسب

(۲۲) مؤلف فی الغل

(۲۳) مؤلف فی الحیض

(۲۴) کف الجنیف عن الخطاء والخلل والتحریف

(۲۵) طرف الفوائد وطرف الفرائد

(۲۶) منظومۃ فی اصول الدین

(۲۷) مختصر تاریخ الخلفاء

(۲۸) ایضاح الاحکام لما یاخذہ العمال والاحکام

(۲۹) مختصر المنیۃ السنیۃ فی المنیۃ الحسنیۃ

المنیۃ السنیۃ جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ) کا ایک مختصر رسالہ ہے

(ج) مندرجۂ ذیل کتابیں مصنف (ابن حجر) کی زندگی ہی میں ضائع ہو چکی تھیں:

(۳۰) مؤلف فی ختم البخاری

(۳۱) مختصر الروض المسمی بالنعیم

ابن المقری الیمنی (م ۸۳۷ھ) کی الروض کا خلاصہ۔

(۳۲) بشری الکریم مختصر الروض کی شرح

(و) مندرجہ ذیل کتابیں خود مصنف (ابن حجر) نے نامکمل چھوڑ دی تھیں۔

(۳۳) الایعاب فی شرح العباب

صفی الدین ابن المزجی الزبیدی (م ۹۳۰ھ / ۱۵۲۴ء) مشہور شافعی فقیہ کی کتاب العباب کی شرح۔

(۳۴) طرفۃ الفقیر تحفۃ القدیر

خود مصنف کی مشہور تالیف تحفۃ المحتاج کا حاشیہ

(۳۵) مختصر الارشاد

ابن المقری (م ۸۳۷ھ) کی الارشاد کا خلاصہ

(۳۶) مختصر الایضاح

امام نووی (م ۶۷۶ھ / ۱۲۷۸ء) کی الایضاح کا خلاصہ

(۳۷) النفحات المکیہ

(۳۸) شرح المنظومہ

المنظومۃ فی اصول الدین (دیکھو: ع۲۵) کی شرح

(۳۹) شرح الفیہ ابن مالک

(۴۰) مؤلف فی ختم المنہاج

المنہاج، نووی (م ۶۷۶ھ) کی مشہور کتاب ہے، ابن حجر کی تحفۃ المحتاج اسی کی شرح ہے۔

(۴۱) شرح حزب ابی الحسن البکری

(۴۲) شرح عین العلم

امام ابو حامد غزالیؒ (م ۵۰۵ھ / ۱۱۱۱ء) کی احیاء العلوم کا خلاصہ عمر بن عثمان بلخی (م تقریباً ۸۰۰ھ) نے عین العلم کے نام سے کیا تھا (ملاحظہ ہو: فہرست خدا بخش لائبریری، ابن حجر نے اسی کی شرح لکھنا شروع کی تھی

جلد ۱۳، ص ۴۲)

(۴۳) شرح عقیدۃ لابن عراق

ابن عراق (م ۹۳۳ھ) کی مختصر تالیف عقیدہ کی شرح

(۴۴) شرح العوارف

شہاب الدین سہروردی (۶۳۲ھ / ۱۲۳۴ء) کی عوارف المعارف کی شرح

زیر بحث رسالے سے گویا ابن حجر ہیثمی کی ایسی چھ ایسی کتابوں کا پتہ ملتا ہے، جو عام طور پر فہرستوں میں مذکور نہیں بعض تو خود مصنف کی زندگی ہی میں مفقود ہو چکی تھیں بعض نا مکمل رہ گئی تھیں، البتہ پہلی (انتیس) کتابیں ایسی ہیں، جو ممکن ہے، کتابخانوں کے گوشوں میں کہیں مل جائیں، انہیں سے دو رسالے ہمارے یہاں موجود ہیں، مجامیع کے ڈھیر میں ممکن ہے کچھ اور دستیاب ہو جائیں

رسالے کے مصنف ابو بکر بن محمد بن عبداللہ باعمرو کے متعلق بھی تلاش جاری ہے، اگر کوئی صاحب علم اس سلسلے میں رہنمائی کر سکیں تو عاجز انتہائی ممنون ہوگا۔

اطلاع

رسالۂ الندوہ کی پرانی جلدیں بابتہ سال ۱۹۱۱ء، ۱۹۱۲ء، ۱۹۱۴ء، ۱۹۱۵ء، ۱۹۱۶ء و ۱۹۱۸ء دفتر الندوہ میں موجود ہیں۔ جو اصحاب پرانی جلدیں خریدنا چاہتے ہوں انکو چاہئے کہ جلد از جلد مطلع کریں۔ تاکہ ان کو مطلوبہ جلدیں روانہ کر دیجائیں۔

قیمت فی جلد تین روپیے

"منیجر"

نقد و نظر

النبی الخاتمؐ مصنفہ مولانا مناظر احسن گیلانی، شائع کردہ مکتبۂ الفرقان بریلی۔ کاغذ کتابت، طباعت بہتر، قیمت ۱۲ر

سیرت پاک پر اردو میں کافی کتابیں شائع ہو چکی ہیں، لیکن زیر نظر کتاب اپنے والہانہ انداز بیان، پر تاثیر استدلال، دلنشیں طرز تحریر اور اچھوتے اسلوب نگارش کی بنا پر کافی توجہ کی مستحق ہے عبارت میں عقل و عشق کی آمیزش نے کتاب کی اثر آفرینی کو بہت بڑھا دیا ہے۔ اُمید ہے کہ ذی علم طبقہ میں یہ کتاب بہت مقبول ہوگی خصوصاً مصنف کے تلمیحی اشارات اُنھیں بہت پسند آئیں گے۔

نثار خواجہؒ مصنفہ مولانا معین الدین اجمیری مرحوم، کتابت واضح، کاغذ و طباعت عمدہ قیمت ؎،
ملنے کا پتہ:- منیجر اخبار معین، معین پریس اجمیر

حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں مختلف کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن اب تک اس بارہ میں کوئی جامع تصنیف شائع نہ ہوئی تھی، نثار خواجہ کی اشاعت سے اس کمی کی تلافی کی کوشش کی گئی ہے مصنف مرحوم کا علم و فضل محتاج تعارف نہیں اس کتاب میں حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حالات و واردات کی تفصیلات کے ساتھ فقر و تصوف کے نکات بھی ملتے ہیں امید ہے کہ یہ کتاب ملک میں نظر قبول سے دیکھی جائیگی، افسوس کہ مولانا مرحوم کی عمر و صحت نے ساتھ نہ دیا ورنہ کتاب اور بہتر ہو جاتی۔

تاریخ مسلم لیگ مصنفہ مظہر انصاری بی، اے، آنرز، کاغذ کتابت طباعت بہتر، قیمت عہ،
پتہ:- مکتبہ جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی

جناب مظہر انصاری ایک سنجیدہ نگار مصنف ہیں انکی تحریروں میں علمی تحقیق جذبات پر غالب ہوتی ہے۔ پیش نظر کتاب بھی انھیں خصوصیات کی حامل ہے یہ مسلم لیگ کی مفصل تاریخ ہے جو پوری علمی سنجیدگی سے مرتب کی گئی ہے ساری کتاب میں جذباتی اور طنزیاتی فقروں سے احتراز کیا گیا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ بے تعصبی کے ساتھ واقعات

بیان کردیے جائیں، اُمید ہو کہ یہ کتاب ملک کے سنجیدہ طبقوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھی جائیگی اور مسلمانوں کی چہل سالہ سیاسی جدوجہد کی سرگذشت تاریخی ثقاہت کیساتھ لوگوں کے علم میں آسکے گی، اس کتاب میں بہت سی ایسی تاریخی دستاویزیں، معاہدے اور واقعات ملیں گے جن سے واقفیت کے بغیر ہندوستان کی موجودہ سیاست کو صحیح طور پر سمجھنا دشوار ہو، یہ کتاب کا پہلا حصہ ہو، دوسری جلد حالیہ واقعات پر مشتمل ہوگی اُمید ہو کہ مصنف کی سنجیدہ نگاری کی یہی شان اسمیں بھی قائم رہے گی۔

البیان کتاب وسنت اسلامی تعلیم کا سنگ بنیاد ہیں۔ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کے احکام وہدایات کا مجموعہ ہے اور احادیث میں ان آیات واحکام کی تفصیل وتوضیح کیگئی ہو، دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ قرآن مجید میں شریعت کے بنیادی اُصول ہیں اور احادیث ان اصول کی تشریح ہیں جو صاحب قرآن (روحی فداہ) کی زبان مبارک سے وقتاً فوقتاً بیان ہوتی رہی ہیں، اسی بنا پر امت اسلامیہ نے قرآن مجید کے ساتھ احادیث کی جانب بھی پوری توجہ کی اور حدیث کے حفظ وضبط تحقیق وتفتیش اور تلاش وجستجو میں ہزاروں اشخاص نے اپنی زندگیاں صرف کردیں خود قرآن مجید میں جابجا ایسی صاف اور واضح آیتیں موجود ہیں جنمیں مسلمانوں کو ان حقائق کی جانب توجہ دلائی گئی ہو جگہ جگہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی تاکید کی گئی ہو۔ (اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول) ان کی زندگی کو مسلمانوں کیلئے اسوۂ حسنہ قرار دیا گیا ہو (لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ) انھیں صاحب امر ونہی قرار دیا گیا ہو (ما اٰتاکم الرسول فخذوہ وما نہاکم عنہ فانتہوا) معلم ومزکی بتایا گیا ہو (یزکیہم ویعلمہم الکتاب والحکمۃ) کوئی کہاں تک گنائے، سارا قرآن ہی اس قسم کی آیتوں سے بھرا پڑا ہو تعجب ہو کہ ان صاف اور واضح آیات کے باوجود لوگوں کو کس طرح یہ غلط فہمی ہوتی ہو کہ وہ حدیث سے انکار کرتے ہیں

البیان جو ودت اسلامیہ (جسے عرف عام میں اہل قرآن کہا جاتا ہے) امرتسر سے شائع ہوتا ہو انھیں خیالات کا حامل ہو بعض اہل قرآن تو حدیث کو دینی تاریخ کی حد تک تسلیم بھی کرتے ہیں لیکن اس رسالہ میں اس سے بھی انکار کیا گیا ہو اور بہت ہی دل آزار طریقہ سے۔ ملاحظہ ہو ماہ مئی صفحہ "اس کتاب (بخاری) کے

منفی پختے کوئی شاستر سے بھی زیادہ شرمناک ہیں اسے دینی تاریخ کہنا بھی دین کی توہین ہے'

یہ اس کتاب کے متعلق الفاظ ہیں جسے مسلمان اصح الکتب بعد کتاب اللہ سمجھتے ہیں اور جو آج شریعت کا بہت بڑا مرجع ہے ۔

الفرقان خاکسار نمبر بریلی کے مشہور دینی رسالہ الفرقان سے ناظرین واقف ہوں گے۔ زیرنظر رسالہ اسی کا ایک خاص نمبر جو جسمیں خاکسار تحریک سے بحث کی گئی ہو اور اسکی دینی اور سیاسی مضرتوں کو نمایاں کیا گیا ہو، رسالہ کے آغاز میں ہمارے دوست مولوی ابو الحسن علی صاحب کا ایک تمہیدی مضمون ہے جسمیں انھوں نے تاریخ کی روشنی میں اس تحریک کے خط و خال کو نمایاں کیا ہو، ماضی کی ان شعاعوں سے مستقبل کے بہت سے تاریک گوشے نظر آجاتے ہیں، رسالہ کے تمام مباحث سنجیدگی اور متانت سے لکھے گئے ہیں (ع-ق)

تذکرہ منظر تالیف سید عبد الوہاب افتخار" مرتبہ سید منظور علی صاحب ایم۔ اے۔ شائع کردہ الہ آباد یونیورسٹی، طباعت اعلیٰ کاغذ عمدہ۔

بارھویں صدی کے نامور فارسی شعراء کا تذکرہ ہے، یہ شعراء مختلف ممالک کے ہیں ان میں ایرانی اور ہندی وغیرہ سب شامل ہیں بواسوسے زیادہ فارسی شعراء کے حالات بیان کئے ہیں مستند کتابوں سے مدد لی ہو جس سے اندازہ ہوتا ہو کہ مصنف نے کافی تحقیق و جستجو سے تذکرہ لکھا ہو مصنف آزاد بلگرامی کے شاگرد ہیں اپنے استاد کی شاعری پر کافی لکھا ہے، عقیدت و محبت کا اظہار ہر سطر سے ہوتا ہو مصنف کا سنہ وفات تحقیق سے معلوم نہیں البتہ عبد الجبار خاں صوفی ملک پوری نے سنہ وفات ۱۱۹۰ لکھا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہو کہ مصنف نے اکثر اپنے ہمعصر شعراء کے حالات لکھے ہیں، کتاب قابل مطالعہ ہو اور خصوصًا تذکرہ نویس و سیرت نگار حضرات کیلئے۔

(م-ن)

حالات ندوہ

رمضان کی تعطیل کے بعد ۵ شوال کو حسب دستور دارالعلوم کھل گیا۔ امتحانات کے نتائج رمضان ہی میں شائع ہو گئے تھے اور اسی زمانہ میں طلبہ اور ان کے سرپرستوں کو اطلاع دیدی گئی تھی اسلئے تعطیل کے بعد بغیر کسی خاص تعویق کے درس شروع ہو گیا۔ پرانے طلبہ تقریباً آگئے ہیں، نیا داخلہ بھی خاصہ ہو رہا ہے ابھی چند دن تک یہ سلسلہ جاری رہیگا، آئندہ اشاعت میں ہم انشاء اللہ مکمل اعداد و شمار شائع کر سکیں گے۔

ان صفحات کے قارئین کو معلوم ہو کہ مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہٗ وقتاً فوقتاً دارالعلوم تشریف لاتے رہتے ہیں تاکہ یہاں تعلیمی و انتظامی معاملات میں کارکنوں کی رہنمائی فرمائیں اور اپنے بیش قیمت مشوروں اور ہدایتوں سے انھیں لائحہ عمل کی ترتیب و تشکیل میں مدد دیں۔ چنانچہ حسب معمول آپ ۱۰ اکتوبر کو دارالعلوم تشریف لائے ہیں۔ ایک ہفتہ قیام رہیگا آپکی آمد سے دارالعلوم میں زندگی کی ایک لہر پیدا ہو جاتی ہے اور طالبین علم کو علمی فیوض و برکات سے استفادہ کا موقع ملتا ہے۔

ان صفحات میں طلبا دارالعلوم کی انجمن النادی العربی کا ذکر آچکا ہے عربی زبان میں اظہار خیال کی مشق اسکے قیام کا خاص مقصد ہے امسال اس انجمن کی ذمہ داریاں حسب ذیل اصحاب کے سپرد ہوئی ہیں۔

صدر	علی احمد متعلم دارالعلوم
ناظم طلبار کبار	عبدالحلیم " "
ناظم طلبار صغار	نظام الدین " "

مولانا ابوالحسن علی ادیب و مفسر دارالعلوم اور مولانا محمد ناظم ادیب دارالعلوم ناظر اعلیٰ کے فرائض انجام دیں گے۔

اس موقع پر معتمد تعلیم جناب مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ نے ایک بہت ہی پر اثر تقریر فرمائی جس میں آپنے طلبہ کو ان کے بلند مقاصد کی جانب توجہ دلائی آپنے فرمایا کہ عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ کسی درسگاہ کی بھلائی برائی کی ذمہ داری اسکے عہدہ داروں اور کارکنوں کے سر ہے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ درسگاہوں کی جان اور اسکے اصلی عناصر وہاں کے طلبہ ہوتے ہیں پھر اساتذہ اور ان کے بعد ارکان و منتظمین کسی درسگاہ کی ترقی و تنزل حقیقت میں طلبہ ہی کی ترقی و تنزل کا نام ہے۔ اسکے بعد آپنے ندوہ کے بلند مقاصد اور عصر حاضر میں اسکے طلبہ کے فرائض و واجبات کی جانب توجہ دلائی آپنے فرمایا کہ اس درسگاہ کا مقصد یہ ہے کہ یہاں دین کے ایسے سپاہی تیار کئے جائیں جنکی زندگیاں دین و مذہب کی خدمت کیلئے وقف ہوں اور وہ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کی مکمل تصویر ہوں ہندوستان کے حالات خواہ ایسے ہوں اور یہاں چاہے جو نظام رائج ہو دین کے محافظوں کی بہرحال ضرورت رہیگی غیر مسلم حکومتوں کا کیا ذکر ہے خالص مسلم حکومتوں میں بھی ایسے دیندار اور صاحب فہم و بصیرت علما کی ضرورت ہے جو دین حق کے رہنما اور محافظ ہوں۔ اسلام کے ان سپاہیوں کی مثال غزوہ احد کے ان تیر اندازوں کی سی ہے جنھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے درہ کوہ کی حفاظت پر مامور کیا تھا اور فرمایا تھا کہ خواہ میدان جنگ کی کوئی حالت ہو مسلمانوں کو فتح ہو یا شکست تم اپنی جگہ مضبوطی سے جمے رہیں آج الحاد و بیدینی کی فوجیں دین کے لشکر پر حملہ آور ہیں، محافظین اسلام کا فرض ہے کہ وہ سرحد کی حفاظت کریں اور مذہب کے مورچوں کی رخنہ بندی سے غافل نہ ہوں کہ دشمنوں کا رخ انھیں کی طرف ہے۔ آخر میں آپنے طلبہ کو درس و مطالعہ کیطرف توجہ دلائی

۱۳ر نومبر کو کمال یار جنگ کمیٹی کے ارکان دارالعلوم آئے اور ایک گھنٹہ سے زائد یہاں کے مختلف شعبوں کو دیکھتے رہے کتبخانہ، مسجد، دارالاقامہ (بورڈنگ ہاؤس) اور (طلبہ کی انجمن) الاصلاح کو خاص طور سے دیکھا عربی زبان کی تعلیم کے سلسلہ میں دارالعلوم کے نئے اسلوب سے خاصے متاثر ہوئے۔ جاتے وقت ندوہ کے مقاصد، نظام عمل، طریق کار اور نصاب تعلیم سے متعلق ضروری لٹریچر اپنے ہمراہ لے گئے۔ کمیٹی کی طرف سے مسلمانوں کی تعلیم کے بارہ میں جو سوالات شائع ہوئے تھے ندوہ کی جانب سے اُن کا جو جواب مرتب کیا گیا تھا وہ بھی ساتھ کردیا گیا۔

رحمتِ عالم

مبتدی طالبعلموں، کم پڑھے لکھے لوگوں، بچوں اور عورتوں کے لئے
سیرۃ نبوی صلعم کی ایک ایسی مختصر سادہ اور آسان کتاب کی ضرورت تھی جسکے بیان میں
کوئی الجھاؤ اور عبارت میں کوئی دقت نہو، پھر بھی بیان مستند اور واقعات صحیح
ہوں، اسی ضرورت کو سامنے رکھکر سیرت نگار نبوئی سید سلیمان ندوی نے یہ
مختصر سیرت لکھکر شائع کی اور اس کا سارا منافع دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں
چھوٹے بچوں کے دار الاقامہ بنانے کے لئے وقف کر دیا ہے۔ یہ کتاب پانچ ہزار
کی تعداد میں چھپی ہے، ضرورت ہے کہ ہر مسلمان بچہ کے ہاتھ میں اس کا ایک
نسخہ ہو، اہل خیر کو اسکی خریداری سے انشاء اللہ تعالیٰ دوہرا ثواب حاصل ہوگا۔

قیمت فی نسخہ علاوہ محصول ڈاک۔ ایک روپیہ چار آنہ عہ ہے
لیکن ۲۰ نسخوں کے خریدار سے ایک روپیہ فی نسخہ کے حساب سے لیا جائے گا
مجلد کی قیمت ۲ر فی نسخہ زائد ہوگی۔ علاوہ محصول

دار المصنفین اعظم گڈھ
جمعیۃ التعاون (کو آپریٹیو سوسائٹی)
دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے مل سکتی ہے

ملکی اور سیاسی کتابوں کا ذخیرہ

نام کتاب	قیمت
ش پارے	عمر
زادی	۱۲ر
زادی	۱۲ر
زادی (ناول)	۶ر
اندمثہ	۱۲ر
ابن مسعود	۱۲ر
احیا اسلام	۵ر
اسٹالن	۱۲ر
اسٹالن کلاں	۸ر
اسلامی ہند پر ایک نظر	۸ر
اصلاح قوم و ملت	۸ر
اعلائے کلمۃ الحق	۴ر
افغان بادشاہ	۶ر
افغانستان کابل	عمر
انسانی قربانیاں	۸ر
انسداد حرامکاری	۱۰ر
انسداد گداگری	۱۰ر
انقلاب افغانستان	۶ر
انقلاب دہلی	۸ر
انقلاب ۱۸۵۷ء	عمر
انقلاب فرانس (از عبد الرزاق)	۸ر
انقلاب فرانس (از عبد القادر)	۱۲ر
انقلاب فرانس (از باری)	۱۰ر
انقلاب بلقان (از انیس احمد)	عمر
انقلاب روس	۱۲ر
انقلاب [illegible] کا	۸ر
انقلابی [illegible]	عمر
انگورہ اور ترک	۱۲ر
آہنگ سندم	۸ر
آئینۂ جمہوریت	۴ر
آزادی کی جنگ (ایک زاویہ نگاہ سے)	۱۲ر
افسانۂ ترکستان	عمر
بالشویک شہزادی	۴ر
بالشوی شہزادی	۴ر
بالشویک جنرل	۸ر
برطانیہ اور افغانستان کے تعلقات	۹ر
برہمن دیوتا	

نام کتاب	قیمت
بہار جاوداں	۶ر
بجارت تیا	۱۲ر
بغاوت ستام	۱۲ر
بیداری ہند	۶ر
پیام عمل	۶ر
پیکار (سیاسی ڈرامہ)	عمر
تاریخ بغاوت ہند	۱۲ر
تاریخ حریت اسلام	۱۲ر
ترجمان احرار	۱۲ر
ترک معالات	۴ر
ترک معالات	۲ر
تذکرہ احیاء اسلام	۱۲ر
ترکی میں مغربی و مشرقی کشمکش	۶ر
تعمیر نو	۱۲ر
تقاریر کو کھلے	۱۲ر
تقاریر محمد علی ۲ جلد	عمر
تلاش حق ۲ جلد	[illegible]
تیک مہاراج	۱ر
تاریخ کانگریس	۱۲ر
ٹالسٹائی	۴ر
ٹالسٹائی کی کہانی	۸ر
جاپان	۶ر
جانباز ترک	۸ر
جذبات احرار	۴ر
جذبات جوہر	۱۲ر
جذبات حریت	۸ر
جلا وطنی کی داستان	۱۲ر
جمال الدین افغانی	۸ر
جمال الدین افغانی (از ظفر علی خان)	۴ر
جنگ آزادی	۱۲ر
جنگ صلیب و ہلال	۱۲ر
جنگ طرابلس	۴ر
جنگ نامہ اسلام	عمر
جواب شکوہ	۲ر
جواہرات (مشاعرۂ آل انڈیا کانگریس)	۸ر
جواہر لعل	۳ر
چمن بے خزاں	۴ر

نام کتاب	قیمت
چند اہم خطوط	۸ر
چیمبرلین	۱۲ر
حالات حسرت	۸ر
حکومت خود اختیاری	عمر
حیات خان	۱۲ر
حقیقت ہنگامۂ پنجاب و کارنامے	۱۲ر
حیات صلاح الدین	۶ر
خالد بن ولید (ڈرامہ)	۸ر
خالدہ خانم	۱۲ر
خطابات کی اصلیت	۴ر
خطبات سیاسیہ	۸ر
خطبۂ صدارت تحریری	۲ر
خطبۂ صدارت تقریری	۲ر
خطبۂ صدارت مولانا محمد علی	۴ر
خطبۂ صدارت مولانا محمود الحسن	۲ر
خلافت اور مقاطعہ	۲ر
خلافت اور ہندوستان	۸ر
خواتین انگورہ قسم اول	عمر
خوشحال ہندوستان	عمر
خون کے آنسو حصہ ۱	۴ر
خون ناحق	۸ر
خیر الدین پاشا	۱ر۸
دختران شمشیر	عمر
دختر سمرنا	۱۲ر
داستان زوال	۱۲ر
داستان نامہ	۵ر
درس عمل	۵ر
دعوت حق	۶ر
دنیا میں دوزخ	عمر
دو خدائی خدمتگار	۱۲ر
دولت عزیزیہ	۶ر
دیگر ممالک میں قطع تعلق	۱۰ر
رپورٹ کانگریس احمد آباد	عمر
روایات اسلام	۴ر
روح سیاست	۸ر
روز ولٹ	۱۲ر
روسی افسانے	۱۲ر

ملنے

صدیق بک ڈپو لکھنؤ — یا — اسکول بک ایجنسی نظیر آباد لکھنؤ

Publisher Syed Hamid Ali Printer Banke Lal Printed at Nami Press, Lucknow.

جس کا مقصد
مسلمانوں کی تعلیمی اور تعمیری خدمت ہو

زیرنگرانی

علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ

جلد ذیقعدہ ۱۳۵۹ھ مطابق دسمبر ۱۹۴۰ء نمبر ۱۲

قیمت فی پرچہ تین آنے سالانہ دو روپے

تمام خط و کتابت اور ترسیل زر منیجر رسالہ الندوہ بادشاہ باغ لکھنؤ کے پتہ پر ہونی چاہئے

شذرات

خدا کا شکر ہے کہ الندوہ زندگی کی بارہ منزلیں پوری کر رہا ہے۔ اس مہینہ کا رسالہ سال کا آخری پرچہ ہے جنوری سے نئے سال کا آغاز ہوگا۔ دوستوں، بزرگوں، اور عزیزوں کا شکریہ کہ انکی امداد و اعانت نے قدم قدم پر سہارا دیا۔ انکی عنایتوں نے راہ کی مشکلیں دور کیں۔ اور انکی کرم فرمائیوں نے اس منزل تک پہونچایا۔ امید ہے کہ مہربانیوں کا یہ سلسلہ آئندہ بھی اسیطرح جاری رہے گا۔

اس وقت خریداروں کی تعداد پونے تین سو تک پہونچ چکی ہے۔ ضرورت ہے کہ آئندہ سال نہ صرف یہ تعداد قائم رہے بلکہ اس میں اور اضافہ ہو۔ تاکہ رسالہ کی بنیادیں مضبوط ہو جائیں اور استقلال کے ساتھ اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے ندوہ کے دوستوں اور ہمدردوں کے نزدیک یہ کوئی دشوار کام نہیں۔ خود اس درسگاہ کے گذشتہ اور موجودہ طلبا کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہے انکی ادنیٰ توجہ بھی رسالہ کو ثبات اور استقلال بخش سکتی ہے۔ امید ہے کہ وہ اس جانب خاص توجہ فرمائیں گے۔

مسلمانوں میں روز بروز جو دینی بے حسی پیدا ہوتی جاتی ہے اسکی بنا پر عربی مدارس امراء اور ارباب ثروت کے بچوں سے خالی ہوتے جاتے ہیں۔ اب دینی درسگاہوں کی رونق و آبادی غرباء کے دم سے ہے لیکن افسوس کہ انکی پریشان حالی تعلیمی مصارف کی متحمل نہیں مجبوراً اس قسم کے طلبہ امداد و اعانت کے سہارے آگے بڑھتے ہیں اور اپنی تعلیم کی منزلیں طے کرتے ہیں۔ ندوہ میں ہمیشہ اس قسم کا فنڈ رہا جس سے مستحق طلبہ کو وظیفے دیئے جاتے تھے۔ لیکن ادھر چند برس سے یہ شعبہ بھی مسلمانوں کی بے توجہی کا شکار ہوتا جا رہا ہے یہ صورت حال مدرسہ کے کارکنوں کے لئے حد درجہ پریشان کن ہے امید ہے کہ ملک کے ارباب خیر اس جانب توجہ فرمائیں گے۔ اور دین کی قطعبندی اور ملت کی پاسبانی میں مدرسہ کے کارکنوں کی مدد فرمائیں گے۔

پچھلے مہینہ کا رسالہ شائع ہو چکا تھا۔ کہ مولانا محمد سجاد ناظم عام جمعیت علماء ہند اور نائب امیر شریعت صوبہ بہار کے انتقال کی دردانگیز اطلاع ملی۔ مرحوم ہندوستان کے ان مخلص اور باہمت علماء میں تھے جنکی نظیر مشکل سے ملیگی۔ انکی ذات دین و سیاست کے اجتماع کا بہترین مظہر تھی۔ اور علمی و دینی حلقوں کے علاوہ خالص سیاسی مجلسوں میں بھی انکی فکر و تدبیر مسلم تھی۔ دوست دشمن سب انکی قوت عمل اور تنظیمی قابلیت کے معترف تھے۔ سنہ ۱۹۱۸ء سے سنہ ۱۹۴۰ء تک مشکل سے ہندوستان کی کوئی ایسی سیاسی یا مذہبی تحریک ہوگی جسمیں مرحوم اپنی بہترین صلاحیتوں کے ساتھ شریک نہ ہوئے ہوں اور جو انکے قیمتی مشوروں اور صلاحوں سے محروم ہو۔ بہار کی مجلس امارت شرعیہ تمام تر انکی سعی و کوشش کی رہین منت ہے خلافت کمیٹی، جمعیت العلماء، مسلم یونیورسٹی پارٹی، ہر مجلس میں انکی شخصیت نمایاں تھی۔ مرحوم کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ سخت سے سخت نازک موقعوں پر بھی مطمئن اور پرسکون رہتے تھے۔ اور انتہائی پریشانی کے عالم میں بھی انکی قوت فیصلہ میں کوئی ضعف نہ پیدا ہوتا تھا۔ وہ ہمیشہ پرسکون و پُرامید رہتے تھے۔ میں نے خود انھیں سخت ہنگاموں کے زمانہ میں کافی ہشاش بشاش پایا۔ سنہ ۱۹۳۱ء کے پرشور سیاسی زمانے میں جب انکے دوستوں رفیقوں اور عزیزوں کی گرفتاریاں ہو رہی تھیں۔ خود ان پر بعض امتناعی احکام نافذ تھے۔ مالی پریشانیاں جسمانی آزار اور دماغی الجھنیں پریشان کن تھیں لیکن اس حالت میں بھی انھیں دیکھا ہے کہ مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہے ہیں۔ اور چہرہ پر کہیں اضطراب و پریشانی کی ایک شکن بھی نہیں نظر آتی

ندوہ سے مرحوم کا دیرینہ تعلق تھا مجلس منتظمہ کے عرصہ سے رکن تھے لیکن اس رسمی تعلق سے کہیں زیادہ انھیں اس درسگاہ اور اسکے کارکنوں سے محبت تھی جب لکھنؤ آتے تو جناب ڈاکٹر عبد العلی صاحب ناظم ندوۃ العلماء سے ضرور ملتے بلکہ بعض مرتبہ کئی کئی دن وہیں قیام بھی کرتے۔

مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ ہوتے تو خواہ کتنی مشغولیت ہو ندوہ آکر ان سے ضرور ملتے اور مرحوم کو اپنی صحبت سے سرفراز فرمائے۔

میری محسن کتابیں

از مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی

حکم ملا ہے ایک ندوہ بانی کو، ایک گمنام و بدنام، گوشہ نشین قصباتی کو کہ وہ بھی اہل فضل وکمال کی صف میں مل آئے! اور اپنا افسانہ ہوائی دنیا کو کہ سنائے! اور یہ حکم دینے کون؟ ایک بزرگ[1] اور ایک بزرگ صورت و بزرگ سیرت نور دیدۂ بزرگوں[2] اور خوردوں کو بالعموم اسی داستان میں آتا ہے تو پیچ، تعمیل فرمائش ابھی ہوئی جاتی ہے، لیکن آپ حضرات تو بھی سوچ سمجھ لیں۔ دنیا آپکے حسن انتخاب کو کیا کہیگی: ؎ دیوانہ ایش ارائیں اضیں دیوانگی!

آنکھ کھلی ایک خالص مذہبی گھرانے میں۔ باپ (اللہ انکی تربت ٹھنڈی رکھے) ایک اچھے سرکاری عہدہ دار ہونے کے باوجود علماً مولوی اور عملاً دیندار (اللہ انکی عمر میں مزید برکت عطا فرمائے) شب بیدار، تہجد گزار۔ زمانہ انیسویں صدی عیسوی کے اخیر کا۔ گھر پر مشرقی تعلیم کا چلن ایک حد تک باقی تھا۔ مولوی صاحب کے پاس پڑھنے بٹھائے گئے۔ قرآن ناظرہ کے ساتھ ساتھ اردو بھی شروع ہوگئی مولوی محمد اسمٰعیل صاحب میرٹھی مرحوم کی ریڈریں کچھ اس طرح مزہ لیکر پڑھیں کہ انکی شیرینی اب تک یاد ہے۔ اور اردو ٹوٹی پھوٹی جو کچھ بھی لکھنی آگئی۔ انکی بنیاد اسی وقت سے پڑگئی۔ فارسی میں گلستاں، بوستاں رقعات قتیل، یوسف زلیخا کے علاوہ کیمیائے سعادت بھی کچھ سمجھے۔ اور زیادہ تر بے سمجھے بوجھے ختم کر ڈالی۔ داخلہ اسکول میں ہوا زبان عربی ملی۔ استاد ملے شفیق۔ عربی سے جو الجھن اور وحشت نہ ہونے پائی، تصرف ہے انھیں بزرگوں کا۔

ابھی بچپن ہی تھا کہ ایک انگریزی تعلیم یافتہ "چچازاد" بھائی نے شوق اخبارات کا پیدا کرا دیا۔ دل خارجی مطالعہ میں لگنے لگا۔ اخبار، رسالہ، اشتہار، کتاب جو بھی چیز بھی سامنے آجاتی مجال نہ تھی کہ بچ کر نکل جائے۔ اردو کے علاوہ انگریزی بھی

---

[1] مولانا سید سلیمان صاحب ندوی۔

[2] علی میاں سلمہا اللہ تعالیٰ۔

ھوا۔ میں کچھ نہ کچھ شد بد تو ہو ہی گئی تھی۔ فقہ، تفسیر، تاریخ، تصوف، منطق، مناظرہ، ادب، فسانہ، ناول، ناٹک، طب، شاعری سب ہی کچھ تو اس میں آگیا۔ جوش خاصہ مذہبی موجود تھا۔ آریوں اور عیسائیوں کی مناظرہ کی کتابوں پر نظر پڑی۔ اک آگ ہی لگ گئی تلاش جوابات کی ہوئی۔ ذہن ہی سادہ گئی۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری کی "ترک اسلام" وغیرہ مرزا غلام احمد قادیانی کی "سرمہ چشم آریہ" وغیرہ، حکیم نور الدین کی "نور الدین" مولانا محمد علی مونگیری ناظم ندوہ کا ماہنامہ "تحفۂ محمدیہ" اسی دور کی یادگاریں ہیں۔ اور ہاں ایک نام تو ذہن سے نکلا ہی جاتا تھا اب وہ بیچارہ یوں ہی گمنام ہو گئے ہیں۔ مولوی احسان اللہ عباسی وکیل گورکھپور مصنف "الاسلام" "تاریخ الاسلام" وغیرہ۔ ذوق و شوق سے ساری کتابیں پڑھیں۔ اور اپنی بساط کے لائق کچھ لکھا لکھایا بھی۔ ادبی میدان میں شرر مرحوم، اور انکے معاصرین منشی سجاد حسین اڈیٹر اودھ پنچ وغیرہ کا دور دورہ رہا۔

یہ دور کہنا چاہئے کہ سنہ ۱۹۰۱ء سے سنہ ۱۹۰۸ء تک رہا۔ سنہ ء میں نیاز "مقالات شبلی" اور "الکلام" سے حاصل ہوا! اور اسی وجہ سے جادو مولانا شبلی کا چل گیا۔ تلاش انکی اور تحریروں کی شروع ہوئی۔ انھیں پڑھتا نہ تھا، تلاوت کرتا تھا۔ "الندوہ" والد مرحوم کے نام جاری کرایا۔ پرانا پرچہ ستاتا۔ تازہ پرچہ کے لئے دن گنا کرتا۔ مولانا کے ہر مضمون کی ایک ایک سطر بار بار پڑھتا۔ فقرہ کے فقرہ حفظ ہو گئے۔ ترکیبیں زبان پر چڑھ گئیں۔ مہینوں سے کہتا پھرا۔ بلکہ لڑتا پھرتا کہ علامہ شبلی اس دور کے مجدد ہیں۔ نذیر حالی، سرسید، آزاد کے ساتھ بھی حسن اعتقاد قائم رہا۔

سنہ ۱۹۰۸ء میں عمر کا سولہواں سال تھا کہ میٹرک پاس کر لکھنؤ میں کالج میں داخل ہوا۔ اور اب انگریزی کتابوں ٹوٹ پڑا۔ اتفاق سے شروع ہی میں ایک بڑے انگریز ڈاکٹر کی کتاب سامنے آگئی۔ ظالم نے کھل کر اور بڑے زور دار الفاظ میں مادیت کی حمایت اور مذہب و اخلاق دونوں سے بغاوت کی تھی۔ موضوع یہ تھا کہ عصمت اور نیک چلنی کے کوئی معنی نہیں محض پرانے لوگوں کا گڑھا ہوا ڈھکوسلہ ہے۔ اصل شے صحت اور مادی راحت ہے۔ صحت کا خیال رکھکر جو کچھ جی میں آئے کرو نکاح وغیرہ کی قیدیں سب لایعنی ہیں۔ مصنف کے پیش نظر اسلام یقیناً نہ تھا۔ لیکن زد تو بہرحال اسلام پر پڑتی ہی تھی۔ خیالات ڈانواڈول ہونے لگے۔ اور اس زمانہ میں اتفاق سے ایک اور کتاب بھی نظر سے گزری۔ یہ ادبی تھی۔ مشاہیر عالم کے اقوال و خیالات پر اس میں ایک جگہ پورے قد کی تصویر صفحہ بھر پر رسول اللہ صلعم کی درج تھی۔ اور نیچے سند یہ بھی تھی کہ فلاں [illegible] کے نمونہ

میں قلمی تصویر موجود ہے جس کا نقشہ ہے، جیسے بیٹھا کر سر پر عمامہ، جسم پر جبا، تلوار کمر سے بندھی ہوئی، شانہ پر ترکش، ہاتھ میں کمان
تیور اور بل پڑے ہوئے، آنکھوں سے غصہ، بشرہ سے تند خوئی عیاں، شان رحمۃ العالمین الگ رہی، معمولی نرم دلی اور نیک خوئی کے
کے آثار بھی یکسر مفقود۔ یہ سند درج، مغربیت سے مرعوب دماغ کے لئے اب شک وشبہ کی گنجائش ہی کہاں رہ گئی تھی؟

دماغ پہلے ہی مختل ہو چکا تھا، اب دل بھی مجروح ہو گیا۔ ارتداد دبے پاؤں آیا، اسلامیت کو مٹا، ایمان کو مٹا، خود مسلط
ہو گیا۔ آریت، مسیحیت، دوسرے مذاہب سے دل پہلے ہی سے ہٹا ہوا تھا۔ اب کھلم کھلا آزادی اور آزاد خیالی کی حکومت قائم ہو گئی
الحاد کا فتنہ۔ بے دینی کی ترنگ۔ "ریشنلزم" (عقلیت) سے پینگ بڑھے۔ "اگناسٹیسزم" (لاادریت) سے یارانہ گٹھا۔ لندن کی ریشنلسٹ
ایسوسی ایشن (انجمن عقلیین) کی ممبری قبول کر لی۔ سارا وقت ہیوم، مل، اسپنسر، ربی، کیلے، ہیگل، ڈکسن، بریڈلے، بوشنر، ڈارون
اور یونان کے حکماء، لا ادرین متشککین وغیرہ کی نذر ہونے لگا۔ مل کو اتنا پڑھا، اتنا پڑھا کہ لڑکوں میں مل کا حافظ مشہور ہو گیا
ایک اور کتاب طب سے متعلق عضویات دماغی MENTAL PHYSIS LOGY پر ایک مشہور انگریز ڈاکٹر کی۔ اس زمانہ میں نظر
سے گزری۔ ذکر امراض عصبی و دماغی کا تھا۔ بدبخت نے مرض صرع کے ضمن میں لکھا تھا کہ اسکی علامات کو پرانے زمانہ میں لوگ "وحی الٰہی"
سمجھنے لگتے تھے، اور مصروع کے عام قوائے دماغی تو بہت اچھے ہوتے ہیں۔ وہ دنیا میں انقلاب برپا کر سکتا ہے۔ مذہب اور سلطنت
دونوں قائم کر سکتا ہے، جس طرح .... ارتداد الحاد اور اسلام بیزاری میں اگر کچھ کسر باقی تھی، تو اب پوری ہو گئی
ایف، اے کے امتحان کی فیس جانے لگی۔ تو فارم میں جہاں مذہب کا خانہ ہوتا ہے وہاں بجائے مسلمان کے ریشنلسٹ لکھ دیا!
الحاد، بے دینی یا عقلیت کا یہ دور کوئی ۸-۱۰ سال تک قائم رہا۔ ایف اے، بی، اے کی تکمیل ہوئی[5]، ایم اے کی تکمیل
نہ ہوئی۔ لیکن تعلیم تو بہرحال فلسفہ لیکر پائی۔ مضمون نگاری، تصنیف، تالیف، اردو اور انگریزی دونوں جاری رہی ہوتے ہوتے
سنہ ۱۹۱۸ء آ گیا۔ آخر سال تھا کہ ایک دوست کی تحریک پر انگریزی میں بودھ مذہب پر کتابیں دیکھیں اور دل کسی قدر ادھر
مائل ہوا۔ معاً بعد ہند فلسفہ کا مطالعہ شروع ہو گیا۔ خصوصاً مسز بسنٹ اور بنارس کے مشہور فلسفی ڈاکٹر بھگوان داس کے انگریزی
تراجم و تالیفات کے ذریعہ سے "مغربیت" "مادیت اور عقلیت کا جو تیز نشہ سوار تھا، وہ بتدریج ہلکا ہونے لگا۔ اور دل اس کا
قائل ہو گیا کہ مادی اور حسی دنیا کے علاوہ بھی کسی اور عالم کا وجود ہے ضرور بھگوت گیتا کا انگریزی ایڈیشن (مسز بسنٹ کا ترجمہ

۵ انہماک خاص کے مضامین دو تھے ایک منطق دوسرے نفسیات، نفسیات میں سب سے زیادہ اثر امریکہ کے مشہور استاد فن ولیم جیمس کا رہا

اس حیثیت سے اکسیر ثابت ہوا۔ خدا کا نام اب قابلِ مضحکہ نہ رہا۔ "روح" اور "روحانیت" کے الفاظ سے نفرت و بیزاری دور
ہوگئی۔ ہاں اسی درمیان میں مولانا شبلی کی سیرۃ النبی کی جلد اول شائع ہو چکی تھی۔ اسے خوب غور سے پڑھا تھا۔ اور اس سے
بھی ایسا اثر قبول کیا تھا۔ صاحبِ سیرۃ کی رسالت پر ایمان تو اب بھی دور کی چیز تھی، لیکن ما۔ گوبیں وغیرہ کے اثر سے (نعوذ باللہ)
جو ایک خداع اور خونخوار سردار کا تصور قائم ہو گیا تھا۔ آنکھوں سے یہ زنگ اسی سیرۃ کے مطالعہ کی برکت سے کٹ چکا تھا
اور اسکی جگہ ایک خوش نیت مصلحِ قوم کے تخیل نے لے لی تھی۔

اب دل مسلمان صوفیہ کے اقوال و احوال میں بھی لگنے لگا تھا۔ کشف و کرامت کے ذکر پر اب یہ نہ ہوتا کہ بیساختہ ہنسی آجاتی
بلکہ تلاش اس قسم کے ملفوظات و منقولات کی رہنے لگی۔ فارسی اور اردو کتابیں بہت سی اس سلسلہ میں پڑھ ڈالیں۔ مسلمان تو اب بھی
نہ تھا لیکن طغیان و عدوان کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ محض کتابوں کے سلسلہ میں محض شخصیتوں کا ذکر یقیناً بے محل ہے۔ لیکن اتنا کہے بغیر آگے
بڑھا نہیں جاتا کہ اس دور میں دو یا تین زندہ ہستیاں بھی ایسی تھیں، جن سے طبیعت رفتہ رفتہ اور بہت تدریجی رفتار سے سہی۔ لیکن
بہر حال اصلاحی ہی اثر قبول کرتی رہی۔ ایک اردو کے مشہور حکیم و ظریف شاعر اکبر الہ آبادی ہیں۔ دوسرے کامریڈ کے اڈیٹر اسوقت کے
"مسٹر" اور اسی درمیان میں "مولانا" ہو جانے والے محمد علی۔ ان دو کے بعد ہلکا ہلکا اثر مولانا حمید الدین مفسرِ قرآن کا بھی پڑا۔

۱۹۱۹ء قریبِ ختم تھا کہ ایک عزیز کے پاس مثنوی معنوی (کانپوری ایڈیشن) کے چھ ضخیم دفتر دکھائی دیئے۔ (اللہ
رحمت اللہ رحمہ کی تربت پر اپنی رحمت کے پھول برسائے) کاغذ، کتابت، طباعت کے جملہ محاسن ظاہری سے آراستہ، حاشیہ
نہایت مفصل۔ چند سال ادھر توجہ بھی نہ کرتا۔ لیکن اب زمین پوری طرح تیار ہو چکی تھی۔ معدہ کو غذا گھنٹہ اور منٹ کی پابندی
کے ساتھ ٹھیک وقت سے ملی۔ مطالعہ ذوق و شوق سے شروع کیا۔ اور ہر ہر قدم پر شوق کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔
الفاظ ملنے مشکل ہیں جن میں اس ذوق و شوق کی کیفیت بیان کی جائے۔ فارسی استعداد واجبی ہی تھی، سلوک و معرفت
کے نکات و اسرار الگ رہے، ظاہری لفظی معنی بھی صدہا ہزارہا اشعار کے سمجھ میں نہ آئے لیکن انہماک کا یہ عالم کہ ایک شعر
بھی چھوڑنے کو جی نہ چاہتا۔ اور دل بے اختیار یہ چاہتا کہ جس طرح بھی ممکن ہو سارے دفتروں کو ایک دم سے چاٹ جاؤں۔
کھانے پینے اٹھنے چلنے تک کا ہوش نہ رہا۔ طبیعت بے قرار کہ کمرہ بند کئے بس اسی کو شروع سے آخر تک پڑھتا چلا جاؤں۔ ہر ہر شعر

تہ و نشتر بنکر دل کے اندر پیوست ہوتا جاتا اور تشکیک، ارتیاب، عقلیت و مادیت کے بادل ایک ایک کرکے سب چھٹتے چلے جاتے مثنوی علمی رنگ کے دل کو زیادہ نہ بھاتی خصوصاً شیخ ابن عربیؒ کے نظریات جہاں آجاتے وہاں تو معلوم ہونے لگتا کہ یہ تو پھر وہی افلاطون وغیرہ کے طرز کی باتیں آگئیں جن سے گھبرا کر اور اکتا کر میں بھاگا تھا حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے چھوٹے رسالے اور مختصر حاشیے جہاں نظر پڑجاتے طبیعت پھڑک جاتی۔ اور دل گواہی دے اٹھتا کہ بیشک یہ قول سچے ہی کا ہو سکتا ہے۔

مولاناؒ نے حضرت رسالت کے باب میں کہا ہے۔ کہ اس پر کسی معجزہ یا خارق عادت سے دلیل خارجی لانے کے کیا معنی پیمبر کی تو ہر ہر بات خود ایک معجزہ ہوتی ہے۔

روئے و آواز پیمبر معجزہ ست

بس اپنا بالکل یہی حال خود مثنوی سے متعلق تھا۔ ہر شعر خود پکار کر شہادت دے رہا تھا کہ میں سچے ہی کی زبان سے نکلا ہوں، کسی اور دلیل و برہان کی حاجت ہی نہ تھی ـــــ مثنوی کا مطالعہ ہفتوں نہیں، مہینوں مسلسل جاری رہا۔ اور اس ساری مدت میں ایک نشہ سا سر پر سوار رہا۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، چلتے پھرتے، بس ایکی دھن۔ اسی عالم میں کہیں مرگیا ہوتا۔ تو عجب نہیں کہ منکر نکیر کے سامنے مذہب کے سوال پر جواب زبان سے یہی نکلتا کہ" وہی مذہب ہے جو مولانائے روم کا مذہب تھا" قرآن و رسالت تک پر ابھی ایمان پختہ نہ تھا، بس دلیل سب سے بڑی یہی تھی کہ جب صاحب مثنوی اس پر ایمان رکھتے ہیں تو کیوں نہ یہ دین سچا ہوگا۔

غالباً اگست سنہ ۲۰ء تھا کہ ایک عزیز کے پاس مولوی محمد علی لاہوری کا انگریزی ترجمۃ القرآن پڑھنے میں آیا اور طبیعت نے اس سے بھی بہت گہرا اور اچھا اثر قبول کیا۔ مغربی راہ سے آئے ہوئے بیسیوں شبہات و اعتراضات اس ترجمہ و تفسیر سے دور ہوگئے۔ اور یہ اثر ابتک قائم ہے۔ اس بیس سال کے عرصہ میں خامیاں اور غلطیاں بہت سی بلکہ بعض جگہ تو ایسی جسارتیں جنکے ڈانڈے تحریف سے مل جاتے ہیں، اس ترجمہ و تفسیر کی علم میں آچکیں لیکن انگریزی خوانوں اور مغرب زدوں کے حق میں اسکے مفید اور بہت مفید ہونے میں اب بھی ذرا کلام نہیں ـــــ ہدایت کا واسطہ جب اللہ کی حکمت

صریحاً غیر مسلموں کے کلام کو بنا دیتی ہے۔ تو یہ تو بہرحال اللہ کے کلام کا ترجمہ و حاشیہ ہے۔ مترجم کی بعض اعتقادی غلطیوں کی بنا پر انکی ساری کوشش سے بدظن ہو جانا قرین انصاف و مقتضائے تحقیق نہیں۔

نیم مسلمان ہو چکنے کے بعد پھر پورا مسلمان بن جانا اور ادخلوا فی السلم کافۃ کے تحت میں آجانا کچھ زیادہ دشوار نہ تھا۔ اقبال کی اردو اور فارسی نظمیں۔ محمد علی کی نظمیں اور تحریریں (خصوصاً زمانۂ نظربندی سنہ ۱۹۲۱-۲۳ء کی) اپنا اپنا کام کرتی رہیں دل میں گھر کرتی گئیں۔ یہاں تک کہ مکتوبات مجددی نے اس پر پوری مہر لگا دی۔ مکتوبات کا جو امرتسری نسخہ متعدد جلدوں میں پیش نظر رہا وہ اپنی صفائی، خوشنمائی اور کثرت حواشی کے لحاظ سے گویا مثنوی ہی کے اسی کانپوری اڈیشن کی ٹکر کا تھا اور اثر میں شاید اس سے کچھ ہی کم۔ مثنوی سے اگر طبیعت میں ایک شورش اور تڑپ پیدا ہو گئی تھی۔ تو اس میں سکون اور ٹھہراؤ مکتوبات ہی کی برکت سے حاصل ہوا۔ درمیان میں عطارؒ، سنائیؒ، جامیؒ۔ شیخ جیلانیؒ۔ غزالیؒ، سہروردیؒ وغیرہم اکابر شیوخ کی خدا معلوم کتنی کتابیں نظم و نثر کی نظر سے گزر گئیں۔ لیکن دل پر نقش انھیں دو کتابوں کا سب سے زیادہ گہرا بیٹھا رہا۔ پہلے مثنوی اور پھر مکتوبات۔ حالانکہ سمجھ میں دونوں کا بڑا حصہ اسوقت تو کیا آتا، ابتک نہیں آیا۔

حال کی انگریزی کتابوں میں ایک قابل ذکر کتاب اور یادگاری یہ نو مسلم یہودی لیوپولڈ ویس محمد اسد کی ISLAM ON THE CROSS ROAD ہے۔ دیکھنے میں چھوٹی سی معنویت کے لحاظ سے بہت بڑی اور گہری ہے۔ ہر انگریزی خواں کے ہاتھ میں جانے کے قابل۔ بڑی مسرت اسے پڑھکر یہ ہوئی کہ جو خیالات تہذیب فرنگ و اسلام سے متعلق پہلے سے اپنے قائم ہو چکے تھے۔ یہ مغربی مفکر بھی گویا تمام تر انھیں کی تائید کر رہا ہے۔

سنہ ۲۷ء یہ تھا کہ ایک دوست کی رہنمائی سے پہلے رسائی مولانا تھانوی مدظلہ کے مواعظ اور بعض رسائل سلوک تک ہوئی۔ اور پھر سنہ ۲۸ء میں خود مولانا اور انکی دوسری تصانیف تک۔ اس نے حقائق دینی و معرفانی کا ایک نیا عالم نظر کے سامنے کر دیا۔ اب ادھر چند سال سے مسلسل شغل اس بے علم و نااہل کا خدمت قرآنی کا ہے۔ اپنا تجربہ یہ ہے کہ دوسرے حضرات کے ہاں اکثر اوراق پر اوراق الٹ جانے سے بھی وہ گر ہاتھ نہیں لگتے۔ جو مفسر تھانوی کے یہاں چند سطروں کے اندر میسر آجاتے ہیں۔ معاصرت کا ابتلا عجب ابتلا ہے۔ اللہ سب کو محفوظ رکھے۔ جو دیکھنا نہیں چاہتے۔ انھیں آنکھیں

چھپ کر رکھا بھی کیسے جا سکتا ہے؟ ــــ اور یہ صرف تفسیر یا دوسرے علوم ظاہری ہی پر موقوف نہیں ہے۔ علوم باطنی میں تو پایہ شاید کچھ بلند تر ہی نکلے ؎

اے لقائے تو جواب ہر سوال

مشکل از تو حل شود بے قیل و قال

محض کتابوں کی تعداد ہے اتنی بڑی کہ سب کی تفصیل لکھی جائے، تو بجائے خود ایک کتاب تیار ہو جائے۔ مختصر بلکہ مختصر در مختصر یہ کہ حدیث میں صحیح بخاری اور اسکی شرح فتح الباری نے آنکھیں کھول دیں۔ اور فقہ میں شرح صدر کے لئے ائمہ حنفیہ کے اقوال بالکل کافی ثابت ہوئے۔ فہم قرآنی میں معروف و متداول تفسیروں کو معین و مفید پایا، انکی بے وقعتی خود اپنی محرومی کی دلیل ہے ــــ ان کتابوں کا نام اس بے تکلفی سے لے رہا ہوں کہ گویا سب کو رواں اور صحت اعراب کے ساتھ پڑھ سکتا ہوں۔ حالانکہ یہ بھی صحیح نہیں لغات، شروح، تراجم کے سہارے کام کسی نہ کسی طرح بس چل ہی جاتا ہے لغت میں تاج العروس اور پھر لسان العرب کے ساتھ اور لغت قرآنی میں مفردات قرآنی کے ساتھ سب سے زیادہ لگا لپٹا رہتا ہوں۔

انسانی کتابوں کے ساتھ اور انکے ضمن میں اللہ کی کتاب کا نام لے آنا۔ اور دونوں میں موازنہ و تقابل کی ٹھہرانا بڑی ہی بدمذاقی ہے اور پھر محض کتابوں میں "کتابوں" (صیغۂ جمع) کا لفظ خود اس پر دلالت کر رہا ہے کہ "ال کتاب" موضوع سے بالکل خارج ہے۔

ضروری اطلاع

اس سال کا آخری رسالہ ارسال خدمت ہے۔ جن حضرات کا چندہ ختم ہو گیا ہو ان سے درخواست ہے کہ وسط جنوری تک ذریعہ منی آڈر مبلغ دو روپیہ روانہ فرمائیں وی۔ پی میں انکا چار آنے کا نقصان ہوگا۔

"منیجر"

عربی مدارس کے واجبات و فرائض

از ابوالحسن علی ندوی

الندوہ میں "اسلام کے قلعے" اور "عربی مدارس" کے عنوان سے مضامین کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا اسکی یہ آخری قسط ہے۔ ہم نے اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کر دیا ہے اور ہمارے ذہن میں زندہ عربی اسلامی درسگاہوں کا جو بلند تخیل اور انکے اہم فرائض و واجبات کا جو نقشہ تھا وہ ہم نے ان مضامین میں پیش کر دیا۔ ہماری خواہش ہے کہ وہ دوسرے حضرات جنکو اس مضمون سے تعلق ہے اور جنھوں نے اس موضوع پر غور کیا ہے اپنے خیالات سے ہم کو اور قارئین الندوہ کو مستفید فرمائیں الندوہ سنہ کے صفحات انکے لئے کھلے ہوئے ہیں۔　　　"مدیر"

نصاب تعلیم کا مسئلہ مدارس کے اندرونی فرائض کی فہرست میں نصاب تعلیم اور اس میں اصلاح و تغیر کا مسئلہ کافی اہمیت رکھتا ہے لیکن اس موضوع پر (خصوصاً ندوۃ العلماء کی تحریک کے آغاز کے بعد سے) بہت کافی اظہار خیال کیا جا چکا ہے۔ اور اسپر اچھا خاصہ لٹریچر تیار ہو گیا ہے۔ اب شاید مشکل سے کوئی شخص یا ادارہ عربی مدارس کے قدیم اور مروجہ نصاب درس سے متعلق یہ تصور رکھتا ہوگا کہ یہ وہ آخری آسمانی صحیفہ ہے جو ناقابل نسخ ہے اس میں ادنیٰ ترمیم الحاد کے مرادف ہے، اصولی اور نظری حیثیت سے اس میں تغیر کے مذہبی جواز اور ترمیم و اضافہ کی علمی ضرورت کو عام طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے لیکن اسکی طرف ابھی تک عام قدم نہیں اٹھایا گیا۔

یہ ترمیم اور تبدیلی غیر دانشمندانہ عجلت کیساتھ اور وقتی تاثرات کے ماتحت نہیں ہونی چاہئے بلکہ مسلمانوں کی مذہبی ضروریات، علماء کے جماعتی فرائض، اسلام کی مخصوص تعلیم و ثقافت اور زمانۂ ماضی کے ضروری علمی ذخیرہ کو پیش نظر رکھکر کرنی چاہئے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے اس نصاب کا صحیح مفہوم سمجھنے کی ضرورت ہے جسکی تعلیم کیلئے عربی مدارس قائم کئے

جاتے ہیں اسکی صحیح تعریف ہمارے نزدیک یہ ہے کہ "وہ علمی اور کتابی وسیلہ ہے جو اسلام سے گہری اور براہ راست واقفیت اور اسلام کے مستند علمی اور تاریخی ماضی[1] سے رابطہ پیدا کرتا ہے اور ایسے اشخاص کے پیدا کرنے میں معاون ہوتا ہے جو مسلمانوں کی علمی رہنمائی کے اہل ہو سکتے ہیں۔"

ہمارے نزدیک یہ تعریف بالکل کافی ہے، لیکن اسپر ایک اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ اس تعریف کے ماتحت بعض ایسے علوم غیر ضروری قرار پائیں گے جنکا حاصل کرنا نفس اسلام سے گہری اور براہ راست واقفیت کے لئے ضروری نہیں یا اور نہ وہ خالص اسلامی ماحول کی پیداوار ہیں لیکن سلف کی علمی کوششوں سے واقفیت اور مسلمانوں کے علمی ذخیرہ کی حفاظت کے لئے ضروری ہے۔ اس عظیم الشان علمی ذخیرہ کی حفاظت جو ہزار بارہ سو برس میں فراہم ہوا کسی نہ کسی درجہ میں ہر صدی اور ہر زمانہ کے علماء کا فرض ہے۔ ہم کو اس کے تسلیم کرنے سے انکار نہیں لیکن یہ بہر حال اسی طرح کا ایک اخلاقی اور تاریخی فریضہ ہے جس طرح مسلمان بادشاہوں کی بنائی ہوئی تاریخی عمارتوں اور اسلامی آثار قدیمہ کی حفاظت کسی نہ کسی درجہ میں ضروری اور اخلاف کا اخلاقی فرض ہے، اور کوئی مضایقہ نہیں کہ اسکے لئے کوئی ایسی جماعت رہے جسکے پاس اسکے لئے وقت ہو لیکن یہ وہ محور نہیں ہے جس پر مسلمانوں کا سارا نظام تعلیم گردش کرے۔ اسلام کی طرف کسی چیز کی نسبت کرنے میں اور مسلمانوں کے لئے کسی چیز کو لازمی قرار دینے میں احتیاط کی ضرورت ہے ہم کو اس زمانہ کے عام لوگوں کی طرح اسلامی علوم اور "مسلمانوں کے علوم" میں نیز اسلام اور مسلمانوں کی تہذیب و تمدن" میں خلط مبحث نہیں کرنا چاہئے، عربی مدارس جنکے لئے ہم مسلمانوں سے اسلام کے نام پر امداد کے طالب ہیں اور جنکی بقا و ترقی مسلمانوں کا دینی فریضہ ہے ایسے علوم اور تصنیفات کی حفاظت کے لئے وقف نہیں ہو سکتے جو وقتی ضروریات کے ماتحت یونان یا ایران سے منتقل ہو کر مسلمانوں میں آئے اور جنکا دور ختم ہو گیا، اسلامی نصاب تعلیم مسلمانوں کی تاریخ نہیں ہے

---

[1] مسلمان قوم کا علمی اور تاریخی ماضی جو در حقیقت اسلام کا مستند علمی اور تاریخی ماضی نہیں ہے اس تعریف سے خارج ہے اور اس سے ربط پیدا کرنا اس نصاب تعلیم کے مقاصد میں داخل نہیں۔ مثلاً مسلمانوں کے مذہبی اور علمی انحطاط یا غیر اسلامی علمی و سیاسی عروج کا عہد (جیسے عہد اموی، عہد عباسی، الخ)

جس کا موضوع نامورانِ اسلام کے کارناموں کی اشاعت اور حفاظت ہے اور نہ عربی مدارس آثارِ قدیمہ کے محکمے ہیں جنہیں پرانے سکے، قدیم کتبے، پارینہ اوراق اور تاریخی دستاویزیں محض بوجہ التاریخ رکھی رہیں، اسلامی تعلیم کے مرکز اسلامی زندگی کے مرکز ہیں، جنکو ایسی چیزیں گھیرے نہیں رہ سکتیں جنکا وقت ختم ہو گیا۔

اس تعریف کے ماتحت سب سے زیادہ اہمیت اور اولیت ان مضامین کو حاصل ہونی چاہئے جو اسلام کی براہِ راست تعلیم میں داخل ہیں یا اس تعلیم کیلئے بالواسطہ معاون اور "موقوف علیہ" ہیں اسلام کی اصل تعلیم وہ زندہ اور پائندہ تعلیم ہے جو کبھی پرانی نہیں ہو سکتی جسمیں قدامت اور بوسیدگی کو دخل نہیں اسلام کی طرح اسکی تعلیم بھی جاودانی ہے جو جماعت اس دائمی اور ابدی نظام کیساتھ اپنے کو منسلک اور وابستہ کر دیگی اور اپنا دامن اسکے دامن سے باندھ دیگی وہ اسکی طرح زندہ جاوید بنجائیگی دنیا کا کوئی انقلاب اسکو مٹا نہیں سکتا، زمانہ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا اس کے کمال کو زوال نہیں اسکی بہار کو خزاں نہیں، لیکن جس جماعت کی زندگی کا انحصار انسانی علوم اور تحقیقات پر ہوگا خواہ وہ قدیم یونانی علوم ہوں یا جدید مغربی وہ زمانہ کا ساتھ زیادہ دنوں تک نہیں دیسکیگی، وہ بار بار پیچھے رہیگی اور ان علوم و تحقیقات کی طرح کبھی نہ کبھی فرسودہ اور بیکار ہو کر رہیگی، جن علوم یا جماعتوں کا طبعی وقت ختم ہو جاتا ہے انکو زندگی کی کوئی جدوجہد زندہ نہیں کر سکتی انسان کے پیدا کئے ہوئے علوم، کمالات و خیالات ایک خاص عمر رکھتے ہیں جب وہ عمر ختم ہو جاتی ہے اور انکا طلسم ٹوٹتا ہے، تو انکے ساتھ وہ جماعتیں بھی رخصت ہو جاتی ہیں جو ان سے مربوط تھیں، اور اسوقت انکو اپنے بقا کے لئے کوئی پروپیگنڈا یا جدوجہد زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رکھ سکتی فاما الزبد فیذھب جفاءً واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض، اسلئے علماء مدارس کیلئے یہی بہتر ہے کہ وہ قرآن و حدیث سے براہِ راست منسلک رہیں، اور انکی خدمت اپنی زندگی کا مقصد بنائیں،

طریقۂ تعلیم میں اصلاح، زمانہ کے حالات کے مطابق نصاب کی تیاری کتابوں کی تالیف اور انتخاب بعض جدید ضروری مضامین کا اضافہ، عربی زبان کی ایک زندہ زبان کیطرح تعلیم ایسے اہم تعلیمی مسائل ہیں جو علماء اور اصحابِ مدارس کی فوری توجہ کے محتاج ہیں ہم یہاں تفصیلات میں جانا نہیں چاہتے تفصیلات کی کوئی حد نہیں

اور ان میں اختلافات کی بہت گنجائش ہے،

کاش کہ حضرات منتظمین مدارس باہمی طور پر ان مسائل کو حل کرتے اور ہندوستان کے عربی مدارس میں جو ہزاروں کی تعداد میں ہیں ایک مشترک تعلیمی نظام جاری ہو سکتا یہ حضرات علماء کے بہت سے مشاغل سے زیادہ ضروری فرض ہے اور اسکے نتائج مسلمانوں کی مذہبی اور علمی زندگی میں بہت مؤثر اور دور رس ہیں،

عام مطالعہ اور کتابوں کا ذوق

مدارس عربیہ کے معلمین و منتظمین کے فرائض نصاب کی تدریس تک محدود نہیں اور علم کسی خاص نصاب میں منحصر نہیں، یہ نصاب خاص قسم کی علمی استعداد اور ذوق پیدا کرنے کے لئے ہے، اس ذوق کا نہ پیدا ہونا نصاب اور اسکے معلمین کی بڑی ناکامی ہے عرصہ سے ہندوستان کی عربی درسگاہوں میں افسوسناک علمی انحطاط نظر آرہا ہے، علمی ذوق وسعت نظر جدت فکر اور علمی اجتہاد معدوم ہوتا چلا جا رہا ہے، مدارس اور تعلیمی حلقوں پر ایک خاص قسم کا علمی جمود جسکو ہم نصابیت یا مدرسیت سے تعبیر کر سکتے ہیں طاری ہوتا جا رہا ہے، صحیح علم کی حلاوت اور چاشنی نہیں پیدا ہونے پاتی اسلام کی اصلی روح علم کے اصل جوہر بلند تصورات اور حقائق سے طلبہ اور فضلا کے ذہن ناآشنا رہتے ہیں، سلامت فکر اور دقت نظر دونوں نایاب ہیں، اسمیں نصاب کی خاص ساخت، مخصوص طریقۂ تعلیم اور طلبہ کی پست ہمتی کو کیساں دخل ہے ضرورت ہے کہ خاص توجہ اور تربیت سے طلبہ میں علمی ذوق پیدا کیا جائے۔ نصاب کے سوا طلبہ کو اچھا اسلامی لٹریچر دکھایا جائے اور ان ائمہ اور مفکرین اسلام کی تصانیف کا ذوق پیدا کیا جائے جنکی کتابوں میں اسلام کی صحیح روح ملتی ہے، علم و اجتہاد کے چشمے ابلتے ہیں، اور اسلام کی بنیادیں قلب و دماغ میں مستحکم ہوتی ہیں۔ مثلاً امام ابن جوزی امام غزالی، امام ابن تیمیہ امام ابن قیم حضرت مجدد سرہندی شیخ الاسلام شاہ ولی اللہ دہلوی رح کتابوں کا صحیح انتخاب اور انکی صحیح ترتیب کے متعلق مشورہ مدرسین کے اہم فرائض میں سے ہے۔ اور ذہنی اور مذہبی تربیت کے لئے نہایت ضروری ہے۔ عربی مدارس اسلامی ثقافت کے اصلی مرکز ہیں، اسلام کے مستند ماضی کے اہم اشخاص سے واقف ہونا انکے مراتب کو پہچانتا انکی خدمتوں سے واقف ہونا اور اعلیٰ و مجتہدانہ

اسلامی تصنیفات سے روشناس ہونا تعلیم کا اہم جز ہے۔

معلمین | نصاب درس کسی جماعت کے پیدا کرنے کا تنہا ضامن نہیں وہ ان ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے جو کسی جماعت کے پیدا کرنے میں معاون ہوتے ہیں اسی لئے ہمنے اسکی تعریف میں علمی اور کتابی وسیلہ اور "معاون" کے الفاظ استعمال کئے تھے، ایسی جماعت کے پیدا ہونے کا بہت کچھ انحصار اس نصاب کے معلمین اور مدرسہ کے موافق ماحول پر ہے حقیقت تو یہ ہے کہ معلمین کی خوبی نصاب کے نقائص کی بہت حد تک تلافی کرسکتی ہے لیکن بہتر سے بہتر نصاب معلمین کا قائم مقام نہیں ہو سکتا، کامیاب معلمین کے لئے شرط ہے کہ اگر تحقیق و اجتہاد کا درجہ نہیں، تو کم سے کم اپنے زیر درس مضامین کا ذوق رکھتے ہوں۔ دینی اور اخلاقی حیثیت سے طلبہ اور عوام سے بلند ہوں۔ پختہ اصول اور مستحکم سیرت کے مالک ہوں۔ اور تبلیغی روح اور جوش رکھتے ہوں۔ اخلاقی حیثیت سے غیر ممتاز اصول و سیرت کے لحاظ سے خام پیشہ ور اور ملازمانہ ذہنیت رکھنے والے اساتذہ ہر ادارہ کے لئے غیر موزوں لیکن عربی مدارس کے لئے نہ صرف غیر مفید بلکہ مضر ہیں۔

جسمانی تربیت | عام تعلیم گاہوں کی طرح بلکہ شاید ان سے زیادہ عربی مدارس کو اپنے طلبہ کے لئے تعلیمی، ذہنی، اخلاقی اور مذہبی تربیت کے علاوہ جسمانی تربیت کا بھی انتظام کرنا چاہئے کہ کامیابی اور یکسانی کیساتھ تعلیمی زمانہ ختم کرنے اور مستقبل میں زندگی کی کشمکش میں شریک ہونے اور اپنے دینی و اصلاحی فرائض انجام دینے کیلئے اچھی صحت جسمانی تربیت اور قوت برداشت کی ضرورت ہوگی، مدارس کو پچھلی صدیوں کی خانقاہیں نہیں بننا چاہئے۔ یہ جیسے کہ ہمنے عرض کیا ہے اسلام کے قلعے ہیں قلعوں کے محافظوں اور سپاہیوں کو مسلح ہونے سے پہلے تندرست اور قوی ہونا چاہئے، اس بارہ میں حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور سنوسی علماء و مشائخ صحیح نمونہ ہیں،

اس سلسلہ میں جبکہ ہم مدارس کے اندرونی فرائض کی فہرست ختم کر رہے ہیں ایک بار پھر صاف عرض کرنا چاہتے ہیں کہ عربی مدارس کا فرض ہے کہ وہ ایسے وسیع النظر، صاحب بصیرت، عالی حوصلہ اور باہمت علماء پیدا کریں جو مسلمانوں کے دور انتشار میں (جیسے کہ اسوقت ہندوستان میں ہے) مسلمانوں کی صحیح اور بےغرض رہنمائی کرسکیں اور انکو انکے اصلی مقصد (حیات اسلامی) تک پہونچا سکیں اور جب اور جہاں صحیح اسلامی حکومت قائم ہو اسکے لئے لائق وزیر، قاضی

بلکہ خلیفہ مہیا کرسکیں اور ملک میں خواہ کوئی نظام سیاسی اور کچھ حالات معاشی ہوں اعلیٰ مقصد سے غافل ہوئے بغیر اسلام کی حفاظت کا فرض انجام دیسکیں۔

مدارس کے بیرونی فرائض مسلمانوں کی نشأت ثانیہ

مدارس کے ساتذہ ارباب اختیار اور طلبہ کا اسوقت سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ اسلام کا احیا اور مسلمانوں کی از سر نو زندگی کی کوشش کریں اس کا واحد طریقہ یہ ہے کہ یہ فرض کرکے کہ ہندوستان میں حقیقی مسلمانوں کا وجود نہیں حقیقی اسلام کی تبلیغ کے لئے نکلیں اور بالکل پہلے قدم سے خالص پیغمبرانہ اصول پر اور بالکل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق اور عمل کے مطابق مسلمانوں کی اس جاہلیت میں اسلام کی توحید خالص اور توحید کامل کی تعلیم دیں نا واقفوں کو کلمہ پڑھائیں زندگی بخش اور انقلاب انگیز توحید سے انکی روح اور ذہن کو آشنا کریں اور اسی راہ سے انکی زندگی میں انقلاب برپا کرنیکی کوشش کریں ان مسلمان "نومسلموں" کو احکام اور فرائض اسلام کی تعلیم دین گاؤں گاؤں اور شہر شہر اسلام کے احکام کی اشاعت کریں اور فرائض اسلام کو اپنی تبلیغی جد وجہد سے از سر نو زندہ کریں، وہ وقت کے تمام سیاسی و معاشی اور مدنی مسائل سے کچھ مدت کے لئے آنکھ بند کرلیں اور صرف مسلمانوں کو مسلمان بنانے کا کام کریں۔

اسلامی تاریخ کے عمیق مطالعہ دنیا اسلام کی مختلف تحریکات کے وسیع علم اور ہندوستان کے طویل سیاسی تجربہ نے تمام اہل فہم حضرات کو اسی نتیجہ پر پہونچا دیا ہے کہ بنیادی اور حقیقی کام مسلمان بنانے ہی کا کام ہے اسکے بغیر مسلمانوں کی تعمیر نو کی ہر کوشش اور انکی تنظیم ترقی اور اقتدار کی ہر تحریک مستقل آوارہ گردی اور ایک نئے فتنے کے مرادف ہے، یہ کام اگرچہ تمام مسلمانوں کے کرنے کا ہے لیکن علما اور طلبہ کا خصوصیت کیساتھ یہ فریضہ ہے اور وہ تھوڑی توجہ سے یہ کام دوسروں سے اچھا کرسکتے ہیں۔

سردست ان مبلغین کو دیہاتوں اور ان بستیوں کا رُخ کرنا چاہئے جہاں شہری فتنے ابھی نہیں پہونچے اور جہاں کے مسلمان ابھی ذہنی انتشار میں مبتلا نہیں ہوئے۔

یہ کام خالص پیغمبرانہ کام ہے اسلئے اسمیں پیغمبرانہ اصول کی پابندی لازمی ہے ضروری ہے کہ اس علمی کام میں وہ

عنصر شامل ہونے پائیں جو ہماری قومی تحریکوں کے لوازم بنگئے ہیں۔ اور جو مدت سے مسلمان جماعتوں کے جسم و قلب کو گھن کیطرح کھارہے ہیں یعنی نمود و نمائش پروپگنڈا، جاہ طلبی اور نفسانیت۔

حسب ذیل امور کا لحاظ ضروری ہے

(۱) مبلغین استغنا سے کام لیں، اپنا کھائیں اور اپنا خرچ کریں۔ تبلیغ و نصیحت گفتگو اور معاملہ میں انتہائی تواضع اور فروتنی لیکن روپیہ پیسہ اور کھانے پینے کے معاملہ میں انتہائی خودداری اور بےنیازی، قل لا اسئلکم علیہ اجرا ہر وقت پیش نظر رہے۔

(۲) اس کام میں خدا کی رضا جوئی اور اسکے کام کی بلندی کے سوا کوئی اچھی یا بری نیت شامل ہونے پائے یہاں تک کہ ان دینی درسگاہوں کی تبلیغ و تشہیر (پروپگنڈا) یا جماعت علماء کے وجود و بقا کی کوشش (جو بجائے خود صحیح اسلامی مقاصد ہیں) اس مقصد کے ساتھ شریک نہوں، قلب و دماغ کو اس مختصر سے وقت میں جتنا صاف اور رضائے الٰہی اور اعلاء کلمۃ اللہ کے خیال کے سوا ہر مقصد سے خالی رکھا جاسکے اس کام کیلئے مفید ہوگا۔

جاہ طلبی عصبیت قومی اقتدار کی نیت کسی قسم کا سیاسی پروپگنڈا کسی انتخاب کے لئے لوگوں کو تیار کسی قومی کام کیلئے زمین کو ہموار اور کسی خاص جماعت یا سیاسی مسلک کے حق میں فضا کو سازگار بنانے کی کوشش اس تحریک کو بہت نقصان پہونچائیگی اور بڑی مزاحمتوں اور بدگمانیوں کو دعوت دیگی بعض عارفوں کا خیال ہے کہ اس موقعہ پر دوسروں کی ہدایت کی نیت بھی نہیں ہونی چاہئے صرف احکام الٰہی کی تعمیل اور اسکے ذریعہ سے قرب خداوندی حاصل کرنیکی نیت ہونی چاہئے۔ اس میں جتنے مصالح ہیں کام کرنے کے بعد اسکی حکمت خود نظر آئیگی۔

(۳) ایمان کامل اور فرائض کے سوا ابتدا میں ہر قسم کی فروعی اور اختلافی باتوں سے گریز کیا جائے ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن پر پورا پورا عمل ہو انتہائی شفقت و محبت کے ساتھ کام کیا جائے۔ دلوں کو ہاتھ میں لینے کی کوشش کیجائے ہر قسم کی سخت کلامی اور درشتی کو ہنسی خوشی برداشت کیا جائے ہر کلمہ گو اور نام کے مسلمان کا بھی احترام کیا جائے۔

(۴) اس راہ میں جسمانی مشقت برداشت کیجائے اور زیادہ سے زیادہ ایثار اور قربانی سے کام لیاجائے کہ ان چیزوں کی اللہ کے یہاں بڑی قیمت ہے۔ اور ان سے بڑے برکات حاصل ہوتے ہیں والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا وان اللہ لمع المحسنین۔

(۵) ارواح وقلوب کا انقلاب اور اسلامی زندگی صناعی اور میکانکی طریقوں سے نہیں پیدا ہوسکتی اسکے لئے روحانیت کی ضرورت ہو لیکن اس روحانیت کے پیدا ہونے کا انتظار نہیں کرنا چاہئے، یہ روحانیت اس راستہ پر چلنے اور تکلیف کو برداشت کرنے سے خود بخود پیدا ہوگی۔ قرآن مجید کی آیات اور صحابہ اور خواص امت کے واقعات اسکے شاہد ہیں۔ اور ہم حقیقتاً روحانیت کے کسی خاص درجہ اور اعلیٰ مقدار کے مکلف نہیں ہیں اس لئے اسکی خاطر کسی ایسے کام میں تاخیر کرنا جسکے ہم مکلف ہیں درست نہیں۔

یہ کام جسقدر ضروری ہے اسی قدر مشکل بھی ہے، یہ ہتھیلی پر سرسوں جانا نہیں ہے یہاں تیشہ کی سلوں سے زندگی کے چشمے جاری کرنے ہیں! اور پہاڑ کے جگر سے دودھ کی نہر بہانی ہے یہاں ہفتوں اور مہینوں کا سوال نہیں۔ یہ عمروں اور اشخاص کی پوری پوری زندگیوں کا کام ہے۔

لیکن جسقدر یہ کام مشکل ہے اسی قدر اسکی کامیابی بھی یقینی ہے اور اسی قدر یہ کامیابی عظیم الشان اور بے نظیر ہے۔ خود قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اسکی بہترین گواہ ہیں۔

اگر عربی مدارس کے معلمین وطلبہ اس کام کے لئے پابندی کیساتھ ہفتہ میں ایک دن بھی دیں تو کچھ مدت کے بعد انکو انشاءاللہ اپنی کوشش اور محنت کے نتائج نظر آئیں گے، اور ان مدارس کے جوار میں جہاں اکثر ان مدارس کا کوئی دینی و اخلاقی اثر نہیں ہوتا اور ان تبلیغی حلقوں میں جو مذہبی اور اخلاقی حیثیت سے بہت پسماندہ ہیں خاص قسم کی مذہبی زندگی کے آثار پیدا ہوجائیں گے۔

لیکن اگر کامیابی کے آثار نظر نہ آئیں تو کام کرنے والوں کو بددل نہیں ہونا چاہئے کبھی نہ کبھی اس کا اثر ہوگا، وان سعیہ سوف یریٰ، ولا نضیع عمل عامل منکم، ولا نضیع اجر المحسنین، اسی لئے بہتر ہے کہ لوگوں کی ہدایت پر ساری

توجہ مبذول نہ کی جائے اور اسکو اپنی محنت کا صلہ نہ سمجھا جائے ورنہ لوگوں کی بے توجہی اور بے اثری سے دلشکنی اور ناامیدی کی
تعمیل حکم مقصد ہونا چاہئے۔ اور وہ بہر حال حاصل ہے۔

اس کام میں ایک دوسرا فائدہ بھی یقینی ہے اور وہ عام ہدایت سے کسیطرح کم اور غیر اہم نہیں وہ یہ کہ خلوص اور
استقامت کیساتھ کام کرنے والوں میں اسلام کے وفادار سپاہی ثابت قدم مجاہد اور ایسے اہل دل پیدا ہونگے جنکی نظیر مدارس
اور خانقاہوں میں نہیں ملیگی اور اس جماعت کا کسی تعداد میں بھی فراہم ہو جانا بڑی کامیابی ہے۔

- مدارس کو اس تحریک سے متعدد فوائد حاصل ہونگے جو اس تحریک اور عمل کے بغیر نہیں حاصل ہوسکتے پہلا فائدہ یہ ہے
کہ ان طلبہ کی غیر شعوری طریقہ پر دینی اور اخلاقی تربیت اور ان میں اسلامی جذبات کی پرورش ہوگی اور بلا کسی اہتمام کے
تبلیغ و اصلاح کی مشق و تربیت اور ایسا عملی تجربہ ہوگا جو کسی دار التبلیغ میں حاصل نہیں ہوسکتا۔

دوسرا فائدہ علمی ہے، اور وہ یہ کہ قرآن و حدیث کا ایک بہت بڑا حصہ ایسا ہے جو عمل و مجاہدہ کے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتا
جو چیزیں عملی ہیں وہ نظری طور پر کسطرح حاصل ہوسکتی ہیں، اس کے علاوہ حقائق کا صحیح انکشاف اور قلب کا حقیقی انشراح
مشقت و جہاد کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا، والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا میں اسکی طرف بھی اشارہ معلوم ہوتا ہے
اس کام میں ایسے علوم و مضامین کا القا ہوگا اور حقیقت دین کا ایسا فہم صحیح حاصل ہوگا جو قرآن و حدیث کے درس میں
اور کتابوں کے ڈھیر میں حاصل نہیں ہوسکتا۔[1]

عربی زبان کی اشاعت مدارس کی چار دیواری سے باہر علماء کا دوسرا فرض یہ ہے کہ ہندوستان میں عربی زبان کی اشاعت
کی کوشش کریں اور مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ عربی زبان سیکھنے کا شوق دلائیں دین کی صحیح
حقیقت سمجھنے کے لئے، اسکے سرچشموں سے براہ راست سیراب ہونیکے لئے۔ اور ان غلط فہمیوں اور بے اعتدالیوں سے بچنے کیلئے

[1] جو حضرات اس کام کو شروع کرنا چاہیں اور اسکا مفصل طریق کار معلوم کرنا چاہیں وہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب مدظلہ (
بستی نظام الدین دہلی) سے ملاقات کریں اور سہولت کے علاوہ میں مولانا کے عظیم الشان تبلیغی کام کو دیکھیں مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی
کے مضامین ایک اہم دینی تحریک اور اسلامی حکومت کسطرح قائم ہوتی ہے (رسالہ ترجمان القرآن) کا مطالعہ بھی انکے لئے مفید ہوگا۔

جنہیں بحیثیت دیندار بہ نیت تعلیم یافتہ لیکن بہت سے واسطوں سے اسلام تک پہونچنے والے مسلمان مبتلا ہوتے ہیں عربی زبان سیکھنا اور براہ راست قرآن و حدیث کا مطالعہ کرنا بیحد ضروری ہے جدید تعلیم یافتہ اشخاص کی غیر متوازن بہت اور علمی تحقیقات دیکھ دیکھ کر عربی زبان کی اہمیت اور اسکے ذریعہ اسلامی تعلیمات سے گہری اور براہ راست واقفیت کی ضرورت روز بروز نمایاں ہوتی جا رہی ہے اسلئے عربی زبان کی اشاعت ہندوستان جیسے ملک میں اسلام کی بہت بڑی خدمت اور اسلامی تہذیب اور کلچر کی حفاظت کا صحیح راستہ ہے۔

اس کام کے لئے علماء کو ترغیب و تشویق کے تمام مؤثر ذرائع استعمال کرنے ہونگے، خواندہ عوام اور غیر عربی داں تعلیم یافتہ اشخاص کیلئے عربی زبان سکھانے کا آسان سے آسان طریقہ استعمال کرنا ہوگا۔ اور اس بات کی کوشش کرنی ہوگی کہ ابتدائی مشکلات کو آسان کرکے کم سے کم وقت میں قرآن مجید سمجھنے کی اہلیت پیدا کردیں اسکے لئے علماء اور مدارس کو چاہئے کہ وہ مجلس ترقی عربی دہرادون سے تعاون کریں اور اسکے پروگرام کو کامیاب بنائیں۔

اگر فلسطین میں مردہ عبرانی زبان اور ہندوستان میں مردہ سنسکرت زبان زندہ ہوسکتی ہیں تو ہندوستان میں عربی زبان جو ابھی تک مردہ نہیں ہے زندہ رکھی جاسکتی ہے اور اسکی اشاعت ممکن ہے صرف عزم، کوشش اور تعاون کی ضرورت ہے

مدارس کی تنظیم اور علماء کا اجتماع

ان تمام مقاصد کے لئے ضروری ہے کہ عربی مدارس ایک سلسلہ میں منسلک ہوں اور انکی تنظیم کی جائے علماء کم سے کم سال میں ایک مرتبہ ایک جگہ جمع ہوں، ایک دوسرے کے خیالات اور کوششوں سے واقف ہوں اور اشتراک عمل کی صورتیں پیدا کریں ندوۃ العلماء کی تحریک کا یہ ایک اہم مقصد تھا اور اسکے سالانہ جلسے علماء کے سب سے بڑے مرکز ہوتے تھے اسکا دار العلوم اور دار العلوم دیوبند اب بھی اس تحریک و تنظیم کا مرکز بنائے جاسکتے ہیں اور علماء اور عربی مدارس کے طلبہ اور نمایندوں کے ایک جگہ اجتماع کی مختلف مناسب تقریبیں پیدا کیجاسکتی ہیں جنمیں سے اردو اور عربی کے مباحثے تقسیم اسناد کے جلسے اور بعض دوسرے علمی اجتماعات ہیں یہ بھی ضروری ہے کہ ان بڑے مدارس میں ہندوستان کے چھوٹے بڑے مدارس کی مفصل فہرست ہو تاکہ انکو ضروری لٹریچر اور عام اجتماع کے دعوت نامے بھیجے جاسکیں۔

ابن حجر الہیثمی اور ابو الحسن البکری کے مشترک فتوے

از مولانا مسعود عالم ندوی کیٹلاگر اورینٹل لائبریری پٹنہ

ابن حجر ہیثمی (م ۹۷۳ھ) کے نام سے تو ہر لکھا پڑھا واقف ہے، لیکن انکے استاذ اور معاصر شیخ ابو الحسن البکری کے حالات زیادہ روشن نہیں، ابن حجر کے فتوے الفتاوی الکبریٰ الہیثمیہ اور الفتاوی الحدیثیہ کے نام سے پانچ ضخیم جلدوں میں شائع بھی ہو چکے ہیں، لیکن یہ مشترک فتوے، جن کا راقم تعارف کرانا چاہتا ہے، ابھی نظر عام پر نہیں آئے ہمارے یہاں (اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ) ایک مجموعہ میں (۹/۲۲، ۲) ان دونوں بزرگوں کے مشترک فتوے درج ہیں، مشترک فتووں کی صورت یہ ہوئی ہے، کہ کسی نیاز مند نے دونوں صاحبوں کی خدمت میں لکھکر سوالات پیش کئے، اور الگ الگ جواب حاصل کرکے انھیں ایک کتاب کی صورت دے دی، جواب دینے والے دونوں بزرگ مصری اور شافعی ہیں، ابن حجر ہیثمی تو مکہ مکرمہ میں توطن اختیار کر چکے تھے، اور ابو الحسن البکری بھی سال کا بڑا حصہ حرم ہی میں بسر کرتے تھے۔ دونوں بزرگوں نے اپنے اپنے جوابات کو الگ رسالوں کی صورت میں ترتیب دیکر نام بھی تجویز کر دیئے ہیں۔ جامع نے صرف ہر سوال کے بعد پہلے ابو الحسن البکری پھر ابن حجر کے جواب جمع کر دیے ہیں اپنی طرف سے اضافہ و تحشیہ کی کوشش نہیں کی ہے۔

ابن حجر کے حالات تو تذکروں میں عام طور پر ملتے ہیں، ابو الحسن البکری کے متعلق دو حرف لکھنا مناسب ہوگا یہ مصر کے بکری خاندان کے ایک ممتاز فرد اور دسویں صدی ہجری کے ممتاز عالم اور صوفی تھے (بکری خاندان کے مختلف افراد کے لئے ملاحظہ ہو: الخطط الجدیدۃ التوفیقیۃ ج ۳ صفحہ ۱۲۹-۱۲۱) پورا نام محمد بن محمد بن عبد الرحمن بن محمد البکری الصدیقی الشافعی الاشعری سبط آل الحسن ہے۔ عام طور پر ابو الحسن البکری کے نام سے مشہور ہیں ولادت ۸۹۹ھ/۱۴۹۳ء میں ہوئی گھر میں اعلیٰ تعلیم و تربیت ملی، کم عمری ہی میں علم و تقویٰ کی شہرت ہونے لگی۔ قاہرہ اور مکہ مکرمہ دونوں جگہ قیام رہتا اور لوگ مستفید ہوتے بیت المقدس اور مدینہ منورہ میں بھی کچھ دنوں درس و افادہ کا

سلسلہ، ابن حجر ہیثمی اور دسویں صدی ہجری کے دوسرے ممتاز عالم، حلقۂ تلمذ میں داخل تھے، النور السافر (مخطوطہ
مذکورہ صاحب) کے بیان کے مطابق موصوف نے چار سو سے اوپر کتابیں لکھیں۔ بروکلمن کی تاریخ ادب عربی (۱۹۳۲
ذیل ۲: ۲۰۲-۲۱۱) میں صرف ۴۲ کتابوں کے نام گنائے گئے ہیں وفات ۹۵۲ھ/۱۵۴۵ء میں ہوئی تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو
النور السافر (۲۰۷-۲۲۰ تا ۲۱)؛ شذرات الذہب (۸: ۲۹۲) تاریخ محمدی (مخطوطہ رامپور: ورق ۶۹۹)

جامع کا نام نہیں معلوم؛ ابوالحسن البکری کو وہ شیخنا کہتے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انکی عمر کا پورا یا کم از کم بیشتر
حصہ دسویں صدی ہجری میں گزرا۔ دوسرے اشاروں سے ان کے یمنی ہونے کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اس مجموعہ فتاوی
(مجموعہ عدد ۲۷۳۲ ورق ۱۵۰- ۲۱۹) کا آغاز ان جملوں سے ہوتا ہے (ورق ۱۵۳ اب) الحمد اللہ شرفنا بعلما
بمزید اکرامہ . . . . وبعد فہذہ اسئلۃ صدرت منا شیخنا الامام . . . . محمد بن محمد بن عبدالرحمن بن محمد البکری
الصدیقی الشافعی الاشعری سبط ال الحسن . . . . فاجاب علیہا بجواب شاف ثم اجاب علیہا بعدہٗ تلمیذہٗ الامام
شہاب الدین احمد بن حجر بجواب دال علی فضلہ . . . . وقد رتبت الجمیع مقدمًا لجواب الشیخ البکری ثم بعدہٗ جواب
ابن حجر بحسب ما تیسر لی . . . . فاقول قال شیخنا الامام البکری فسح اللہ فی مدتہ الخ

فسح اللہ فی مدتہ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ بکری کی وفات (۹۵۲ھ) سے پہلے یہ مجموعہ مرتب ہو گیا تھا جامع
کی مندرجہ بالا تمہید کے بعد ابوالحسن البکری کا جواب یوں شروع ہوتا ہے (ورق ۱۵۴ ب):-

بسم اللہ . . . . الحمد اللہ رب العالمین . . . . وبعد فہذہ اسئلۃ وردت علی من الیمن عمرہ اللہ . . . .
واجراہ علی عوائدہ . . . . . وسمیت ذلک الاجوبۃ الحسنۃ عن اسئلۃ (؟ الاسئلۃ) الیمنیۃ . . . .
الفصل الاول الخ

البکری کا پہلا جواب ختم ہونے کے بعد، ابن حجر اپنے جوابات کا سلسلہ اس طرح شروع کرتے ہیں (ورق ۱۵۵ الف)
"وقال الامام ابن حجر بسم اللہ الرحمن الرحیم . . . . . وبعد فہذہ اسئلۃ وردت علی من بعض "نواحی حضرموت . . . .
فاجبت عنہا مع . . . تشتت البال . . . . فشرعت فی ذلک وسمیتہا الجابۃ مرسلا الخضر من فتوی ابن حجر الخ الخ

اسی نہج پر ہر سوال کے بعد پہلے البکری اور پھر ابن حجر کے جوابات بہ ترتیب درج ہیں۔

استفسارات عام طور پر مندرجہ ذیل قسموں سے تعلق رکھتے ہیں، اور اسی لئے چار فصلوں میں مرتب کئے گئے ہیں:

(۱) الفصل الاول فی ما یملک من المیاہ المباحۃ وما لا یملک

(۲) الفصل الثانی ما یتعلق بحکم الاراضی التی تشرب دفعۃ واحدۃ

(۳) الفصل الثالث فی ما یتعلق بحکم الاراضی التی تشرب علی التعاقب

(۴) الفصل الرابع فی ما یتعلق بحکم انقسام الماء بین الشرکاء فی سواقی متعددۃ

رسالہ کا بڑا حصہ انھیں مسئلوں پر مشتمل ہے۔ باقی متفرق مسئلے ایک خاتمہ کے تحت ترتیب دے گئے ہیں۔ متفرق مسائل کی ترتیب، ابواب فقہ کے مطابق ہے۔ تفصیل درج ذیل ہے۔

(ورق ۱۸۱ الف) الخاتمۃ فی المسائل المتفرقۃ علی ابواب الفقہ، کل مسئلۃ فی بابہا الخ

(۱)	ورق ۱۸۱ ب	باب الاغتسر
(۲)	ورق ۱۸۳ ب	باب التیمم
(۳)	ورق ۱۸۵ ب	باب الزکاۃ
(۴)	ورق ۱۹۱ الف	باب الصیام
(۵)	ورق ۱۹۳ ب	باب البیع
(۶)	ورق ۱۹۹ ب	باب بیع الاصول والثمار
(۷)	ورق ۲۰۱ الف	باب الصلح
(۸)	ورق ۲۰۲ ب	باب الاقرار
(۹)	ورق ۲۰۳ الف	باب العاریۃ
(۱۰)	ورق ۲۰۴ الف	باب الغصب

(۱۱)	ورق ۲۰۵ الف	باب الوقف
(۱۲)	ورق ۲۰۶ الف	باب الجہاد
(۱۳)	ورق ۲۰۹ الف	باب السیر
(۱۴)	ورق ۲۱۱ الف	باب الاضحیہ
(۱۵)	ورق ۲۱۱ ب	باب القضا علی الغائب
(۱۶)	ورق ۲۱۳ ب	باب القسمۃ
(۱۷)	ورق ۲۱۹ الف	باب الدعاوی والبینات

جوابات کے خاتمہ پر جامع کے مندرجہ ذیل تصدیقی نوٹ ہیں:-

الحمد للہ قال جمیع ، ذکر من ھذہ الاجوبۃ ای الاول کاتب ھذہ الاحرف ، الشیخ الامام ..... محمد بن محمد بن عبدالرحمٰن ..... البکری الصدیقی الاشعری .....

قال جمیع الاجوبۃ المتاخرۃ علی کل سوال الامام العالم ... شہاب الدین احمد بن محمد بن حجر ...... المصری الہیثمی .... نفع اللہ بہ وارضاہ .... واللہ اعلم

حاشیہ پر کہیں کہیں جامع کے نوٹ ہیں ، جن میں متن کے مسائل پر بعض دوسرے فقیہوں کی رائیں درج کی گئی ہیں خاص طور پر حضرموت اور یمن کے علماء کی رائیں زیادہ ہیں۔

فہرستوں سے کسی دوسرے نسخے کا پتہ نہیں چلتا۔ البتہ بروکلمن نے ذیل (۲ ، ۸ ، ۹۷) میں مجامیل کے سلسلہ میں ایک کتاب الاجوبۃ الحسنۃ عن الاسئلۃ الیمنیۃ کا ذکر کیا ہے ، مصنف کا نام ابو الحسن محمد تاج العارفین البکری الصدیقی ہو البکری اور ان کی تصنیفات کا حال بروکلمن میں مذکور ہے پھر پتہ نہیں ، یہ کتاب مجامیل میں کیوں ذکر کی گئی ؟ لیکن ہمارے یہاں کے نسخہ میں ، الاجوبۃ الحسنۃ اور المرجع - مختصر دونوں ایک دوسرے میں سمو دئے گئے ہیں ، ممکن ہے ، البکری کے جوابات الگ بھی کسی نے جمع کر دئے ہوں ، جیسا کہ بروکلمن سے اندازہ ہوتا ہے۔

یورپ کے چند تعلیمی نظریات

از محمد سمیع صاحب ایم اے، بی ٹی

پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی یعنی "اصلاحی" دور کا شباب تھا۔ ہر شعبہ زندگی میں تغیر اور انقلاب کا زور تھا۔ تعلیم جو اس سے قبل صرف یونانی اور لاطینی لٹریچر سے وابستہ تھی اور صرف ظاہری انشا پردازی اور رنگین بوٹوں تک محدود تھی اب قدم باہر نکالتی ہے اور طبعیات، اخلاقیات اور سماجیات کو بھی داخل نصاب ضروری سمجھا جانے لگا۔ اور خیالات اور ہر شے کے معنوی پہلو کی طرف بھی توجہ کی جانے لگی۔

تعلیم اور حقیقت کی تلاش چنانچہ ایریزمس (ERASMUS) اپنی تصنیف سسٹم آف اسٹڈیز (اصول مطالعات) میں لکھتا ہے۔

علم کی دو قسمیں ہیں ایک حقائق اشیا دوسرے عبارت آرائی۔ الفاظ کے علم کو اولیت حاصل ہے مگر "حقیقت آشنا" ہونا زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

ایک مفکر ریبلیس (RABELAIS ۱۵۴۳ - ۱۴۹۳) جسے مانٹین (MONTAIGNE) روسو (ROUSSEAU) اور لاک (LOCKE) کو اپنے خیالات سے متاثر کیا۔ ایک قدم آگے بڑھ گیا ہے وہ تعلیم میں عمرانی، اخلاقی، مذہبی اور طبعی عناصر کو بھی شامل کرتا ہے۔ اسکی رائے میں تعلیم ایسی ہونی چاہئے جو آزاد خیالی پیدا کرے اور عمل میں کوئی پابندی اور قیود نہ ہوں نہ قدیم معلمین کی محدود نظری ہو اور نہ یونانی اور لاطینی کی اندھی تقلید۔ اور نہ مذہبی پیشواؤں کے تنگ اصول۔ چونکہ خود علم طب سے واقف تھا اسلئے طبعیات پر زور دیتا ہے۔ کتابی علم کے ساتھ زندگی کے عملی پہلو کو ضروری سمجھتا ہے حصول علم اور مطالعہ خوش کن ہونا چاہئے جسکے لئے وہ کھیل کو بھی مفید ہیں جو بچے کی جسمانی نشو و نما میں معین ہوں اور آئندہ زندگی کے فرائض کو ملحوظ رکھیں۔

تعلیمی نظریہ ذیل کے اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے جو خط کی صورت میں بڑھئی بادشاہ نے اپنے بیٹے کو لکھا ہے۔

میں ارادہ رکھتا ہوں اور ایسا کروں گا کہ تو زبانوں کو اچھی طرح سیکھے۔ پہلے یونانی جیسا کہ کونٹیلین (GUINTILIAN) منسوب کیا گیا ہے۔ پھر لاطینی بعدہٗ عبرانی جو مقدس صحیفہ کے خاطر ضروری ہے۔ اسیطرح عربی بھی۔ تو اپنے طرز نگارش میں یونانی میں افلاطون اور لاطینی میں سسرو کی نقل کر۔ کوئی تاریخ ایسی باقی نہ رہے جو تیرے حافظہ میں محفوظ نہ ہو اس میں روشنی پیدا کرنے کے لئے علم الہیئت۔ علم الارض اور جغرافیہ قابل حصول ہیں۔۔

رہا اقلیدس، ارتھمیٹک، موسیقی کا مذاق تو اس کا تجھ میں جبکہ تو چھوٹی ہی عمر کا تھا پیدا کرا چکا ہوں، اس میں بھی ممکن ہو تو تکمیل کرے۔۔۔۔۔ سول لا (قانون معاشرت) کو میں چاہتا ہوں کہ تو متن کی عبارتوں کو ازبر کرے اور پھر فلسفہ سے مقابلہ کر۔ فطرت کا مطالعہ تیرے لئے اہم ہے تاکہ تو کوئی سمندر، دریا، چشمہ ایسا نہ باقی رہے جس سے اور جسکی مچھلیوں سے واقف نہ ہو تمام پرندوں، مختلف قسم کی جھاڑیوں، جڑی بوٹیوں اور پھولوں سے واقف ہو جا۔ تمام قسم کی دھاتیں جو زمین کی پنہائیوں میں پوشیدہ ہیں۔ تمام قیمتی پتھر جو دنیا کے مشرق اور جنوب میں دیکھے جاتے ہیں تجھ سے چھپے نہ رہیں۔ یعرب الطبار کی تصنیفات بھی تیری نظر سے گزریں۔ دن کا کچھ وقت مقدس کتاب کے مطالعہ میں لگا۔ مختصر یہ کہ میں تجھے علم کے عمیق اور بے کنار بحر دیکھنا چاہتا ہوں ساتھ ہی فن جنگ اور استعمال اسلحہ بھی سیکھ تاکہ خاندان اور دوستوں کی مدافعت کر سکے اور اشرار کے حملوں سے محافظت کر سکے"

اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مفکر طالب علم کے لئے کسقدر رنگا رنگ اور وسیع نصاب پیش کرتا ہے۔ چونکہ پندرہویں اور سولہویں صدی کا معلم ہے اس لئے اسے یونانی اور لاطینی زبان اور قدیم علوم سے انس ہے جنہیں تعلیم میں داخل کرنا ضروری سمجھتا ہے ابھی ورناکیولر (مادری زبان) کو اہمیت حاصل نہیں اسے صرف ضروریات زندگی کے پورا کرنے کے لئے استعمال میں لاتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ زندگی کے ماحول اور اسکے اثرات کو بھی احاطہ تعلیم میں شمار کرنے لگے ہیں۔

مانٹین (MON TAIGN) لکھتا ہے۔

اگر تعلیم سے دماغ کی نشو ونما بہتر نہ ہوئی۔ اگر قوت فیصلہ مستحکم نہ ہوئی تو میں یہی چاہوں گا کہ میرا طالبعلم بہتر ہے کہ اپنا وقت ٹینس کھیلکر گذارے۔۔۔۔۔۔ ذرا طالب علم پر نظر تو ڈالو جب وہ پندرہ سولہ برس مدرسہ میں گذار کر آتا ہے۔۔۔۔۔۔ جو کچھ تم اس میں پاؤگے وہ صرف یہ ہوگا کہ یونانی اور لاطینی علم نے اسے ایک پرغرور شخصیت بنادیا ہے اور وطن سے جاتے وقت کی سادگی

باقی نہیں رہی۔"

اسکی نظر میں تعلیم قوت فیصلہ اور طبیعت کی تشکیل کرتی ہے تاکہ اسکے ذریعہ نوجوان ایک کامیاب اور خوش کن زندگی بسر کر سکیں یہ سیر و سیاحت کو بہت اہم سمجھتا ہے۔ لٹریچر کا علم معمولی ہونا چاہئے کیونکہ کتابی علم فائدہ مند نہیں ہیں کیسی چیز کے علم کو تعلیم کا مقصود بالذات نہیں سمجھتا۔ وہ خوبی پیدا کرنا استاد کا اصلی کام سمجھتا ہے وہ لکھتا ہے۔ استاد کو چاہئے۔

"کہ اپنے شاگرد کو محسوس کرا دے کہ بلندی قدر اور صحیح فضیلت اسکے نفع اور عمل کرنے کی مسرت پر مبنی ہے نظم اور نیک چلنی (نہ کی زبردستی) سے فضیلت حاصل کیجا سکتی ہے خوبی یا فضیلت ساری انسانی مسرتوں کی جان ہے۔ اگر معمولی زندگی ناکام رہتی ہے تو یہ ایک نیا عالم پیدا کرتی ہے۔۔۔ دولت، طاقت، عقل ہے۔ اسے زندگی حسن (ترائی) اور صحت سے انس ہے۔ لیکن اس کا خاص کام یہ ہے کہ ان باتوں کو مفید اور دانائی کے ساتھ کسطرح استعمال کیا جائے۔ یہ وہ فرض ہے جسکے بغیر زندگی بے کیف غیر فطری بلکہ بدہیئت ہو جاتی ہے۔"

طریقہ تعلیم کے یہ اصول پیش کرتا ہے۔

"علم پر وثوق ہو۔ خیالات مختلف اسلوب سے راسخ کئے جائیں بچے کو سبق زبانی یاد کرانے کے بجائے عملی طور پر سکھایا جائے اور اسے عمل کے ذریعہ دہرایا جائے تاکہ ہم پتہ چلا ئیں آیا اسکے اختیار کرنے میں فراست رکھتا ہے۔ خوبی اور ادراک اپنے طرز سے ظاہر کرتا ہے۔ حسن اور اصابت لطف اپنے کلام سے دکھلاتا ہے۔ مرض میں استقلال کا پیکر ہے عیش و مسرت میں اعتدال سے کام لیتا ہے انتظام میں نظم قائم کر سکتا ہے اور اپنے ذوق طبعی سے انتہا پسندی سے احتراز کرتا ہے"

متذکرہ بالا دونوں نظریوں کا مقابلہ کیا جائے تو اول نظریہ طالب علم کو علوم کا مجسمہ بنانا چاہتا ہے دوسرا کتابی علم کو ناقص سمجھتا ہے۔

سترہویں صدی میں تعلیمی نظریہ ارتقائی مدارج کے ایک اور زینہ کو طے کرتا ہے جو دور جدید کے لئے تخم اول کا کام دیتا ہے اس زمانہ میں تعلیمی سائیکالوجی (نفسیات) کی بنیاد ڈالی گئی بچہ کے مطالعہ پر زور دیا گیا اور ایسے تعلیمی طریقہ پر جو بچہ کے حسب حال ہو اصرار کیا گیا اس سے دو انقلاب پیدا ہوئے اول طریقہ تعلیم میں براہ راست طرز کا رواج ہوا مثلاً قلم کو بتانا ہو تو بجائے

نقد قلم کے اسکی کل دکھا کر ذہن نشین کرایا جائے دوم مادری زبان کے استعمال کی اہمیت کو بہت بڑھایا گیا۔ علم کو عام کرنے کی تحریک جو تھی جو PANSOPHIC تحریک تھی اس دور میں فرانسس بیکن (FRANCIS BACON) اگرچہ فلسفی تعلیم سے لگاؤ نہیں رکھتا لیکن اسکے فلسفہ نے عام اثر پھیلایا اور NOVUM ORGANUM نے تعلیم کا ایک نیا اسلوب ایجاد کیا۔ کومنس (J. A. COMENIUS) نے بیکن کے اصول پر کئی کتابیں تیار کیں جنھوں نے مدرسہ کی تعلیم میں نمایاں اصلاح کی۔ ذیل میں چند اصول درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) جو کچھ علم بچہ کو سکھلایا جائے اس چیز کو پیش کیا جائے علامت پر اکتفا نہ کیا جائے۔

(۲) جو کچھ سکھلایا جائے وہ روزانہ زندگی میں عملی طور پر کام آوے اور مفید ہو۔

(۳) جو کچھ سکھلایا جائے سیدھے سادے طریقہ پر نہ کہ پیچیدار طریقہ سے۔

(۴) اگر کوئی چیز سکھلائی جائے تو پہلے عام اصول واضح کئے جائیں پھر تفصیل

(۵) کسی شے یا مسئلہ کے حصے ترتیب سے ہوں اور تسلسل فطری قائم رہے۔

(۶) تمام باتیں جو سکھلائی جائیں یکے بعد دیگرے ہوں بیک وقت ایک مسئلہ سے زیادہ نہ سکھایا جائے۔

(ابن خلدون کے نظریہ میں دکھلایا جا چکا ہے کہ وہ کسطرح چار سو سال پہلے اسکی اہمیت پر زور دے چکے ہیں)

(۷) جب تک ایک مسئلہ تکمیل تک نہ پہونچ جائے اسے ترک نہ کیا جائے۔

(۸) جو فرق مختلف چیزوں میں ہو واضح کر دیا جائے تاکہ علم واضح اور اچھی طرح سمجھ میں آجائے۔ سترھویں صدی کے اخیر تک لاطینی زبان جو مذہب اور پادریت کے لئے ضروری تھی ختم ہو گئی۔ یونیورسٹیوں میں مدرسوں اور علمی اداروں میں مادری زبان کو جگہ ملی۔ ورناکیولر اب ادبی زبان بننے لگی اس تبدیلی کے ساتھ نظریہ میں بھی تغیر واقع ہوا تعلیم کا منشا صرف حصول علم کے طریقوں پر زور دینا قرار دیا جانے لگا۔ اور علم یا مسائل علمی پس پشت ڈالدیئے گئے۔

اس تھیوری کے ماننے والوں کا خیال تھا کہ دماغ مختلف حصص میں اپنی فعلی اعتبار سے تقسیم ہے (FACULTIES OF MIND) اور ہر ایک کا فعل جداگانہ ہے جسکے نشو ونما کے لئے صرف ایک مضمون ضروری ہے مثلاً قوت حافظہ

قوت استدلال، قوت تخیل وغیرہ کی ترقی کے لیے مخصوص مضامین تجویز کئے گئے۔ لاک ۱۶۳۲ سے ۱۷۰۴ء LOCKE خلقی یا
پیدائشی علم یا خیالات یا فکر یا ادراک کا قائل نہ تھا بلکہ ہر علم کو تجربہ پر مبنی اور تجربہ سے دماغی قوی کی ترقی اور نشوونما سمجھتا تھا۔
تعلیم کو صرف ذریعہ بنایا گیا تاکہ مختلف دماغی قوی کی تربیت ہوسکے۔

تادیبی نظریہ اس تادیبی نظریہ نے معاشرتی ماحول کو نظر انداز کر دیا نیز انفرادی استعداد جو طلباء میں پائی جاتی ہے
اسے کوئی اہمیت نہ دی گئی۔ زندگی کی مختلف ضروریات جو تعلیم کے ذریعہ حاصل ہوتی ہیں بے توجہی کا شکار رہیں صرف تادیبی نظریہ
جس کے اصول سے طالب علم کی محض ایک قسم کی ٹریننگ مقصود تھی ضروری سمجھا گیا اس سے مخصوص ذہنی قوت کو تقویت پہونچی
لیکن جبکہ مختلف پیشوں طبقوں اور مختلف سوسائٹی کے طلباء مختلف ذہنی قوی اور استعداد کے ساتھ درجوں میں داخل ہونے
لگے تو اس اصول کی بے بسی ظاہر ہوگئی۔

لاک کی تصنیف THOUGHTS CONCERNING EDUCATION کو تعلیمی خیالات کی نظر سے
خاص اہمیت حاصل ہے اس کے خیال کے مطابق تعلیم کے تین پہلو ہیں۔

(۱) طبعی جس کا مقصد جسمانی قوت ہے۔

(۲) اخلاقی جس کا مقصد نیکی اور کیرکٹر کی تشکیل ہے۔

(۳) ذہنی جس کا مقصد علم ہے۔

وہ پہلے کو بنیاد قرار دیتا ہے اور دوسرے اس کے بعد اہمیت رکھتے ہیں

D[illegible]EY ASC[illegible] NOM[illegible] ساری تربیت کا لب لباب ہے۔ مختصر لباس، سخت بستر، کھلی ہوا، سادی اور موٹی غذا
طالب علم کے لئے ضروری ہے۔ اخلاقی خوبی کے لئے نفس کشی بنیادی اصول ہے نیکی اچھی عادات کے ڈالنے پر مبنی ہے جو خواہشات
پر قابو حاصل کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ ذہنی تعلیم کا مقصد دماغ کی ایسی ٹریننگ ہے جس سے عادات ذہنی پیدا ہو جائیں
اور وہ تجربہ کے ذریعہ راسخ کی جائیں اس نظریہ کے استحکام میں تعلیمی مذہبی نفسیاتی اور پیشہ کے خیالات معین ہوئے اور تادیبی
نظریہ تعلیم کا عام رواج ہوا جیسے انگلینڈ، جرمنی، اور امریکہ کے سکنڈری مدارس میں خاص اہمیت دی گئی جیسا کہ اوپر ذکر آیا ہے

اس نظریے کے مطابق۔

(۱) تعلیمی قدر مسائل مضامین پر نہیں بلکہ انکے طریقہ حصول پر مبنی ہے۔

(۲) صحیح طریقہ تعلیم ایک خاص دماغی قوت کی نشو ونما کرتا ہے جو تمام مضامین کے لئے کافی ہے۔

(۳) دماغ مختلف قوی پر مشتمل ہے جنہیں حافظہ اور عقل و قوت استدلال بخصوصیت سے تادیبی طریقہ کے ذریعہ ترقی دئے جائیں۔

دور جدید کے نفسیاتی اور سائنٹفک تعلیمی تخیل نے اس پر ضرب کاری لگائی۔ فطری اور تادیبی نظریہ میں اختلاف بڑھا اور بیسویں صدی میں اسے کافی اہمیت ہوگئی۔

انیسویں صدی میں تادیبی نظریہ کا پیرو مسٹر فولے (FOUILLEE) عام اعتراض کا جواب دیتا ہے جنہیں (SPENCER) اسپنسر اور HUXLEY ہکسلے نے ثابت کہ فطری اور طبعی علوم تعلیم کی بنیاد نہیں اپنی جگہ۔ ایک قسم کی سائنس ترقی کے ساتھ جوان نہیں عام تھی۔ ان علوم کو نوجوانوں کی تعلیم کے لئے ضروری سمجھتا ہے عذر یہ ہے کہ ہماری زندگی میں جیومیٹری کا علم پل اور ریلوے کی تعمیر میں ضروری ہے اور ہر فن میں نیز شاعری کے لئے بھی علم کا ذخیرہ چاہئے۔ شاعر کے لئے کسی علم شامل ہے؟ کیا ورجل (VIRGIL) اور ریسین (RACINE) شاعری کے قوانین یاد کرکے شاعر بنے؟ سائنس یا تشیل شاعر نے سائنس سیکھ کر نہیں بنا۔ حقیقی سائنس ایک ایجاد و اختراع ہے ہم پل یا ریلوے کسی اصول کو سیکھ کر بنا سکتے ہیں لیکن جنھوں نے اسے ایجاد کیا انکی اپنی ذہنی قوت تھی جسے وہ حاصل کر چکے تھے نہ کہ محض علم نہیں ذہنی قوت کا بڑھانا ہمارا مقصد ہونا چاہئے۔

سوال پیدا ہوتا ہے آیا نوجوانوں کی ذہنی ترقی کے لئے بہترین ذریعہ انکے حافظہ کو جدید سائنس کے نتائج سے پر کرنا ہے یا تمیز استدلال کی قوت پیدا کرنا تخیل بڑھانا مختلف فیہ باتوں کو متحد کرنا۔ واقعات کے رو سے پہلے ہی نتائج پر پہونچنا اور قوت ادراک زور سے پرکھنا کہ صحیح بات کیا ہونی چاہئے علاوہ ازیں آیا نوجوان کی تعلیم انجینیر بنائے جانے کے لئے ہونی چاہئے یا شاعر حقیقت میں تعلیم کسی پیشہ کی امیدواری کے لئے نہیں بلکہ یہ انسانی فرد کے اخلاقی اور عقلی قوت کی آبیاری ہے“

حالات ندوہ

الندوہ کی کسی گزشتہ اشاعت میں مجلس الدعوۃ والارشاد کا ذکر ہو چکا ہے۔ ذہنی اصلاح، دینی تربیت اور فکر اسلامی کی نشر واشاعت اس انجمن کا خاص مقصد ہے پچھلے سال یہ انجمن قائم ہوئی تھی، دوران سال میں کئی مفید جلسے ہوئے درمیان میں رمضان کی تعطیل کی وجہ سے کچھ دن یہ سلسلہ منقطع رہا اب پھر کام شروع ہوا ہے۔ امسال انجمن کے کارکنوں کی تجویز ہے کہ ماضی کی تاریخی شخصیتوں کے ساتھ عصر حاضر کے بزرگوں کے حالات و واردات سے بھی واقفیت بہم پہونچائی جائے واقعات کا بیان محض تاریخی داستان سرائی تک محدود نہ ہو بلکہ ان بزرگوں کی سیرت کے پرتاثیر پہلوؤں کو نمایاں کیا جائے اور انسانی زندگی پر انکی اثر آفرینیوں کو ظاہر کیا جائے تاکہ دلوں کی دنیا میں انقلاب ہو، نوجوان تاثیر کے رنگ میں ڈوب جائیں اور زندگی کی پیچیدہ راہیں حق وصداقت کے نور سے منور ہو جائیں۔

اس خیال کے ماتحت "مؤثر شخصیتیں" آئندہ تقریر کا موضوع قرار پائی ہیں اس سلسلہ میں مختلف حضرات کو دعوت دی جا رہی ہے کہ وہ ایسے بزرگوں کے تذکرے سنائیں جنھوں نے انکی زندگی کو خاص طور سے متاثر کیا ہو جن کے پرتوفیض سے انکے قلب و دماغ میں انقلاب پیدا ہو گیا ہو، ہو جن کی اثر آفرین شخصیتوں نے فکر و عمل کی راہیں بدل دی ہوں۔ اس عنوان کے ماتحت پچھلے ہفتہ مولوی ابوالحسن علی نے متعدد بزرگوں کے پرتاثیر واقعات سنائے امید ہے کہ ہمارے دوست کی یہ دلچسپ اور پر اثر تقریر اس موضوع پر آئندہ بہت سی تقریروں کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔

بزم رحمانی کے علمی اجتماعات بھی اب شروع ہو رہے ہیں آج کل قرآن مجید، ادب اور تاریخ سے متعلق کئی مضامین مرتب ہو رہے ہیں اس سال کا پہلا جلسہ وسط دسمبر تک ہوگا امید ہے کہ پچھلے سال کے مقابلہ میں ابکی مجلس طلبہ کی توجہات کا اور زیادہ مرکز بنے گی۔

دسمبر کے آخری ہفتہ میں طلباء قدیم کا سالانہ جلسہ ہو رہا ہے مجلس کارکن اور مجلس منتظمہ کے ابتدائی مشورتی جلسے ہو چکے ہیں اجلاس کے عام انتظامات اور مہمانوں کی پذیرائی کی غرض سے مجلس استقبالیہ کی تشکیل عمل میں آ گئی ہے۔ اس سال کا یہ اجتماع بہت اہم ہے اس موقع پر انجمن کے موجودہ دستور پر نظر ثانی، ضروری ارکان کا انتخاب، صوبجاتی شاخوں کے مسائل متعدد اہم معاملات پر غور کیا جائے گا۔ مرکزی انجمن کے اجلاس کے ساتھ صوبجات متحدہ کی مقامی شاخ کا جلسہ بھی ہوگا جس میں اس کے ارکان اور عہدہ داروں کا انتخاب بھی ہوگا امید ہے کہ ندوی دوست اور ندوہ کے پرانے طلبہ اپنی شرکت سے جلسہ کو رونق بخشیں گے اور اپنی انجمن کے عروج و ترقی کی تدبیروں میں اسکے کارکنوں کو مدد دیں گے صدر مجلس استقبالیہ شاہ عزالدین صاحب ندوی کی طرف سے دعوت نامے روانہ ہو رہے ہیں

گذشتہ حسابات کی تصدیق اور آئندہ بجٹ کی منظوری کی غرض سے ۱۶-۱۷ نومبر کو معین الندوہ کی مجلس منتظمہ کے دو جلسے منعقد ہوئے خوش قسمتی سے اس موقع پر انجمن کے سرپرست اور اسکے صدر اعلیٰ جناب مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ بھی تشریف رکھتے تھے مولوی حامد علی ندوی ناظم معین الندوہ نے حسابات کے ساتھ گذشتہ سال کے کاموں کی مفصل رپورٹ سنائی اور آئندہ پیش نظر کاموں کا تذکرہ کیا ندوہ کے ہمدردوں اور معاونوں کو یہ سنکر مسرت ہوگی کہ اب معین الندوہ نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ غریب اور مستحق طلبہ کی امداد و اعانت کا سلسلہ شروع کر دیا ہے فی الحال چار وظیفے منظور ہوئے ہیں اگر ہمدردوں اور دوستوں کی عنایت و توجہ کا سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو انشاء اللہ آئندہ اس تعداد میں اور اضافہ ہوتا رہے گا۔

اس موقع پر محبین ندوہ کی واقفیت کے لئے یہ اطلاع بھی ضروری ہے کہ انکی انجمن نے عام اعانتی حلقوں کے قیام کے علاوہ مسلمانوں کی دینی اور معاشرتی اصلاح کی راہ میں بھی قدم اٹھایا ہے فی الحال لکھنؤ اور اسکے اطراف و جوانب میں کام شروع کیا گیا ہے جوں جوں حالات استوار ہوتے جائیں گے کام کی رفتار میں تیزی اور اسکے دائرہ میں وسعت ہوتی جائے گی مولوی حفیظ الدین ندوی اور قاری وددالحق ندوی اس سلسلہ میں کافی دلچسپی لے رہے ہیں ہمیں امید ہے کہ شہر اور اسکے گرد و نواح کے دوسرے احباب بھی اس مفید کام میں معین الندوہ کے کارکنوں کی مدد کریں گے۔

پبلشر سید حامد علی، پرنٹر بانکے لال سکسینہ، مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ

رحمت عالم

جندی طالبعلموں، کم پڑھے لکھے لوگوں، بچوں اور عورتوں کے لئے
سیرۃ نبوی صلعم کی ایک ایسی مختصر سادہ اور آسان کتاب کی ضرورت تھی جسکے بیان میں
کوئی الجھاؤ اور عبارت میں کوئی دقت نہ ہو، پھر بھی بیان مستند اور واقعات صحیح
ہوں، اسی ضرورت کو سامنے رکھکر سیرت نگار نبویؐ سید سلیمان ندوی نے یہ
مختصر سیرت لکھکر شائع کی اور اس کا سارا منافع دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں
چھوٹے بچوں کے دار الاقامہ بنانے کے لئے وقف کر دیا ہے۔ یہ کتاب پانچ ہزار
کی تعداد میں چھپی ہے، ضرورت ہے کہ ہر مسلمان بچہ کے ہاتھ میں اس کا ایک
نسخہ ہو، اہل خیر کو اسکی خریداری سے انشاء اللہ تعالیٰ دوہرا ثواب حاصل ہوگا۔

قیمت فی نسخہ علاوہ محصول ڈاک۔ ایک روپیہ چار آنہ
لیکن ۲۰ نسخوں کے خریدار سے ایک روپیہ فی نسخہ کے حساب سے لیا جائے گا
مجلد کی قیمت ۲ر فی نسخہ زائد ہوگی۔ علاوہ محصول

دار المصنفین اعظم گڈھ
جمعیۃ التعاون (کوآپریٹو سوسائٹی)
دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ